غلام عباس کے افسانوی کرداروں کی طبقاتی نفسیات

مقالہ برائے ایم ایس اردو

مقالہ نگار

محمد یوسف(107-FLL/MSURDU/F13)

نگران مقالہ

ڈاکٹر ندیم اسلم (روش ندیم)

اسسٹنٹ پروفیسر

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد

شعبہء اردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

غلام عباس کے افسانوی کرداروں کی طبقاتی نفسیات

مقالہ برائے ایم ایس اردو

مقالہ نگار

محمد یوسف(107-FLL/MSURDU/F13)

نگران مقالہ

ڈاکٹر ندیم اسلم (روش ندیم)

اسسٹنٹ پروفیسر

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد

شعبہء اردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

بسم الله الرحمن الرحيم

Accession No TH-17755

MS
891.4393
م ح غ

اردو ادب — افسانوی کردار
" — افسانہ

ACCEPTANCE BY THE VIVA VOCE COMMITTEE

Name of the Student: ***Muhammad Yousaf***

Title of the Thesis: غلام عباس کے افسانوں کا لسانی مطالعہ

Registration No: ***107-FLL/MS Urdu/F13***

Accepted by the Department of Urdu, Faculty of Languages & Literature, International Islamic University, Islamabad, in partial fulfillment of the requirements for the Master of Philosophy degree in Urdu.

VIVA VOCE COMMITTEE

External Examiner: **Dr. Shafique Anjum** Asst. Professor Department of Urdu NUML, Islamabad	***Internal Examiner:*** **Dr. Aziz Ibnul Hassan** Associate Professor Department of Urdu, IIUI

Supervisor:
Dr. Muhammad Nadeem Aslam

****

Chairman
Department of Urdu

Dean
Faculty of Language & Literature

فہرست موضوعات

موضوعات	صفحہ
حرف آغاز	i تا iii
باب نمبر ۱	۱ تا ۵۰
باب نمبر ۲	۵۱ تا ۹۰
باب نمبر ۳	۹۱ تا ۱۲۲
باب نمبر ۴	۱۲۳ تا ۱۵۵
مجموعی جائزہ	۱۵۶ تا ۱۶۳
کتابیات و ماخذات	۱۶۴ تا ۱۶۶

حرف آغاز

غلام عباس کی افسانہ نگاری میں معاصر عہد کے مقبول مروجہ موضوعات کو فنی مہارت کے ساتھ بیان کرنے کے علاوہ ایک طبقاتی ونفسیاتی شعور موجود ہے۔ان کے ہاں سماج کے نچلے،متوسط، نچلے متوسط اور اعلیٰ طبقے کی خاص طبقاتی نفسیات بیان کی گئی ہے جو ان کے طبقاتی اور نفسیاتی شعور کو ایک انفرادی پہچان مہیا کرتی ہے۔ان کی یہی طبقاتی ونفسیاتی انفرادیت میری دلچسپی کا باعث بنی۔میں نے اپنی اس تحقیقی کوشش میں ان کے کرداروں کے طبقات اور ان پر اثر انداز ہونے والی معروضی متنوع جبریت کے نفسیاتی اثرات کو تلاش کیا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ ہر طبقے کے مخصوص رجحانات،افکار وخیالات اور رویوں کو متاثر کرنے والے عوامل کے نفسیاتی محرکات کو سامنے لایا ہے۔

مقالہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔باب نمبر ا میں کردار اور کردار نگاری کی افسانوی اہمیت،کردار اور سماج کا باہمی تعلق اور طبقات کے تاریخی پس منظر کا موضوع زیر بحث ہے۔طبقاتی جبریت کے عوامل میں روسو،مارکس،ماؤ،سبط حسن،مبارک علی،علی عباس جلالپوری،حسرت موہانی اور عبیداللہ سندھی کے افکار کا تقابلی مطالعہ،فرد،سماج اور نفسیات کے ایک دوسرے پر اثرات کے ساتھ نفسیاتی الجھنوں اور مسائل کی سماجی بنیادوں کی وضاحت کے لیے فرائیڈ، یونگ،ایڈلر، کیون ہارنی اور ایرخ فروم کے نظریات شامل مطالعہ ہیں۔اس کے علاوہ اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر کرداروں کی طبقاتی ونفسیاتی الجھنوں کا مطالعہ موضوع بحث ہے۔

باب نمبر۲ میں غلام عباس کے طبقاتی ونفسیاتی شعور پر مشتمل ہے۔اس میں ان کے عہد کے مقبول ادبی نظریات، طبقاتی ونفسیاتی تناظر اور ان کے افسانوں میں بیان ہونے والے سماجی طبقات زیر بحث ہیں۔طبقات کے داخلی مسائل، طبقاتی جبریت کی مختلف صورتیں،انسانی وجود پر اثرات کے علم کا فن اور انسانی نفسیات کی رمزیت کو غلام عباس کے فن میں تلاش کیا گیا ہے۔کرداروں کا خاص لب ولہجہ،انسانی زندگی کا گہرا شعور،داخلی اور خارجی نفسیات کا توازن،خارج سے داخل کا سفر،نفسیاتی المیوں کو گرفت میں لینے کا مخصوص ہنر اور کرداروں کی سمجھوتہ بازی میں مضمر نفسیاتی محرکات کو غلام عباس کے طبقاتی ونفسیاتی شعور کے تناظر میں متنوع زاویوں سے سامنے لایا گیا ہے۔

باب نمبر۳ میں غلام عباس کی افسانہ نگاری میں متوسط طبقے کی طبقاتی نفسیات بیان کی گئی ہے۔اس تناظر میں ہندوستان میں متوسط طبقے کے ظہور اور اس پر نوآبادیاتی اثرات کی وجوہات موضوع مطالعہ ہیں۔اس طبقے میں مغربی

زندگی کی مقبولیت اور ہندوستان میں اس کے نفسیاتی مسائل کی تہوں میں کارفرما محرکات پر بحث موجود ہے۔غلام عباس کے افسانوں میں متوسط طبقے کی مخصوص طبقاتی نفسیات میں مسائل پر قابو پانے کی جستجو، آرزو اور حقیقت میں ہم آہنگی کی تگ و دو، خاندانی اور اختیاری رشتوں کی کش مکش، احساس کم تری کی بدولت بدلتا انداز فکر، خود اعتمادی کا فقدان، سماجی انفرادیت کی نفسیاتی الجھن، اپنے سے بہتر طبقات میں شمولیت کا غالب رجحان اور سمجھوتوں کی نفسیاتی وجوہات بیان ہوئی ہیں۔اس باب میں غلام عباس کے افسانوی فن میں بیان ہونے والی متوسط و نچلے متوسط طبقے کی طبقاتی نفسیات اور اس کے طبقاتی ونفسیاتی محرکات شامل مطالعہ رہے۔

باب نمبر۴ میں غلام عباس کی افسانہ نگاری میں بیان ہونے والی اعلیٰ اور نچلے طبقات کی طبقاتی نفسیات کو مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی گئی۔۔بالا دست طبقات کی استحصالی فطرت، روایات کی گہری جکڑ بندی، دولت کی بدولت پروان چڑھنے والی یکسانیت کو طبقاتی ونفسیاتی تناظر میں سماج کے نچلے طبقے میں پیدا ہونے والی احساس کم تری، فرار، گریز، اکتاہٹ، بے چینی، ذہنی کش مکش اور بے معنی زندگی کی کرنوں کو سماج کی طبقاتی بنت سے منعکس ہو کر اندرونی شکست و ریخت پر مرتب ہونے والے نفسیاتی اثرات دکھائے گئے ہیں۔جنس کی قوت اور اس کے طبقات ونفسیاتی اثرات کے ساتھ ساتھ عورت اور طوائف کا تقابل، غلام عباس کی نسوانی نفسیات پر گرفت، طوائف کی نفسیاتی الجھن، وجود کو برقرار رکھنے اور اس دلدل کی طرف مجبور کرنے والے عوامل کی طبقاتی ونفسیاتی بحث موضوع باب ہے۔

"غلام عباس کے افسانوی کرداروں کی طبقاتی نفسیات" کے موضوع پر یہ اپنی نوعیت کی اولین کاوش ہے۔جو کہساروں، آبشاروں اور پھولوں کے قدرتی حسن پر بھارتی حدود سے توپوں کی گرج میں سلگتے کشمیر کے ایک گاؤں بلوچ کے ایک عارضی پرائمری مدرس کی حقیر کوشش ہے جہاں معیاری کتب کی فراہمی، ادبی ذوق سے مزین افراد کی تلاش، جدید ذرائع تک رسائی اور اردو ادب سے آشنا احباب کی تلاش جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔راقم اس ضمن میں اپنے مہربان استاد، مخلص نگران اور مشفق ہستی جناب ڈاکٹر روش ندیم کا ممنون احسان ہے۔انھوں نے توقع سے بڑھ کر میری مدد فرمائی، میرے حوصلوں میں توازن رکھا اور مجھے مستفید فرمایا۔اپنی علم دوستی، ذاتی کتب خانے تک رسائی اور وقت بے وقت میری حاضری کو شرف قبولیت بخشا۔ان کی عنایت کے بغیر یہ مقالہ کبھی تکمیل کو نہ پہنچتا۔اس کے ساتھ میں بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی شعبہ اردو کے صدر جناب ڈاکٹر طیب منیر صاحب کی خصوصی شفقت، کمال مہربانی اور رہنمائی کا بھی شکر گزار ہوں۔استاد محترم جناب ڈاکٹر عزیز ابن الحسن، ڈاکٹر ارشد معراج اور ڈاکٹر کامران کاظمی کا تعاون اور رہنمائی بھی شامل حال رہی۔

اپنی ماں کی خصوصی دعائیں بھی زندگی کے تمام سنگلاخ راستوں پر عقیدتوں کے گل نچھاور کرتی رہیں۔ مجھے علم کے راستوں پر چلنے اور گرہستی کے معاملات سے آزاد کرنے والی میری شریک حیات ساجدہ اختر کا مجھ پر سب سے بڑا احسان ہے جس نے مجھ کو غم روزگار کی الجھنوں سے خلاصی بخشی۔ میرے لیے ایک سکون کا سامان میری دونوں بیٹیوں زرتاش اور زرنین نے بھی مہیا کیا جو اپنی معصوم نگاہوں سے بس مجھے دکھا کرتیں تھیں۔ کتب کی فراہمی میں احمد کمال ثاقب ،افتخار احمد خار، عاطف نذیر، امتیاز احمد، شبیر بسمل، راول پنڈی میں طعام وقیام کی معاونت پر محمد حبیب، شاہد پرویز، عثمان قمر مرزا اور ایم فل کے ساتھی سید توقیر شاہ کا بھی ممنون احسان ہوں۔ ایک اور فرد محمد اخلاق حسین نے کمپوزنگ سمیت میری ہر ممکن مدد کی مگر اس کا مجھ سے تعلق شکریے کی رسم سے بالاتر ہے۔

محمد یوسف
محقق ایم فل اردو
بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

باب نمبر۱

کردار، طبقات اور نفسیات۔تصور و رجحانات

کردار

کردار ادب میں ایک اساسی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔کردار کا زیادہ استعمال افسانوی ادب کا خاصا رہا ہے لیکن اس کا پھیلاؤ نظم و نثر کی جملہ اصناف پر محیط ہے۔کردار کی مدد سے ایک تخلیق کار اپنے مخصوص رجحانات، احساسات، رویے اور سماجی و طبقاتی شعور منظرِ عام پر لاتا ہے۔کردار سماج کا ایک ایسا آئینہ ہوتا ہے جس میں فن کار اس سماج کی ظاہری و پوشیدہ حقیقت کو پوری آب و تاب سے عیاں کر رہا ہوتا ہے۔تخلیق کار کرداروں کی مدد سے اپنی شخصی آرزوؤں، جذبات، ارمانوں اور ولولوں کا اظہار کرتا ہے، نگران باطنی، ذوقی اور فکری دلچسپیوں کے علاوہ معروضی احوال کا عکس بھی کردار سے اظہار کی راہ پاتا ہے۔

ایک تخلیق کار کردار کا انتخاب ایک خاص طبقے سے کرتا ہے اور اس طبقے کی ظاہری زندگی و درپیش مسائل کے سامنے کردار کو متعارف کروا کر اُسے معروضی صورت حال میں جینے کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔دراصل فن کار کے پیش نظر کردار کی خارجی صورت اور احوال کا مطالعہ داخلی اور نفسیاتی و جذباتی زندگی کے پوشیدہ راز تلاش کرنا ہوتا ہے۔اس طرح کردار کا خارجی مطالعہ داخلی رازوں سے پردہ اُٹھاتا ہے۔

کردار ادب میں ہر عہد کے اندر اپنی اہمیت ثابت کرتا رہا تاہم مغرب میں سترھویں صدی کے دوران جب حیات و کائنات کے مسائل اور انسان کے داخلی مطالعے نے اہمیت حاصل کی تو ادب میں کردار کا مقام و اہمیت پہلے سے بڑھ گئی۔کردار کی اہمیت کے پیشِ نظر ادب میں کردار کی افادیت کو اجاگر کرنے کے لئے کردار کے لغوی، اصطلاحی اور عمومی مفاہیم پر نظر ڈالی جاسکتی ہے۔

"کشاف تنقیدی اصطلاحات" میں کردار کی تعریف کے ضمن میں لکھا ہے۔" کہانی کے واقعات جن افراد قصہ کو پیش آتے ہیں انھیں اصطلاح میں کردار کہا جاتا ہے"(۱) لغوی اعتبار سے کردار کا مفہوم چال چلن اور سیرت لیا جاتا ہے۔ان مفاہیم کے علاوہ کردار کا معاشرتی زندگی میں مفہوم خاصا وسیع ہے۔اس سے ایک مراد یہ لی جاتی ہے کہ کردار وہ خصوصیات ہوتی ہیں جو نہ صرف ایک فرد کو دوسرے سے ممتاز کرتی ہیں بل کہ سماج میں انسان کا مقام و مرتبہ بھی متعین کرتی ہیں۔کردار کے ساتھ معاشرتی رسومات، روایات، اصول اور اخلاقی قدریں بھی وابستہ ہیں کیونکہ انھی صفات کو بلند کردار کے تعین میں

بطور پیمانہ استعمال کیا جاتا ہے۔

ادب میں کردار کا سفر نظم سے نثر کی طرف ہوا ہے لیکن دونوں اصناف ادب میں کردار کا استعمال اور رواج بتدریج بلندی کی طرف گامزن رہا۔

اردو ادب میں کردار کا پھیلاؤ پوری انسانی زندگی کو گھیرے ہوئے ہے کیوں کہ کردار کی خصوصیات اور خامیاں اُسے منفرد بناتی ہیں اس لیے تخلیق کار کردار کا تعلق ایک دور، ایک عہد، ایک سماج اور زمان و مکان سے قائم کرتا ہے۔ کردار کی مدد سے فن کار کسی خاص طبقے، عہد اور مخصوص معاشرے کی ترجمانی کا کام لیتا ہے۔ کردار کی مدد سے مصنف زندگی کے مختلف پہلوؤں کو قاری کے سامنے لاتا ہے تا کہ اپنے عہد کی درست عکاسی کا حق ادا کر سکے اسی لئے وہی کردار زیادہ مقبول ہوتے ہیں جو حقیقی زندگی سے زیادہ قربت رکھتے ہیں۔

تخلیق کار کردار کو تخلیقی عمل کے دوران کئی مراحل سے گزارتا ہے اور اس کی تراش خراش اس ڈھنگ سے کرتا ہے کہ حقیقی زندگی کی جھلک کے باوجود ایک انفرادی تشخص عمل میں آتا ہے جو کردار کو انفرادیت بخشتا ہے۔ ادب میں کردار کی تعمیر و تشکیل اس ڈھنگ سے کی جاتی ہے جس سے کردار پہلودار ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کردار کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

> کردار کا مفہوم ذاتی، انوکھے رجحانات یا ذاتی ارتباط کا اظہار نہیں بلکہ کردار نگاری کی پہچان ہی اس کی داخلی زندگی کو قرار دیا گیا ہے جو فی الاصل اس کی نفسیاتی و جذباتی زندگی کا بھی اشاریہ ہے (۲)

افسانوی ادب میں کردار کی مختلف اقسام استعمال کی جاتی ہیں۔ ان اقسام میں بنیادی کردار زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے کیوں کہ کہانی کو اسی کردار کے گرد گھمایا جاتا ہے۔ مرکزی کردار کے ساتھ ساتھ ثانوی کردار بھی چلتے ہیں جن کی اہمیت کا تعلق اُن کے عمل سے ہوتا ہے۔ ان دونوں اقسام کے علاوہ کردار کی ایک قسم ایسی بھی ہوتی ہے جو ایک خاص گروہ کی نمائندہ ہوتی ہے۔ ان کرداروں کی پہچان ان کی طبقاتی خصوصیات کے مرہون منت ہوتی ہے۔

تخلیق کار کرداروں کی مدد سے ذہن کی گہرائیوں کو سامنے لانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا مقصد ظاہری احوال کی مدد سے انسانی جذبات و احساسات اور ذہنی الجھنوں تک رسائی ہوتا ہے جس سے کردار ایک نفسیاتی مطالعے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ تخلیق کار کردار پر خارجی جبریت کے عوامل سے پیدا شدہ نفسیاتی مسائل اور ان کے اثرات کو دکھانے کی

کوشش کرتا ہے۔ خارجی اور داخلی جبریت کے عوامل کا امتزاج کردار کے افعال اور دلچسپیوں کو متاثر کر کے نفسیاتی الجھنوں سے بھرپور ایک نئی پرت مرتب کرتا ہے جو مستقبل کا کرداری ڈھانچہ مرتب کرتی ہے۔

کردار نگاری

ایسے طریقے یا ذرائع جن کی مدد سے ادیب کردار کو پیش کرتا ہے اُسے کردار نگاری کہا جاتا ہے۔ کردار کو قاری کے سامنے پیش کرنے کے مختلف انداز ہوتے ہیں جن سے مصنف مختلف صورت حال میں اپنی ضرورت کے مطابق استفادہ کرتا ہے۔ ان مختلف صورتوں میں بیان، مکالمہ، عمل اور اضطراب زیادہ مقبول و معروف ہیں مگر افسانوی ادب میں بیانیہ کو زیادہ استعمال کیا جاتا ہے تاکہ ابلاغ میں آسانی پیدا ہو سکے۔

کردار کی انفرادیت اور باطنی زندگی کے اظہار کے لئے کردار کا مصنف کی ذاتی پسند و ناپسند سے الگ اور ایک منفرد حیثیت کا حامل ہونا بھی ضروری ہے۔ کردار کی خارجی زندگی کا بیان اور اس کی ظاہری حالت کی تفصیل کو اس کی دماغی یا داخلی کشمکش سے جوڑا جاتا ہے۔ اس طرح کردار کی جذباتی اور نفسیاتی حالتوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے جس کی مدد سے کردار نگاری میں نفسیاتی مسائل کو کھوجنے کی کوشش مصروف عمل رہتی ہے۔ بہتر کردار نگاری کے لئے کردار کا انسانی سطح پر زندگی گزارنا ضروری ہوتا ہے۔ ایک فطری کردار کے احساسات، جذبات رویے اور پسند و ناپسند عام انسانی زندگی کے قریب ہونی چاہیے۔ کردار کی دیگر عمومی توقعات کے باوجود کردار کی نفسیات کا مطالعہ بھی کردار نگاری کی خوبی سمجھی جاتی ہے۔ کردار نگاری اور نفسیات کے تعلق کو ڈاکٹر سلیم اختر نے یوں بیان کیا ہے:۔

> نفسیاتی کردار فطری بھی ہوگا کیونکہ اس کی بوالعجبیاں یا غیر معمولی پن استثنائی ہونے کے باوجود بھی انسانی فطرت کے دائرے سے باہر نہیں لیکن ہر فطری کردار کا نفسیاتی ہونا ضروری نہیں۔ اس لئے کامیاب کردار کا معیار اس کا محض فطری ہونا نہیں بلکہ نفسیاتی ہونا قرار پاتا ہے۔(۳)

کردار نگاری میں کرداروں کی تعمیر و تشکیل کے دوران ان کی زبان، لہجے اور طبقے کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ کردار کا تعلق جس طبقے سے ہوگا اس کا لباس، چال ڈھال، گفتگو اور الفاظ کا چناؤ بھی اس طبقے کی سماجی زندگی کے قریب ہونا چاہیے تاکہ قاری آسانی سے کہانی کے ساتھ سفر کر سکے۔ کردار کا سماجی پس منظر، نظریات، سوچ اور جذبات و احساسات کو جب مکالموں کی صورت میں بیان کیا جاتا ہے تو زبان و لہجہ طبقے کی ظاہری زندگی کے عین مطابق ہوتا ہے۔

کردار نگاری کے ضمن میں اپنی ضرورت کے مطابق مصنف کئی طریقے استعمال کرسکتا ہے۔ان میں کردار کے نقش ونگار، ان کے لباس کے انداز اوران کی حرکات وسکنات کومتعین کیا جاسکتا ہے۔کردار کے بارے میں بیانیہ معلومات کے ساتھ ساتھ خارجی اعمال اور داخلی کیفیات کے پوشیدہ خانوں میں جھانکا جاتا ہے۔کردار نگاری کے لئے کئی طریقوں کا منفرد امتزاج بھی فن میں کمال مہارت کا ثبوت ہوتا ہے۔

اردو کے افسانوی ادب میں کردار نگاری کے مختلف رجحانات اپنے اپنے عہد میں اس زمانے کے مناسب حال مقبولیت پاتے رہے۔جدید عہد کے آغاز میں جب اُردو ناول نگاروں نے اصلاح کا بیڑا اُٹھایا تو مقصد کے تحت تخلیق ہونے والے کرداروں پر سماجی اصلاح کار رجحان غالب رہا۔اس عہد کے کردار انسانوں کو نیکی کا درس دیتے ہیں اور زیادہ تر کردار اسم بامسمّٰی کہلائے۔کردار جس مقصد کے لئے تخلیق ہوا اس نے وہی مقاصد حاصل کیے اور اس کا ارتقائی سفر حصول مقاصد کی کڑی پابندیوں تلے دب کر رہ گیا۔

جب وقت کا پہیہ گھوما اور وقت کی سکڑتی ہوئی حدوں نے داستان سے ناول اور ناول سے افسانے تک کا سفر طے کیا تو کردار نگاری کے رجحانات اور رویے بھی بدلے۔ترقی پسند تحریک نے کردار نگاری کے لئے نئی سمت کا تعین کیا جس میں سماجی حقیقت نگاری کو عروج حاصل ہوا۔اس عہد کے کردار طبقاتی تفریق اور ظلم کے خلاف احتجاج کی تصویر ہیں۔نچلے اور متوسط طبقے کے مسائل اور نفسیاتی الجھنوں میں گھرے کردار متعارف ہوئے۔فرد کا داخلی تصادم اور نفسیاتی کشمکش سے لبریز نفسیاتی کردار ترقی پسند تحریک ہی کی دین ہیں۔اس طرح کے کردار فرد کے لاشعور کی تشریح وتفہیم پر زور دیتے ہیں۔کرداروں کی خارجی زندگی سے توجہ کا رخ داخل کی طرف ہوگیا۔

> اس سے پہلے کرداروں کی پیش کش میں ان کے عمل وردعمل کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ اب ان کے نفسیاتی عوامل اور ذہنی کیفیات کو زیادہ قابل توجہ سمجھا گیا۔یوں سمجھ لیجیے کہ جدید سماجی علوم اور نئی دریافتوں کے مطالعہ نے کرداری مطالعے کا رخ بدل دیا اور ماحول وکردار کو سمجھنے سمجھانے کے لئے ان کے ذہن ولاشعور کی گرہیں کھلنا ضروری ہوگیا۔(۴)

اردو کے افسانوی ادب میں افسانے کو یہ امتیاز حاصل رہا کہ اس میں کردار نگاری کے رجحانات میں ارتقاء کا عمل شدت سے جاری رہا۔نفسیاتی کردار نگاری کے بعد علامتی اور تجریدی کردار نگاری بھی سامنے آئی۔اس عہد میں کہانی پن کی کمی سے ابلاغ کے مسائل شدت سے محسوس کئے گئے۔کردار نگاری کے انوکھے تجربات کی بدولت افسانے کی بنیادی

عمارت جس کی بنیادیں کہانی سے مرتب ہوتی تھیں ان میں خالی اور کھوکھلے پن کا احساس شدت سے ابھرا۔

کردار نگاری بحوالہ فکشن

ادب اور کہانی کا رشتہ قدیم زمانے ہی سے قائم ہے۔ کہانی کے واقعات انسانی دلچسپی سے بھرپور ہوتے ہیں۔ کہانی کے واقعات کی تکمیل کے لئے کردار نگاری کا سہارا لیا جاتا ہے۔ قاری کو کہانی کے کرداروں میں اپنے جذبات و احساسات کا اظہار محسوس ہوتا ہے۔ کہانی کے کردار ہی قاری کو اپنا ہم سفر بناتے ہیں۔ یہ انسانی ارتقاء کے ہر دور میں کسی نہ کسی صورت میں مقبول رہی ہے۔ اس میں دل چسپی کی عمومی وجہ یہ ہوتی ہے کہ کہانی کار عام انسانی زندگی سے الگ ایک تخیلاتی جہان آباد کرتا ہے۔

کہانی کی ابتدائی شکل میں داستان کے کردار ادب کا حصہ رہے ہیں۔ داستان میں ایک کہانی کے اندر کئی کہانیاں موجود ہوتی ہیں۔ داستان کے کردار عام انسانی زندگی سے کافی مختلف ہوتے ہیں۔ داستان کے کرداروں میں مافوق الفطرت کردار ہوتے ہیں جن میں خیر و شر کی کش مکش موجود ہوتی ہے۔ داستانوں کے کردار بھی داستان گو کہانی کی ضرورت واہمیت کے مطابق تخلیق کرتا ہے۔

داستان کے مقابلے میں ناول کے کردار مختلف نوعیت کا تقاضا کرتے ہیں کیوں کہ ناول کے کردار پوری زندگی کا احاطہ کئے ہوئے ہوتے ہے۔ ابتدائی عہد کے ناولوں کے کرداروں میں سنجیدگی اور مبالغہ آرائی کا عنصر زیادہ نظر آتا ہے۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ جب فرد اور زندگی کے اہم مسائل کو قابل مطالعہ سمجھا گیا تو ناول کے کرداروں میں حقیقت نگاری کی چھاپ پڑی جس کی بدولت تلخ حقائق ناول کی پہچان بنے۔ ناول کا کینوس وسیع ہوتا ہے اور اس میں کردار نگاری کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ جذبات و احساسات اور جزئیات نگاری کے بیان سے کردار کی داخلی و خارجی شخصیت کو سامنے لانے کی امکانات سے کردار نگاری میں ایک انفرادیت قائم ہوتی ہے۔ ناول نگار کردار پر مختلف اطراف اور زاویوں سے روشنی ڈالتا ہے۔

اردو کے افسانوی ادب میں افسانے کے اندر کردار اور کردار نگاری پر زیادہ توجہ دی گئی۔ افسانوی کردار زیادہ مہارت کا تقاضا کرتے ہیں۔ افسانے کا موضوع چوں کہ زندگی کا کوئی خاص پہلو ہوتا ہے اس لئے کردار بھی اسی حوالے سے سامنے آتے ہیں۔ افسانوی کردار نگاری کے تقاضوں کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر سنبل نگار لکھتی ہیں:۔

> کردار افسانے کے لئے بھی اسی طرح ضروری ہے جس طرح ناول کے لئے لیکن افسانے کا پیمانہ مختصر ہونے کے سبب افسانہ نگار کی دشواریاں زیادہ ہیں۔ ناول نگار کو مختلف زاویوں سے کردار پر روشنی ڈالنے اور اُسے اجاگر کرنے کا موقع ملتا ہے۔ جب کہ افسانہ نگار کردار کا کوئی ایک پہلو ہی کامیابی کے ساتھ پیش کرسکتا ہے۔ افسانہ نگار کو بڑی محنت کر کے کردار کو اس طرح تراشنا پڑتا ہے کہ وہ قاری کے دل میں گھر کر سکے۔ ناول میں کردار کا ارتقاء آسانی سے دکھایا جاسکتا ہے۔ جب کہ افسانے میں اس کی گنجائش کم ہوتی ہے۔ اس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے بڑی مہارت درکار ہے۔(۵)

کرداروں کو پیش کرنے کے حوالے سے اردو افسانے میں بھی مرکزی اور ثانوی نوعیت کے کردار ہوتے ہیں۔ افسانہ نگار بنیادی کردار پر زیادہ محنت اور مہارت کا مظاہرہ کرتا ہے کیونکہ کہانی کے اکثر واقعات اسی کردار کی بدولت جاری رہتے ہیں۔ مرکزی کردار کے علاوہ ثانوی، متحرک، جامد اور سٹیریوٹائپ کردار بھی ضرورت کے مطابق استعمال کئے جاتے ہیں۔

افسانوی کردار ہماری زندگی اور سماج سے اخذ کئے جاتے ہیں۔ جس طرح ہماری معاشرتی زندگی میں مختلف رویوں اور عادات کے حامل افراد مختلف طرح کی صورت حال میں الگ الگ ردعمل کا اظہار کرتے ہیں اسی طرح افسانے کے کردار بھی داخلی اور خارجی جبریت کے سامنے کبھی بے بس اور کبھی اپنی عقل و دانش سے حالات کو بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر انوار احمد لکھتے ہیں:۔

> افسانے کا ہر روپ انسانوں کی جذباتی، حسی اور فکری پرداخت پر اثر انداز ہوتا ہے اور اسی کی مدد سے وہ نہ صرف حال سے آشنا ہوتا ہے بلکہ وہ اس قوت کا ادراک بھی حاصل کرتا ہے جو اسے حالتِ جبر سے آزاد کر کے موجودہ زندگی کو ترتیب نو سے ہمکنار کرسکتی ہے اور اس کی بدولت وہ زندگی میں پیش آنے والی صعوبتوں، مسافتوں اور ہجرتوں کے لئے جذباتی اور فکری طور پر تیار ہوتا ہے۔(۶)

ڈرامہ نگاری میں کردار کافی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں کیونکہ ڈرامہ کے کرداروں کا تعلق عمل سے ہوتا ہے۔ ڈرامے کے کردار متحرک ہوتے ہیں اور ان کے لباس، مکالمے، زبان اور جسمانی حرکات وسکنات کا خاصا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ڈرامے کے کردار ناظرین کے سامنے نہ صرف کہانی کے واقعات کو عملاً دکھاتے ہیں

بل کہ ناظرین کی پسند و ناپسند بھی فوری نوعیت کی ہوتی ہے۔

کرداروں کے عمل اور مکالمے کے بغیر ڈرامے کا تصور بھی محال ہے۔ ڈرامہ نثر میں ہو یا نظم میں کردار نگاری اس کا جزو لازم ہے۔ ڈاکٹر اسلم قریشی نے ڈرامہ کی تعریف بیان کرتے ہوئے اپنی کتاب میں ہنری آرتھر جونز کی رائے کا حوالہ دیا ہے جو ڈرامہ کے متعلق لکھتا ہے:۔

> تھیٹر کی تصنیف میں کہانی کے واقعات و حالات کا جب تک کرداروں سے گہرا تعلق نہ ہو تو وہ لغو اور بے معنی ہو جائے گی اسے محض کرداروں کے ارتقاء کی نمائش کا وسیلہ ہونا چاہیے۔(۷)

طبقات کا تاریخی پس منظر

انسانی ارتقاء کے سفر میں شکار کے طویل دور کے بعد جب خوراک کے لئے زمین پر انحصار کیا جانے لگا تو زرعی سماج کی ابتدائی صورت سامنے آئی۔ اس عہد میں جب مرد شکار کی غرض سے جنگلوں کا رُخ کرتے تو عورتیں خیموں کے اردگرد کی زمین پر کاشت کاری کرتیں جس سے خوراک کا رُخ شکار سے زمین کی طرف موڑا اور زرعی انقلاب کے ابتدائی نقوش ظاہر ہونا شروع ہوئے۔

علاقے کی زرخیز زمینوں کا انتخاب کیا گیا اور انسانی معاشرہ دریاؤں کے کنارے آباد ہونا شروع ہوا۔ ان کناروں پر جب فصلیں لہلانا شروع ہوئیں تو گردونواح کے خوراک سے متاثر طاقت ور صحرائی ان فصلوں کو اجاڑ دیتے۔ ان لوگوں سے فصلوں کو محفوظ رکھنے کے لئے ہتھیار بند دستے اور جنگی سردار معرض وجود میں آئے اور آہستہ آہستہ یہی سردار بادشاہ کے روپ میں آنے والے وقتوں کے مختار کل بنے۔

زمین سے زیادہ پیداوار کی ہوس نے زمینداروں اور غلاموں پر مشتمل طبقاتی سماج کی داغ بیل ڈالی۔ بادشاہ اور اس کے دربار سے وابستہ طبقہ طاقت کے بل بوتے پر حکم ران بن بیٹھا۔ سماج کا یہ طبقہ زمین پر قابض ہوا اور اس نے تاجران اور غلاموں کا طبقہ اپنی معاشی اور انتظامی ضروریات کے تحت پیدا کیا۔ انسانی معاشرے میں طبقات کے ظہور پر علی عباس جلالپوری لکھتے ہیں:۔

> شہری ریاستوں کے ساتھ معاشی اور انتظامی ضروریات کے تحت معاشرہ انسانی طبقات میں بٹ گیا۔ اعلیٰ طبقہ بادشاہ اور اس کے درباریوں کا تھا۔ جن کے ہاتھوں میں فوجی طاقت اور نظم ونسق کے امور کی باگ دوڑ تھی جو پیداوار کے سب سے بڑے ذریعے یعنی ارضی پر قابض تھے۔ دوسرا طبقہ تاجران اور چھوٹے مالکان ارضی پر مشتمل تھا جو اجناس فراہم کرتے تھے۔ سب سے نچلا طبقہ غلاموں کا تھا جن سے کھیتوں میں مشقت لی جاتی تھی۔(۸)

طبقاتی سماج میں بادشاہ اور اس کے درباری اپنی زندگی میں آسائشوں کی خاطر غلاموں کی زندگی کو مزید مشکل بناتے رہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پیداوار زمین سے کارخانوں کی طرف منتقل ہوئی مگر طبقاتی سوچ وطبقاتی قوانین بدستور قائم رہے اور غلامی کی روایت ایک نئے ڈھنگ سے سامنے آئی۔ بقول علی عباس جلالپوری "غلامی ریاستوں کی یہ تفریق تاریخ عالم کی ایک مستقل روایت بن گئی اسی تفریق سے طبقاتی آویزش کا آغاز ہوا"(۹) طبقاتی معاشرے کا قدیم ترین تصور سومیر اور یونان کے شہر "ایتھنز" میں موجود تھا۔ ایتھنز کے معاشرے میں اعلیٰ طبقہ ریاستی امور سے وابستہ ، پیداوار پر قابض ، اور سب سے زیادہ بااختیار تھا۔ اس کے ساتھ تجارت سے وابستہ غیر ملکی لوگ تھے جن کا انتظامی امور میں کوئی دخل نہ تھا البتہ بڑے گھرانوں میں شادی کر کے یہ لوگ اپنا اثر ورسوخ اور تعلقات بڑھاتے۔ اس معاشرے میں غلاموں کے دو طبقات قائم تھے۔ ایک طبقہ آزاد غلاموں کا تھا جو ملازمت کی وجہ سے نسبتاً بہتر زندگی بسر کرتا تھا۔ طبقاتی سماج کا سب سے پس ماندہ طبقہ غلاموں کا تھا جن کی نہ صرف خرید وفروخت کی جاتی بل کہ جسمانی مشقت کے سارے اموران ہی سے خاص تھے۔ ایتھنز کے اس طبقاتی سماج میں معاشرتی نابرابری پر سبط حسن لکھتے ہیں:۔

> ایتھنز کے غریب سے غریب شہری کے پاس بھی ایک یا دو غلام ضرور ہوتے تھے۔ اسی طبقاتی نابرابری کا نتیجہ تھا کہ ایتھنز کے شہری اشیائے ضرورت کی پیداوار میں نہ صرف کوئی حصہ نہیں لیتے تھے بلکہ جسمانی محنت ومشقت کو بڑی حقارت سے دیکھتے تھے۔(۱۰)

طبقاتی معاشرے میں اعلیٰ طبقہ اپنے عروج کو قائم رکھنے کے لئے نہ صرف ظلم وجبر میں زیادہ سختی سے کام لیتا بلکہ ایسے قوانین بھی وضع کرتا جن کی مدد سے اس کا عروج قائم رہتا۔

طبقاتی معاشرے میں ذرائع پیداوار، دولت اور سہولت کے ساتھ ساتھ تعلیم پر اعلیٰ طبقے کی اجارہ داری تھی۔ وہ تعلیم سے نچلے طبقات کے اندر غلامانہ ذہنیت کو فروغ دینے کے اقدامات جاری رکھتے۔ طبقاتی سماج میں عوام کی اکثریت

ان پڑھ ہوتی تھی لہذا ان کو اپنا ہم خیال بنانے کے لئے ان کو مفت میں ڈرامے، ناٹک اور مذہبی کتابوں سے طبقہ اعلیٰ کی خدمت گزاری کا درس دیا جاتا تھا۔ طبقاتی سماج میں تعلیم کو بطور آلہ استعمال کرنے پر سبط حسن لکھتے ہیں۔ "لوگوں کے ذہنوں پر قابو پانے کا ہنر اسے بھی آتا تھا۔ ایتھنز میں رائے عامہ کو اپنا ہم خیال بنانے کا سب سے موثر ذریعہ ڈرامہ تھا" (۱۱)

طبقاتی سماج میں جبر و استحصال کی روایت مستحکم ہوتی چلی گئی۔ دولت پر چند افراد کی حکمرانی قائم ہوگئی اور غلاموں کے لئے جسم و جاں کا تعلق قائم رکھنا مشکل سے مشکل تر ہوتا گیا۔ مقتدر طبقہ استبداد کے ذریعے اپنی اجارداری بحال رکھنا چاہتا تھا لہذا ایسے قانون بنائے گئے جن کی مدد سے ذاتی املاک کا تحفظ مقصود تھا۔ قانون کا مقصد عدل و انصاف کے بجائے طبقاتی مفاد اور صورتِ احوال کو ایک ہی حالت میں قائم رکھنا تھا۔ طبقاتی معاشرے میں ذاتی املاک کا وجود اور تحفظ ہی وہ واحد محرک تھا جس نے طبقات کو نہ صرف جنم دیا بلکہ ان کو قائم رکھنے کا جواز بھی پیش کیا۔

سماج کے اندر ایسے افراد جو اس جبریت کو توڑنے کا عزم کرتے ان کو سیاسی مجرم ظاہر کر کے ان کی آواز کو ہمیشہ کے لئے دفن کرنے کی رسم بھی جاری و ساری رہی۔ ایسے اقدامات کو جرائم قرار دیا گیا جن کی مدد سے شخصی املاک کا تحفظ خطرے میں پڑنے کا احتمال رہتا۔ شخصی املاک نے انسانی اخلاق کو نئے سرے سے مرتب کیا۔ وہ سماج جس میں ایثار، مروت، احسان اور رحم و کرم کے مثبت اور تعمیری جذبات موجود ہوتے تھے ان کو شخصی املاک کے تصور نے لالچ، حسد اور بغض میں بدل کر رکھ دیا۔

شخصی املاک کے تصور اور تحفظ ہی نے جنگ و جدال کا جواز فراہم کیا اور معاشرتی استحصال کو وسعت بخشی۔ طاقت ور سرداروں نے کمزوروں کی املاک کو طاقت کے بل بوتے پر ہتھیا لیا اور ذاتی و انفرادی ہوس زر و مال نے بے گناہ شہریوں اور سماج کے نچلے طبقات کے خون کو پانی سے سستا سمجھ کر بے دریغ استعمال کیا۔ علی عباس جلالپوری لکھتے ہیں۔ "املاک کا لالچ ہی تاریخ میں خون ریزی، سفاکی اور قتل و غارت جیسے گھناؤنے جرائم کا سب سے بڑا سبب رہا اور آج بھی یہی لالچ جرائم اور استحصال کا اولین محرک ہے" (۱۲)

طبقاتی سماج میں ذرائع پیداوار پر مقتدر افراد کا قبضہ تھا۔ اسی قبضے کی بدولت سماج میں معاشی نابرابری کو تقویت ملی جس نے آقا اور غلام کی صورت میں طبقات کو پروان چڑھایا۔ طبقاتی سماج میں غلاموں کا کردار بڑا اہم رہا۔ ایک طرف تو وہ پیداوار کے ضمن میں اساسی نوعیت کے حامل تھے۔ ان کی محنت ہی کھیتوں سے اناج اگاتی اور انہی کا وجود کارخانے میں قدر زائد کا باعث بنتا۔ ان کی زندگی آقاؤں کے رحم و کرم پر تھی۔ آقا ہی غلاموں اور لونڈیوں کی جان و مال کے مالک تھے۔ غلاموں کی خرید و فروخت اور غیر فطری ہوس امراء کا شوق تھا۔ مختلف جنگوں میں قیدی مردوں اور عورتوں سے

ذلت آمیز سلوک روا رکھا جاتا۔ ظلم کے خلاف کئی مرتبہ غلاموں نے متحد ہو کر بغاوت بھی کی لیکن ان کو اکثر ناکامی کا منہ ہی دیکھنا پڑتا تھا۔ آبادی میں اضافے کی بدولت زمین کے بڑے قطعات کاشت کاری کے لئے استعمال ہونے لگے تو زمینداروں نے ارضی کو بٹائی پر دینے کا نیا رواج متعارف کروایا جس کی بدولت پیداواری قوتوں میں اضافہ جاگیرداری کے ظہور کا سبب بنا۔ اس تبدیلی کی وجہ سے آقا و غلام کا نیا رشتہ جاگیردار اور مزارع کی صورت میں ظاہر ہوا۔

جاگیردارانہ سماج میں مزارعوں کی حالت غلاموں سے قدرے بہتر تھی۔ یہ بات تو دونوں میں مشترک تھی کہ غلام اور مزراع بنیادی ضروریاتِ زندگی کی عدم فراہمی کے باعث کرب والم کی زندگی بسر کر رہے تھے مگر غلاموں کے برعکس مزارعین جاگیردار سے قرض حاصل کر کے قدرے آسائش کا سامان خرید سکتے تھے لیکن اسی قرض اور معمولی آسائش کا حساب ان کی آئندہ نسلیں غلامی در غلامی کی صورت میں ادا کرنے کی پابند رہتی تھیں۔

سائنس کی ایجادات نے صنعتی انقلاب کی راہ ہموار کی۔ صنعتی انقلاب کی بدولت پیداوار کارخ کارخانوں کی طرف مڑ گیا اور آقا و غلام کے بعد جاگیردار اور مزراع سے طبقاتی سماج نے ایک نئی صورت اختیار کی جو مزدور اور کارخانہ دار کا تعلق تھا۔ صنعتی انقلاب کی وجہ سے پیداوار کا مرکز کارخانے بن گئے۔ جن کے لئے خام مال کی فراہمی اور مصنوعات کی تیاری کا عمل شروع ہوا۔ مال کی کھپت کے لئے نئی منڈیوں کی تلاش شروع ہوئی جس کا انجام دو عالمی جنگوں پر منتج ہوا۔

سرمایہ داریت میں بھی طاقت و اختیار کے حامل سرمایہ دار طبقے نے ذاتی املاک کا تصور قائم رکھا۔ اس کا معاشرتی اظہار اس طرح ہوا کہ ایک طرف کارخانہ دار دولت کے انبار لگاتے رہے تو دوسری طرف مزدور طبقے کی حالت غلام اور مزراع سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اس تبدیلی میں ایک مثبت پہلو عورت و مزدور کی آزادی کی صورت میں سامنے آیا۔ عورتوں کی غلامی ختم ہونے کا آغاز ہوا اور وہ آزادی سے مردوں کے ساتھ کام کاج کرنے لگی۔ مزدور کی محنت کو تقسیم کر دیا گیا اور اس سے قدر زائد میں اضافہ ہوا مگر مزدور کی حالت غلاموں اور مزارعوں سے قدرے بہتر تھی البتہ طبقاتی آویزش میں شدت آ گئی کیونکہ صنعتی معاشرہ زرعی معاشرے کی فرسودہ قدروں اور بنیادوں پر قائم ہوا۔

ایک نقطہ نظر کے مطابق معاشرتی انصاف اور برابری کے بنیادی اصولوں پر مبنی معاشرے کے قیام میں سب سے بڑی رکاوٹ ملکیت کا تصور ہے۔ ذاتی املاک کے گمراہ کن تصور نے سماج میں طبقات کو فروغ دینے کا ایک لامختتم سلسلہ شروع کیا جو ہنوز معاشرتی انصاف کو مختلف حیلے بہانوں سے روکے ہوئے ہے۔ ملکیت کے بارے میں محمد عاصم بٹ لکھتے ہیں:۔

ملکیت کا تصور انسان کو سب سے زیادہ گمراہ کر سکتا اور سماجی انصاف کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ امیر اور صاحبِ ثروت زیادہ زیادہ فائدے کے حصول اور اپنی جائیداد میں اضافے کے لئے غریبوں کو دبانے کی کوشش کرتا ہے۔ (۱۳)

ہندوستان کا طبقاتی اور سماجی پس منظر

ہندوستان کی تاریخ میں عہد وسطیٰ اور اس کی سیاست طبقاتی سماج کو سمجھنے کے لئے کلیدی اہمیت رکھتی ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے عروج کا زمانہ ترکوں سے خاص ہے۔ انھوں نے قلیل مدت میں ہندوستان پر اپنا تسلط قائم کیا۔ ہندوستان میں ترکوں کا قلیل عرصے میں ایک مضبوط اور مستحکم حکومت قائم کرنا فوجی طاقت کے بجائے طبقاتی سماج کا مرہون منت ہے۔

قدیم ہندوستانی معاشرہ طبقاتی بنیادوں پر قائم تھا۔ شہر کے اندر اور باہر کی آبادی کے مابین طبقات کی ایک حد فاصل قائم تھی۔ شہر کے اندر طبقہ اعلیٰ زندگی کی تمام سہولیات سے مزین پر آسائش زندگی بسر کر رہا تھا مگر نچلے طبقے کے افراد نہ صرف بنیادی سہولیات سے محروم تھے بل کہ ان کے لئے شہر کے اندر داخلے کے بھی اوقات مقرر تھے۔ سماج کے یہ پسے ہوئے مظلوم طبقات حکمران طبقات کے خلاف بغاوت اور شدت کے جذبات رکھتے تھے۔ جب ترکوں نے حملے کئے تو سماج کے یہی مظلوم طبقات ان کے معاون بنے اور ہندوستان میں ان کی حکومت کو مضبوط کیا۔ ترکوں نے اپنی حکومت کو طوالت بخشنے کی خاطر شہر کے اندر برابری کے تصور کو فروغ دیا اور ہندوستانی معاشرے کے جمود کو توڑا۔ ترکوں کا دور حکومت ہندوستان کے نچلے طبقات کے لئے کسی نعمت سے کم نہ تھا کیوں کہ شہروں کے مزدوروں اور محنت کشوں میں برابری کی بدولت شہر کی پوری زندگی بدل گئی۔

قدیم ہندوستان کا معاشرہ جاگیردارانہ بنیادوں پر استوار تھا جہاں پیداوار کے ذرائع پر زمین دار قابض تھے۔ ان کو زمین کے مالکانہ حقوق میسر نہ تھے بل کہ پیداوار کا ایک قلیل حصہ ان کے اپنے استعمال میں آتا اور ایک بڑی پیداوار ریاست کے حصے میں جاتی تھی۔ عہد مغلیہ تک آتے آتے ہندوستان میں جاگیردارانہ نظام کی جڑیں کمزور ہو چکی تھیں۔ اس کی بنیادی وجہ زمینوں کی بڑی تعداد کو سلطنت میں شامل کرنا اور من پسند افراد کو جاگیریں عطا کرنا تھا۔

ہندوستان کے زرعی نظام میں بنیادی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ جس سے زمین کی ملکیت کو کسانوں اور موروثی جاگیرداروں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ہندوستان کا جاگیردار طبقہ پیداواری ذرائع پر قابض تھا اور اپنے طبقے کے تحفظ کی خاطر

ماتحتوں سے وفاداری کا تقاضا کرتا تھا۔

جاگیردار کے لئے زمین اہم اور روپیہ پیسہ ثانوی حیثیت رکھتا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ زمین کو حرکت اور منتقلی کے برعکس ایک طویل مدت تک قبضے میں رکھنا ممکن ہے۔ کسانوں اور مزدوروں کو صرف پیداوار کے حصول کے لئے استعمال کیا جاتا تھا اور ان کے خاندانوں کو قرضوں کے بوجھ میں اس طرح جکڑ دیا جاتا کہ وہ اپنے حقوق سے ناآشنا ہو کر آقا کے رحم و کرم پر جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھنا ہی زندگی کا مقصد سمجھ بیٹھے۔ جاگیرداروں کے ہاں نسل در نسل نیم غلام ہوتے جنھیں اپنی ذلت کا احساس تک نہ ہوتا اور وہ بلا معاوضہ کھانے اور تن ڈھانپنے میں ہی وفاداری کا دم بھرتے رہتے۔ ہندوستانی سماج میں جاگیردارانہ عہد طویل طبقاتی کشمکش کا عہد تھا۔ اس عہد میں طبقاتی تفریق واضح ہو کر سامنے آئی۔

انیسویں صدی کی آخری چوتھائی میں ہندوستان میں نئی قسم کے کارخانے قائم ہوئے۔ ان کارخانوں نے جہاں دیسی سرمایہ دار پیدا کیا وہاں مزدور تحریک بھی ابھر کر سامنے آئی۔ ہندوستان کے کارخانہ دار جبری مشقت اور مخصوص اوقاتِ کار کی مدد سے ترقی کے خواہاں تھے لہذا چھوٹی عمر کے بچوں اور عورتوں سے بھی جبری مشقت لینے کا رواج ہوا۔

بیسویں صدی کی پہلی دہائی تک ہندوستان کا مزدور طبقہ طبقاتی اور سیاسی کشمکش کی صلاحیت حاصل کر چکا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ہندوستان کا معاشی منظر نامہ تبدیل ہوا اور مزدوروں نے اپنے حقوق کے حصول میں شدت تو اختیار کی مگر درمیانے طبقے کی لیڈر شپ اور اس کے ذاتی مفادات کی پالیسیوں نے مزدور کے مقابلے میں سرمایہ داروں کو تقویت بخشی۔

ہندوستان کا معاشرہ ایک طبقاتی معاشرہ تھا جس نے جاگیرداریت سے سرمایہ داریت کا سفر کیا۔ استحصالی حوالے سے جاگیردارانہ جبریت کی ترقی یافتہ شکل نیا صنعتی معاشرہ تھا۔ جاگیردارانہ نظام کی ذہنیت، اقدار اور روایات پوری شدت سے اس میں موجود تھیں۔ قدیم ہندوستانی سماج کے حوالے سے ڈاکٹر مبارک علی کہتے ہیں:۔

> کارل مارکس نے ہندوستانی معاشرہ کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا کہ اس معاشرہ میں گاؤں کا ڈھانچہ جن بنیادوں پر قائم تھا اس نے ہندوستان کو منجمد معاشرہ میں تبدیل کر دیا کیونکہ گاؤں بذاتِ خود ایک ایسا سماجی و معاشی اور سیاسی یونٹ تھا کہ جس میں زندگی ٹھہری ہوئی تھی۔ یہاں پر کاشتکار اجتماعی طور پر زمین کاشت کرتے تھے اور حکومت کو اس کا لگان ادا کرتے تھے۔ ذات پات کی تقسیم اور مختلف پیشوں کا ان ذاتوں سے تعلق ہونے کے بعد کسی شخص کو اپنے سماجی مرتبہ کو بدلنے کا خیال تک نہیں آتا تھا۔ (۱۴)

ہندوستان کے جاگیردارانہ نظام میں لگان کا نظام رائج تھا اور جاگیردار بادشاہ کے زیر اثر لگان کی ادائیگی کے پابند تھے۔ جاگیردار لگان ادا کرنے کے بعد اپنے معاملات میں آزاد تھے جس کی بدولت طبقاتی استحصال میں اضافہ ہوتا رہا۔ شیر شاہ سوری نے کھیت مزدوروں کو نچلی سطح پر انتظامی امور میں شامل کیا۔ اکبر اور سوری کی سماجی تبدیلی کا اثر نچلے طبقات پر ہوا۔ ان سماجی تبدیلیوں نے ہندوستان میں تاجر طبقہ کو فروغ دیا جن کی بدولت ہندوستان میں نئے شہروں کا قیام عمل میں آیا۔ ہندوستان کے اسی تاجر طبقے نے اپنے مفادات کی خاطر غیر ملکی کمپنیوں کو ہندوستان میں مستحکم کیا۔ ان غیر ملکی کمپنیوں نے فوائد اور منافعیت کی خاطر جنگ و جدال کے ذریعے سیاسی اقتدار حاصل کیا اور مقامی باشندوں میں بے روزگاری کو فروغ دیا جس کی بدولت صنعتی انقلاب کے باوجود ہندوستان طبقات میں گھرا رہا۔

ہندوستانی سماج مذہبی ذات پات کی بنیادوں پر قائم تھا جس کا اثر ہندوستانی معاشرے کی سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی زندگی میں طبقاتی کشمکش کی صورت میں ظاہر ہوا۔ ہندوستان کی تہذیب نے بھی دیگر قدیم اقوام کی طرح دریائے گنگا اور جمنا کے کناروں پر نمو پائی اور پھل پھول کر ثمر آور ہوئی۔ ہندوستان کے قدیم باشندے کول اور دراوڑ نسل سے تعلق رکھتے تھے جن کے تہذیبی مراکز قدیم شہروں موہنجوداڑو اور ہڑپہ کی صورت میں تخلیق و تعمیر ہوئے۔ آریاؤں نے طاقت کے بل بوتے پر مقامی علاقوں اور آبادی کے وسائل پیداوار اور اذہان پر قبضہ جما لیا۔ آریاء سماج استحصال اور ذات پات یا اونچ نیچ کی بنیادوں پر پروان چڑھا۔ آریاؤں نے مقامی باشندوں کو غلام یا اچھوت سمجھ کر مستقل قانونی حیثیت دے دی چنانچہ ہندوستان کا نیا مذہبی ڈھانچہ ذات پات کے اصولوں پر ارتقائی عمل سے گزرا۔

برہمن برہما کے منہ سے پیدا ہونے والی اعلیٰ صفات کی حامل تخلیق تھی۔ ان کے بعد دوسرا طبقہ حکمران کھشتریوں پر مشتمل تھا جو برہمنوں کے حلیف و مددگار تھے۔ مذہبی طبقات کا تیسرا درجہ ویشوں پر مشتمل تھا جو کھیتی باڑی اور اناج سے منسلک تھا۔ سب سے نچلہ طبقہ اچھوتوں یا شودروں کا تھا جن کی تخلیق ہندو مذہب کے مطابق برہما کے پیروں سے ہوئی اور ان کی تخلیق کا مقصد اوپر کے تین مذہبی طبقات کی خدمت کرنا قرار پایا۔

ہندوستان کے طبقاتی سماج میں شودر طبقہ آج بھی اپنے حقوق اور معاشرتی بقا کے لئے کڑا اور دشوار سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔ ہندوستانی معاشرے کا سب سے قابل رحم اور مظلوم طبقہ شودروں کا تھا جس کے لئے مذہبی تعلیم تک کا سننا کانوں میں سیسہ ڈالنے کے مترادف تھا۔

برہمن طبقے نے املاک پر قبضے کے لئے مذہبی جواز ستی کی صورت میں فراہم کیا جس کے مطابق عورت کو شوہر کی لاش کے ساتھ زندہ جلا کر جائیداد کو اپنے تصرف میں لایا جاتا۔ طبقات کی یہ کڑی سختی مذہب کے بل بوتے پر اس قدر سخت

تھی کہ نچلے طبقے کا ہندو گوشت تک استعمال نہ کرنے کا پابند تھا جبکہ برہمن قربانی اور چڑھاوے کی صورت میں من پسند غذاؤں سے لطف اندوز ہوتے۔

اس بحث سے یہ نتائج اخذ کئے جاسکتے ہیں کہ ہندوستان کا معاشرہ مذہبی، معاشرتی اور معاشی حوالے سے طبقات پر مبنی تھا۔ مذہب اور معاش کی طبقاتی کشمکش کی بنیادوں نے طبقاتی معاشرہ کو وجود بخشا جس نے مذہبی حوالے سے نہ صرف ذات پات کو فروغ دیا بلکہ جاگیرداریت سے صنعتی معاشرے تک کا عمل امیر، غریب، آقا، غلام اور مزدور و مالک کی صورت میں ارتقائی عمل سے گزرا۔

ہندوستان کے طبقاتی سماج نے فرد اور جماعت کو نفسیاتی حوالوں سے متاثر کیا۔ طبقاتی اونچ نیچ کے نفسیاتی اثرات میں فرد کی باطنی زندگی بے چینی، اضطراب، خوف اور دہشت کا شکار ہوئی۔ یہ نفسیاتی اثرات فرد کی انفرادی زندگی سے اجتماعی معاشرتی زندگی پر اثر انداز ہوئے۔ محرومی و بنجر پن، فرار کی اجتماعی سوچ، استحصال اور معاشی ناہمواریوں کی گھٹن سے بھرپور معاشرہ تخلیق و تعمیر ہوا۔ طبقاتی تشدد نے اجتماعی اور انفرادی رویوں اور رجحانات پر گہرے اثرات ڈالے جس کی بدولت موجودہ عہد تک کا پاک و ہند سماج طبقاتی سوچ اور تشدد کی پالیسیوں پر گامزن ہے۔

طبقاتی جبریت کے عوامل

طبقاتی معاشرے کی بنت میں کچھ بنیادی نوعیت کے عوامل ہوتے ہیں جو جبریت کے عوامل کہلاتے ہیں۔ یہ عوامل سماج کی طبقاتی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں جس کا اثر فرد اور معاشرے کی ذہنی اور نفسیاتی الجھنوں اور کشمکش کی صورت میں ایک مستقل رجحان بن کر ابھرتا ہے۔ طبقات اور طبقاتی معاشرے کی درست تفہیم کے حوالے سے روسو اور مارکس جیسے جدید علماء نے اہم مباحث کی ہیں۔

طبقاتی جبریت کے عوامل کا سراغ روسو کے ہاں شدت سے نظر آتا ہے۔ وہ طبقاتی سماج کے خلاف معاشرتی برابری کا علمبردار ہے۔ اس کا خیال ہے کہ سماج کی ناجائز بنیادیں جو خارجی حاکمیت کی صورت میں ظاہر ہو کر طبقات کا باعث بنتی ہیں دراصل طبقاتی جبریت کا نقطہ آغاز ہیں۔ روسو کے بارے میں قاضی جاوید لکھتے ہیں:۔

> وہ خارج سے نافذ ہونے والی کسی حاکمیت کے خلاف آزادی کا علمبردار ہے۔ خارجی نظم و ضبط کے خلاف وہ فطری اضطراری رجحان کو مضبوط دیکھنے کا خواہاں تھا اور سماجی رویوں کے خلاف فرد کے احساسات کی تائید کرتا تھا۔ (۱۵)

وہ فرد کی فطری آزادی چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ انسان آزاد پیدا ہوا مگر ہر جگہ اس پر غلامی کی زنجیریں اپنا زور اور طاقت دکھا رہی ہیں۔ انسان کی غلامی میں سماج کا کردار بنیادی نوعیت کا ہے اور عالم فطرت کے مقابلے میں سماج کا جواز ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اس سماج کو بدصورت اور نا قابل عمل قرار دیتا ہے جس کی تشکیل میں آمرانہ حکومت کا عمل دخل شامل ہو۔ وہ انسان اور حیوانوں میں بنیادی فرق آزاد ارادے کو قرار دیتا ہے۔ وہ آزادی کے حرکی تصور کا قائل تھا اور زندگی اس کے لئے جدوجہد کا نام ہے۔

اُس نے انسانی تاریخ کے تین انقلابات کا ذکر کیا۔ اس کے مطابق انسانی تاریخ کا پہلا انقلاب اس عہد سے متعلق ہے جب انسان نے خاندانی زندگی اختیار کی۔ اس کے نزدیک اس عہد کی نمایاں خوبی فطری زندگی کی بدولت سکون کی فروانی تھی۔ انسانی تاریخ کا دوسرا انقلاب کھیتی باڑی اور دھاتوں کے استعمال کا زمانہ تھا لیکن اس عہد کو طبقاتی سمت مہیا کرنے میں نجی ملکیت نے بنیادی کام کیا۔ اس عہد میں تقسیم کار کی وجہ سے غلامی اور خودغرضی میں اضافہ ہوا جس نے آگے چل کر طبقاتی سماج کی تشکیل کی۔ بقول قاضی جاوید:۔

> اس سے خودغرضی میں اضافہ ہوا۔ اس دور میں خودمختاری اور خود کفالتی ختم ہوئی۔ دست نگری اور غلامی نے اس کی جگہ لے لی۔ خودغرضی اور کشمکش کو قابو رکھنے کی خاطر ریاست کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔(۱۶)

انسانی تاریخ کا تیسرا انقلاب طبقاتی سماج کی منظم اور واضح صورت بن کر ابھرا۔ اس عہد میں طاقت اور کمزوری کے بنیادی اصول کی بدولت ظلم اور ناانصافی پر مبنی سماج تشکیل ہوا۔ اس عہد کا ذکر قاضی جاوید اس طرح کرتے ہیں:۔

> لوگ گروہوں میں تقسیم ہونے لگے۔ جو طاقتور تھے انھوں نے اپنی بالادستی کو منوانا شروع کر دیا اور زیردستوں کو قابو میں رکھنے کی مختلف تدابیر پر عمل شروع ہو گیا۔ یوں ایک نظام جنم لینے لگا۔ لوگوں نے اپنی آزادی کے تحفظ کے خیال سے اس نظام کو قبول کر لیا۔ روسو کے نزدیک یہ ایک قسم کا معاہدہ تھا لیکن یہ معاہدہ نیک نیتی پر مبنی نہیں۔ اس کی بنیاد ظلم اور بالادستی پر ہے۔(۱۷)

اُس کا خیال تھا کہ فطرت کے اعتبار سے ایک انسان کو دوسرے انسان پر حاکمیت روا نہیں اور چونکہ قوت حق کی بنیاد نہیں لہذا جائز حاکمیت کی بنیاد پر تمام معاہدے قرار پاتے ہیں اور یہی سماجی معاہدے کہلاتے ہیں۔ اُس کے معاہدہ عمرانی میں فرد بطور شہری پیش ہوا۔ معاہدہ عمرانی میں اس نے اس بات سے پردہ اٹھایا کہ فرد اجتماعی فلاح کی خاطر

انفرادیت ضم کر دیتا ہے مگر ریاست اسی انفرادیت سے دستبرداری کے پس پردہ اپنی بالادستی قائم کر لیتی ہے۔ اُس کے ہاں طبقاتی جبریت کے بنیادی عوامل میں سماج کی ناجائز بنیادوں، فطری آزادی کا نہ ہونا، خارجی حاکمیت، تاریخ انسانی کی طبقاتی تشکیل اور جدید سیاسی شعور میں اقدار کی تشکیل کے فقدان کو نمایاں مقام اور اہمیت حاصل ہے۔

طبقاتی جبریت کے عوامل کی نشان دہی میں کارل مارکس (Carl Marks) کا کام بھی کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ بنیادی طور پر جاگیرداری کے خلاف تھا اور اس کا خیال تھا کہ اسی نظام کی بدولت کسان صدیوں سے غلامی میں جکڑے ہونے کی بدولت اپنے بنیادی حقوق سے محروم رہے ہیں۔ وہ طبقاتی سماج کی بنیاد ذرائع پیداوار سے متعین کرتا ہے۔ اس کے مطابق طبقات معاشرہ میں بنیادی فرق یہ ہے کہ کون سا طبقہ ذرائع پیداوار کا مالک ہے کیوں کہ جو طبقہ ذرائع پیداوار کا مالک ہے وہی دوسرے طبقے کا استحصال کرتا ہے۔

اُس کے ہاں طبقاتی عوامل تلاش کرنے کے لئے اس کے تصور جدلیاتی مادیت کو سمجھنا ضروری ہے کیوں کہ وہ طبقاتی تشکیل میں جدلیاتی مادیت اور تاریخی مادیت کی وضاحت کرتا ہے۔ اُس نے جدلیات مادیت کے تحت مادے کے شعور پر مقدم ہونے کا ذکر کیا۔ اس کے مطابق مادہ نہ صرف مقدم ہے بل کہ وہ مسلسل تغیر و حرکت کی حالت میں ہے۔ اسی طرح اشیاء اضداد سے پہچانی جاتی ہیں اور ہر اثبات میں اس کی نفی اور ہر نفی کی نفی سے دوبارہ اثبات کا عمل ہوتا ہے۔

وہ مندرجہ بالا مادی حرکات اور اضداد کا اطلاق سماج کی تشکیل میں کرتا ہے اور طبقات سماج کی صورت پذیری میں جاگیرداروں کے لئے ساہوکاروں کی ضرورت اور کھیت مزدوروں کی مدد سے پیداوار حاصل کرنا اس نظام کا مثبت پہلو قرار دیتا ہے مگر نفی کی نفی میں تاجروں یا ساہوکاروں کی طرف سے جاگیرداروں کا قلع قمع کرنا نفی کی نفی کا پہلو ہے۔

اُس نے بھی طبقاتی تشکیل میں انسانی تاریخ کے تین انقلابات کا ذکر کیا اور اشتراکیت سے زرعی اور صنعتی سماج کے قیام تک طریق پیداوار اور ذرائع پیداوار کی بنیاد پر طبقات کا وجود ثابت کیا۔ اُس نے زیادہ توجہ معاشی احوال پر مرکوز کی اور معاشی تبدیلی سے سماجی تبدیلی کا ذکر کیا۔ اُس کے معاشی احوال اور طبقاتی معاشرہ لازم و ملزوم ہیں کیوں کہ دونوں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

اُس نے قدر زائد کا تصور پیش کر کے مزدور کے استحصال کا ذکر کیا اور اس امر کی وضاحت کی کہ قدر زائد سرمائے میں بدل کر نئے کارخانوں کا باعث بنتی ہے۔ وہ بھی ذاتی ملکیت کے بجائے اجتماعی ملکیت کا خواہاں ہے۔ اُس کے مطابق مادی احوال یعنی پیداواری قوتیں، پیداواری وسائل اور پیداواری رشتے مل کر وجود بناتے ہیں جب کہ سیاسیات، معاشیات، اخلاقیات اور ادبیات وغیرہ اس کی بالائی شعوری عمارت بناتے ہیں۔ پیداواری قوتوں اور پیداواری وسائل

کے بدل جانے سے سیاسی، معاشی، اخلاقی سماجی قدریں بھی بدل جاتی ہیں۔اُس کے ہاں ذرائع پیداوار بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔سماج میں طبقات کا ظہور ذرائع پیداوار پر قبضے کی صورت میں پروان چڑھتا ہے۔اس طرح ذاتی املاک کا تصور بھی طبقاتی جبریت کا لازمی جزو ہے۔اس کے ساتھ ساتھ اُس نے طبقاتی جبریت کی بدولت نفسیاتی الجھنوں کے پیدا ہونے کا بھی ذکر کیا۔اُس نے فلسفہ بیگانگی پیش کیا۔فلسفہ بیگانگی کے بارے میں سبط حسن اُس کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

> سرمایہ دار معاشرے میں بیگانگی کا نظام ذاتی ملکیت، اکتساب، محنت، سرمایہ اور زمین کی ایک دوسرے سے جدائی، تبادلہ اور مقابلہ، انسان کی قدر اور تخفیفِ قدر اجارہ داری اور مسابقت نظامِ زر پر مشتمل ہے۔(۱۸)

اُس کے مطابق بیگانگی کا احساس پیداواری عمل سے شروع ہوتا ہے اس لئے سرمایہ داری نظام میں پیداواری عمل بجائے خود، عمل کی بیگانگی کا عمل ہے۔محنت کار کا رشتہ اپنی محنت سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔اُس کا خیال تھا کہ جب محنت کار اپنی پیدا کی ہوئی اشیاء کو اپنے تصرف میں نہیں لا سکتا تو اس کی تخلیق اس کے مقابل آ کر رقیب کا کردار ادا کرنا شروع کر دیتی ہے جس کی وجہ سے کام سے اکتاہٹ اور بیزاری کا عمل شروع ہوتا ہے۔انسانی بیگانگی کا یہ احساس انسان کی جذباتی اور داخلی زندگی پر گہرے اثرات مرتسم کرتا ہے اور وہ لاکھوں کے ہجوم میں خود کو بیگانہ محسوس کرتا ہے۔اس طرح اُس نے طبقاتی جبریت کے عوامل کو جدلیاتی و تاریخی مادیت، قدرِ زائد، پیداوار کے ذرائع پر قبضہ، شخصی املاک اور نظریہ بیگانگی میں تلاش کئے ہیں۔

طبقاتی جبریت کا عوامل کے عوامل میں لینن (Layanan) کی عملی جدوجہد بھی قابل ذکر ہے۔اُس نے سترہ برس کی عمر میں انقلابی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ گہرائی سے مارکسی ادب کا مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ مارکس کے اصولوں پر عمل کر کے ہی جبر و استحصال کا خاتمہ ممکن ہے۔اس حوالے سے علی عباس جلالپوری لکھتے ہیں۔"اس کا سوچا سمجھا ہوا عقیدہ تھا کہ پرولتاریہ کی امریت کے قیام سے ہی استحصال کا کامل انسداد ممکن ہو سکتا ہے"(۱۹)

اُس نے مارکسی نظریات کا نہ صرف پرچار کیا بل کہ اس کا عملی اطلاق کر کے انقلاب روس کی راہ ہموار کی اور برابری کے بنیادی اصولوں پر عظیم اشتراکی انقلاب برپا کیا۔وہ زندگی کو ایک قیمتی متاع خیال کرتا تھا جس کا مقصد عظیم نصب العین کا حصول ہے۔

وہ مارکسی نظریات کی تعمیری اور تخلیقی ترجمانی کا نام تھا۔وہ ذرائع پیداوار پر پرولتاریہ کے قبضے، شخصی املاک کے

بجائے اشتراک املاک کے اصولوں کا قائل اور عملی اقدامات پر یقین رکھتا تھا۔ وہ انفرادی محنت اور طبقاتی جبریت کے خلاف تھا۔ اس کے نزدیک چند افراد کے دولت پر قبضے کی بدولت معاشرہ طبقات میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ اُس کے ایک مضمون کے حوالے سے علی عباس جلالپوری لکھتے ہیں:۔

> ہم ایک بہتر اور نیا نظام معاشرہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اس نئے معاشرے میں امیر اور غریب کی تفریق مٹ جائے گی اور سب لوگوں کو کام کرنا پڑے گا۔ محنت کا ثمر گنتی کے چند لوگوں کی جیب میں نہیں جائے گا بلکہ سب لوگ اس اجتماعی محنت کا پھل کھائیں گے (۲۰)

اُس نے مارکسی نظریات کا عملی اطلاق کر کے دنیا بھر کے محنت کشوں اور مزدور طبقے کو نجات کی راہ دکھائی جس کے اثر سے سامراج کو اپنی طبقاتی پالیسیوں پر نئے سرے سے سوچ و بچار کرنا پڑی۔ اُس نے جنگ عظیم اول کو نوآبادیوں کی تقسیم قرار دیا۔ اس کے نزدیک سامراجی طاقتوں کی رقابت وطنیت کے کھوکھلے نظریات پر دنیا بھر کے محنت کشوں کو نہ صرف قربان کر رہی ہے بلکہ ذرائع پیداوار اور وسائل کی ہوس طبقات کا ازلی سامان مہیا کرنے کی بھی کوشش ہے۔ وہ دراصل وسائل پیداوار پر عوام کا قبضہ اور پیداوار کی منصفانہ تقسیم کا خواہشمند تھا اور مارکسی نظریات کے لئے عملی جدوجہد کا روشن نشان تھا۔

ماوزے تنگ (Moa Tse-tung) کا کردار بھی طبقاتی جبریت کے خلاف عملی جدوجہد اور چین میں اشتراکی انقلاب کی بدولت نمایاں مقام رکھتا ہے۔ وہ سامراج کے خلاف کسانوں کی تنظیم سازی کر کے مارکسی نظریات کو عملی طور پر نافذ کرنے میں کامیاب رہا۔ ماؤ نے کسانوں کو منظم، عوام کو عقل و استدلال سے قائل اور انہیں امید، اعتماد اور مساوات کا درس دیا۔

وہ طبقاتی جبریت کے عوامل میں ناامیدی، عدم اعتماد اور مساوات کے فقدان کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ اس نے اجتماعی املاک اور ذرائع پیداوار پر مساوی عوامی قبضے کو نہ صرف زیادہ اہمیت دی بل کہ چین میں اشتراکی انقلاب کی صورت میں ان عوامل کا عملی اطلاق کر کے چین کو ترقی کی راہ پر گامزن کیا۔ وہ رجعت پسندی کا خاتمہ چاہتا تھا اور عوامی طاقت کا قائل تھا۔ وہ عوامی خدمت پر یقین، اور خودنمائی و تکبر کے بجائے بے نفسی اور دوراندیشی پر ایمان رکھتا تھا۔ اُس کی طبقاتی نفرت اور سماجی مساوات کے بارے میں علی عباس جلالپوری نے لکھا۔ "ہم نے عوام کو عقل و استدلال سے قائل کر کے انہیں اپنے ساتھ نہیں ملایا بلکہ انھیں امید، اعتماد اور مساوات کا درس دیا۔ فاقہ کشی کے عالم میں مساوات کا جذبہ مذہبی جذبے کی طرح پرجوش ہوتا ہے" (۲۱)

ہندوستان میں فرنگیوں سے کامل آزادی کے حصول کی خاطر عملی جدوجہد کے حوالے سے مولانا حسرت موہانی کی خدمات بھی ہندوستان کے طبقاتی سماج اور انگریزی سامراجیت کے دوہرے میعار کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوسکتی ہیں۔ عملی زندگی میں ان کی نمایاں صفات، بے خوفی، مستقل مزاجی اور ثابت قدمی ہیں مگر انھوں نے ان صفات کا عملی مظاہرہ فرہنگی استعماریت سے نجات کے ضمن میں بھرپور طریقے سے کیا۔

وہ غیر طبقاتی و غیر استحصالی تصور سے متاثر تھے وہ اسلام اور غیر طبقاتی نظام میں مشترک قدروں کی وضاحت و عملی اطلاق کے قائل تھے۔ مولانا جنوبی ایشیاء سے فرنگیوں کا اخراج اور ان کے طبقاتی اقدامات کو نمایاں کرنا چاہتے تھے۔ مولانا ادب سے ظلم وستم کا خاتمہ کرنے کا تقاضا کرتے تھے۔ 1936ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین میں انھوں نے کہا "ہمارے ادب کو سامراجیوں اور ظلم کرنے والوں کی مخالفت کرنی چاہیے اور غریبوں کو سوشلزم اور کمیونزم کی تلقین کرنی چاہیے" (۲۲) اُن کو اسلام سے گہرا لگاؤ تھا اور وہ غیر طبقاتی و استحصالی نظام سے گہری وابستگی کے باوجود اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ چین میں ماؤ اور ہوچی من نے ویتنام کے اندر ان نظریات میں داخلی عوامل کی بنا پر تبدیلیاں کیں۔

وہ طبقاتی سماج اور ذات پات کے خلاف انصاف اور معاشرتی مساوات پر مبنی معاشرہ چاہتے تھے۔ مولانا غیر طبقاتی و غیر استحصالی فلسفے کو اصلاحی اصولوں کی نئی تشریح قرار دیتے تھے۔ وہ لینن اور ماؤ کی طرح ہندوستان میں سامراج اور اس کی ناانصافی، استبداد اور طبقاتی سماجی تشکیل کے خلاف عملی جدوجہد کرتے رہے۔ اُن کی جدوجہد کے بارے میں نقاش کاظمی لکھتے ہیں:۔

> برعظیم کی سپاہ آزادی کا ایک انقلابی مجاہد جو برسہا برس تک فرنگی سامراج کے جذبہ مطلق العنانی، جبر واستبداد اور وطن پر غاصبانہ قبضے کے خلاف نبرد آزما رہا جس کے لئے بار بار ایام اسیری اور قید وبند کے مصائب کو گلے لگانا پڑا۔ (۲۳)

اُن کے نزدیک طبقاتی جبریت کے خاتمے کے لئے کامل آزادی، مساوات، آزاد جمہوریت کے ساتھ ساتھ ذرائع پیداوار کی مساوی تقسیم ضروری ہے۔ ان کے نزدیک ہر سماج معاشرتی انصاف کے لئے داخلی تبدیلیوں کے ساتھ غیر طبقاتی نظام کا نفاذ کرسکتا ہے۔

سید علی عباس جلالپوری نے طبقاتی سماج اور اس پر اثر انداز ہونے والے عوامل کا تاریخی تناظر میں مطالعہ کیا۔ وہ فکری اعتبار سے تاعمر جدلیاتی مادیت پسندی اور غیر طبقاتی روایت فلسفہ سے وابستہ رہے۔ وہ اس نظریے پر یقین رکھتے تھے کہ محنت کش طبقہ قوانینِ قدرت کو اپنے تصرف میں لاکر تاریخ کے جبر کا خاتمہ کرسکتا ہے۔ وہ استحصال سے نجات کے

لئے غیر طبقاتی نظام انقلاب کو وقت کی ضرورت قرار دیتے ہیں۔

وہ اشتراکی اصولِ معاش اور اجتماعی املاک کے نظام سے ایثار نفس، امداد باہمی، انسان دوستی، مروت و احسان جیسی تعمیری اقدار کو نمو ہوتے دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک چند افراد کی معاشی غلامی میں جکڑی ہوئی اکثریت کے معاشرے میں خیر، عدل یا مسرت کو اخلاقی نصب العین نہیں بنایا جا سکتا۔

وہ طبقاتی سماج میں طبقاتی جبریت کے عوامل کے ضمن میں اجتماعی املاک کا فقدان، معاشی عدم مساوات اور ذرائع پیداوار پر چند افراد کا قبضہ گردانتے ہیں۔ اس حوالے سے اپنی کتاب "تاریخ کا نیا موڑ" میں یوں رقمطراز ہیں کہ اشتراکی معاشرے میں:۔

۱۔ پیداوار کے وسائل محنت کشوں کے قبضے میں ہیں۔
۲۔ شخصی املاک کا خاتمہ کر کے اجتماعی اور مشترکہ املاک کی بناء پر معاشرے کو از سر نو تعمیر کیا جا رہا ہے
۳۔ شخصی املاک کے خاتمے کے ساتھ استحصال کا سد باب کر دیا گیا۔ جس سے روایتی تفریق مٹ گئی ہے۔
۴۔ معاشی مساوات کے ساتھ حقیقی معاشرتی مساوات قائم کر دی گئی ہے۔ (۲۴)

اُن کے ایسے تمام خیالات کی احساس ان کی اجتماعیت، خارجیت، عقلیت، اشراکیت اور ترقی پسندانہ انسان دوستی پر ہے۔

معروف مفکر اور سماجی مورخ سید سبط حسن نے بھی سماج کی طبقاتی تشکیل کا مطالعہ کیا۔ وہ امریت، جاگیرداری، سرمایہ داری، ضعیف الاعتقادی، فکری جمود، قدامت پسندی کے مقابل جمہوریت، سوشلزم، سیکولرازم، عقلی و سائنسی تفکر، ارتقاء و اجتہاد اور روشن خیالی کے پاسدار رہے۔ ان کا بنیادی نقطہ نظر یہ ہے کہ آلاتِ پیداوار اور طرز پیداوار کی تبدیلیاں انقلابی نوعیت کے تغیرات کا باعث بنتی ہیں۔ اُنھوں نے کیمونزم کو یوں بیان کیا:۔

سائنسی سوشلزم سے مراد وہ سماجی نظام ہے جس میں پیداوار کے تمام ذرائع زمین، معدنیات، کارخانے، فیکٹریاں، بینک، تجارت وغیرہ معاشرے کی مشترکہ ملکیت ہوتے ہیں اور ان کی پیداوار جسمانی اور ذہنی کام کرنے والوں کی تخلیقی محنت کے مطابق تقسیم کی جاتی ہے۔ (۲۵)

وہ بھی بنیادی طور پر معاشرتی مساوات کے لئے دیگر عوامل کے ساتھ معاشی برابری اور انصاف کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسان کو عقل کی بدولت اپنے مسائل پر قابو پانے کی سعی کرنی چاہیے۔ وہ پیداوار کی مساوی تقسیم اور اجتماعی املاک کے قائل ہیں۔ انھوں نے مارکس اور اینگلز کے نظریات کی نہ صرف آسان تشریح بلکہ انسان کی معاشی تاریخ کے عہد بہ عہد ارتقاء کا جائزہ بھی لیا۔

ڈاکٹر مبارک علی نے طبقاتی تاریخ کا مطالعہ کیا اور خصوصاً ہندوستان میں طبقات کے قیام، ایسٹ انڈیا کمپنی کا استحصال اور دیگر حملہ آوروں کی ہندوستان میں فتح مندی کے عناصر کا سراغ لگایا۔ ان کے نزدیک ہندوستان کی خراب معاشی حالت، طبقاتی تقسیم، اکثریت کی روزگار و مراعات سے محرومی نے اسے مجبور کیا کہ وہ انگریزوں کی ملازمت اختیار کر کے اپنے ہم وطنوں کے خلاف جنگ کریں۔ اُن کے ہاں جاگیردارانہ نظام، جاگیردارانہ ثقافت یا روایات و اقدار کی قباحتیں بھی سیاسی، سماجی اور معاشرتی پسماندگی کا سبب بنتی ہیں۔

اُنھوں نے ہندوستان میں غوریوں اور ترکوں کی فتوحات کے پس منظر کو ہندوستان کے طبقاتی سماج کے تناظر میں دیکھا۔ انھوں نے پروفیسر حبیب کے حوالے سے لکھا کہ ہندوستان میں ترکوں کی فتوحات سے پہلے محنت کش طبقہ شہروں سے باہر رہتا تھا اور غوریوں کی سماجی تشکیل ہندوستانی معاشرے میں ذات پات کے خلاف تھی۔ وہ انگریزوں کی آمد سے قبل کے ہندوستان کے بارے میں لکھتے ہیں "ذات پات کی تقسیم، غیر مساوی اور طبقاتی نظام، معاشی وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم اور مذہبی عقائد و روایات میں پختگی دونوں معاشروں کی خصوصیات تھیں" (۲۶)

اس طرح ہندوستان میں غوریوں اور ترکوں کی آمد سے قبل کے طبقاتی سماج نے نہ صرف ان کو استحکام بخشا بلکہ انگریزوں کی آمد سے پہلے بھی مذہبی اور معاشی طبقات موجود تھے۔ ان طبقات کو اپنی حکومت کی مضبوطی کے لئے انگریزوں نے انتظامی امور کے ساتھ ساتھ فلاحی کاموں میں بہتری کے ذریعے ختم کیا۔ ڈاکٹر مبارک کا خیال ہے:۔

> جب ہسپتال بنے تو اس میں ذات پات کی تمیز کے بغیر تمام مریض ایک ہی ہال میں رہتے تھے، جیل میں قیدیوں کو بھی ساتھ رہنا پڑتا، فوج میں سپاہی بیرکوں میں مل کر رہنے پر مجبور تھے۔ فیکٹریوں میں تمام مزدور مل کر کام کرتے اور عدالت میں سب ہی کو کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑتا تھا۔ اس نے کم از کم شہروں میں ذات پات کے تعصبات کو توڑا اور لوگوں میں رواداری کے جذبات پیدا کئے۔ (۲۷)

اس طرح اُنھوں نے طبقاتی جبریت کے عوامل میں ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ کر کے ذات پات کی تقسیم اور معاشی و معاشرتی عدم مساوات کو اہمیت دی۔

طبقاتی تشدد کے ضمن میں مولانا عبیداللہ سندھی کے افکار و نظریات بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔طبقاتی جبریت یا تشدد کے عوامل میں وہ انسانی معاشرے میں عدل و انصاف، بنیادی حقوق کے تحفظ اور فطری آزادی کے فقدان کو بنیادی مسئلہ قرار دیتے ہیں۔ان کے نزدیک انسانی سماج عدل و انصاف اور فطری آزادی پر مبنی ہونا چاہیے۔وہ انسانی سماج کے ارتقاء میں معاشی انصاف کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک معاش اور اخلاقیات کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔معاش انسانوں کی اخلاقیات پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہے۔اگر انسانی سماج میں بھوک و افلاس اور معاشی طبقات ہوں تو سماج مادی اور روحانی ترقی سے ہم کنار نہیں ہوسکتا:۔

> جب اجتماع میں بقدر ضرورت مالی اور علمی اشتراک پیدا ہو جاتا ہے تو اس میں ہر فرد کی بدنی اور عقلی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔کمزوروں کی خبر گیری اور ظالموں کی سرکوبی کا نظام مضبوط ہوتا ہے۔(۲۸)

اسی تصور مساوات کے مطابق وہ سماج کے محنت کش طبقے کے استحصال کو روکتے ہیں اور ان کی سماجی بہتری کے لیے رہنمائی کرتے ہیں۔زرعی زمینوں کے بارے میں ان کی رائے تھی کہ ایک کاشت کار کے پاس اتنی ہی زمین ہونی چاہیے جتنی وہ خود کاشت کر سکے، باقی زمین پر اس کا کوئی حق نہیں ہے۔ان کے مطابق انسانی معاشرے کی فلاح کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے استحصالی اور طبقاتی نظام معاشرہ کی فرسودہ روایات کا قلع قمع کیا جائے اور ایک ایسا انسانی سماج تشکیل دیا جائے جہاں تمام انسان برابری کی بنیاد پر اللہ پاک کی نعمتوں سے استفادہ کر سکیں۔

وہ حضرت شاہ ولی اللہ کی پیروی میں اس نقطے کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں کہ اگر افراد معاشرہ کو بنیادی ضروریات میسر نہ ہوں تو اخلاقی گراوٹ کا عمل ہوتا ہے جس سے اجتماعی اخلاقیات تباہ ہو جاتی ہیں۔وہ طبقاتی نظام کے خاتمے سے دولت کی گردش جاری رکھنے کے خواہش مند ہیں۔آپ کے نزدیک ہر فرد کے لیے بنیادی ضروریات تک رسائی اس کا بنیادی حق ہے جس کا اہتمام ریاست کو کرنا چاہیے۔معاشرے کا اقتصادی نظام اجتماعیت پر مبنی ہونا چاہیے:۔

> چند بھوکے انسان ہیں ان کے لیے روٹی کا انتظام نہیں ہے ان کے لیے ایک دن کا انتظام کر دینے سے ان کی بھوک کا مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔اس کا انتظام سوچنے کے لیے کافی وقت اور توجہ کی ضرورت رہے گی یہ ہے بڑا فکر جو جب تک پورا نہ ہو جائے سامنے رہنا چاہیے(۲۹)

وہ اس ضروری مسئلے کی طرف توجہ مبذول کرواتے ہیں کہ معاشرے کی مدد اور خبر گیری یہ نہیں کہ وقتی طور پر روٹی اور کپڑا دے دیا جائے اور اطمینان کر لیا جائے بل کہ منظم اداروں کو رواج دیا جائے۔ وہ انسانی معاشرے میں بنیادی انسانی حقوق کی پاسداری کو انسانیت کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں اور ایک ایسے نظام کی اشد ضرورت سمجھتے ہیں جو مساوات کے بنیادی اصولوں پر استوار ہو اور انسانوں کی کفالت کا اہتمام ہو۔ افراد معاشرہ کی محنت کے استحصال کے بجائے ایک ریاستی نظام میں انہیں روٹی، کپڑا، مکان اور عزت نفس کا تحفظ حاصل ہو۔ طبقاتی نظام معاشرہ میں افراد کے اندر اپنی محنت کا پورا صلہ نہ ملنے کی بدولت اکتاہٹ کی فضاء پیدا ہوتی ہے جس سے نہ صرف فرد بلکہ اجتماعی سماجی ترقی میں رکاوٹ کا عنصر ابھرتا ہے۔ وہ ایک غیر طبقاتی انسانی معاشرے کا قیام چاہتے ہیں جہاں ہر فرد کو ریاست کی اجتماعی خبر گیری کی بدولت معاش، تعلیم، روزگار اور آزادی کا تحفظ حاصل ہو۔ سماج میں کسی طرح کا خارجی تشدد یا جبر نہیں ہونا چاہیے۔ انسان کی بنیادی ضروریات کی فراہمی ریاست کا فرض ہے۔ فرد اس کے بدلے ریاست کا وفادار اور اس کی فلاح کا ضامن ہو۔ اظہار رائے کی مکمل آزادی، غرباء کی خبر گیری اور برابری کی سطح پر حقوق کا بلا امتیاز تحفظ سب کے لیے ممکن ہو۔ اس طرح ایک ایسا سماج وجود میں آئے گا جو انسانیت کے لیے ارتقاء کا ضامن ہوگا جہاں انفرادیت کے بجائے اجتماعی ترقی کا خواب شرمندہ تعبیر ہوگا۔

طبقاتی جبریت اور تشدد

کوئی ایسی کیفیت یا عمل جس سے افراد معاشرہ ذاتی یا گروہی طور پر داخلی و خارجی حوالے سے متاثر ہوں اور ان کے اندر ایک پریشانی کی فضاء ظاہر ہو، جبریت ہے۔ اس میں فرد کی داخلی اور خارجی زندگی متاثر ہوتی ہے۔ جبریت یا تشدد میں انسانی ارتقاء کی پوری تاریخ سمٹی ہوئی ہے جس سے انسان کی نفسیات کا گہرا تعلق ہے۔ انسانی تہذیب کی ابتداء میں زلزلے، طوفان، بجلی کی کڑک، موسموں کی شدت اور تباہ کاریاں، جنگلی جانوروں کے حملے اور انسانی اموات نے لاشعوری طور پر انسان میں ڈر کی فضاء پیدا کی۔ اس سے انسان کے اندر بچاؤ اور جوابی تشدد کا رجحان پیدا ہوا جس نے بتدریج فرد کو دوسروں پر جبریت کے لیے اکسایا۔ تشدد یا جبریت فرد کو داخلی طور پر متاثر کرتی ہے جس کی نوعیت سماجی، اخلاقی، جنسی و جذباتی اور معاشی ہونے کے علاوہ متنوع ہو سکتی ہے "انفرادی یا اجتماعی سطح پر کوئی ایسا غیر متوازن عمل یا حرکت جو کسی دوسرے فرد یا گروہ کو فکری، جذباتی یا جسمانی اضطراب، تشویش یا دکھ میں مبتلا کر دے وہ تشدد کہلاتا ہے" (۳۰)

نفسیات اور فرد

نفسیات بنیادی طور پر انسان کے ذہن، اس کی تشکیل اور عمل وردعمل کے مختلف پہلوؤں سے بحث کرتی ہے۔ یہ طبعی اور معاشرتی ماحول میں انسانی افعال وتجربات کا بغور مطالعہ کرتی ہے اور پھر ان سے اصول وقوانین وضع کر کے بہتر زندگی گزارنے کی راہ ہموار کرتی ہے۔ نفسیات وہ علم ہے جو انسانوں اور حیوانوں کے کردار کا سائنسی مطالعہ کرتا ہے۔ کردار کا اطلاق صرف ان ظاہری افعال پر نہیں ہوتا جو مشاہدے میں آسکتے ہیں بل کہ ان افعال اور کیفیات پر بھی ہوتا ہے جو مشاہدے میں آنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اندرونی افعال وکیفیات کے مطالعے کا طریقہ بالعموم یہی ہوتا ہے کہ ظاہری افعال کے مطالعے سے ان کے بارے میں نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔ پروفیسر نذیر احمد تشنہ نے نفسیات کی تعریف کے ضمن میں لکھا ہے "نفسیات انسانی ذہن اور کردار کا مطالعہ کرتی ہے۔ نفسیات انسانی فطرت ذہن اور طرز عمل کے مطالعے کا علم ہے"(۳۱) اس کے علاوہ نفسیات کو یوں بھی بیان کیا گیا ہے:۔

> نفسیات کی تعریف اس طرح کی جاسکتی ہے کہ یہ انسان کی ذہنی زندگی اور اس کے کردار کا جامع طور پر مطالعہ کرتی ہے جس میں حسی وحرکی افعال، شعوری وتحت الشعوری کیفیات آجاتی ہیں۔ ان افعال اور کیفیات کا مطالعہ طریقہ باطن، خارجی مشاہدہ دوسرے طریقوں سے کیا جاتا ہے اور یہ مطالعہ طبعی اور معاشرتی ماحول میں ہوتا ہے۔(۳۲)
>
> نفسیات بنیادی طور پر انسان کی ذہنی زندگی، اس کی ابتداء ترقی اور اس کے مختلف پہلوؤں سے بحث کرتی ہے۔ یہ طبعی اور معاشرتی ماحول میں انسانی افعال اور تجربات کا بغور مطالعہ کرتی ہے اور ان سے اصول اور قوانین وضع کرتی ہے۔ حیاتیاتی اور معاشرتی علوم انسانی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس کے حیاتیاتی، معاشی، سیاسی، معاشرتی، مذہبی اور ثقافتی پہلوؤں سے بحث کرتے ہیں لیکن انسانی ذہن اور کردار کے بنیادی اصول نفسیات ہی فراہم کرتی ہے۔(۳۳)

فرد اور کردار کو ماہرین نفسیات اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

> ہر ایک آدمی ایک نفسیاتی اکائی (Psychological unit) ہے اس لیے وہ دوسرے آدمی سے مختلف ہوتا ہے۔ ہر شخص اپنے انداز سے زندگی بسر کرتا ہے، ساتھ ہی وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی زندگی گزارتا ہے۔ وہ خاندان، گروہ اور جماعتوں سے وابستہ ہوتا ہے(۳۴)

نفسیات میں کردار سے مراد وہ انسانی افعال ہیں جو دیکھے جا سکتے ہیں جن کا معروضی طریقہ (Objective ways) سے مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔کردار میں اندرونی و بیرونی دونوں قسم کے تحرکات (Stimulations) شامل ہے۔کردار کی معروضی طور پر پیائش کی جا سکتی ہے۔(۳۵)

انسان زندگی اور کردار کو اپنی ذہنی سرگرمیوں کی وجہ سے ہی فروغ دیتا ہے۔ذہنی سرگرمیوں سے مراد کسی شے کے بارے میں جاننے، محسوس کرنے یا ارادہ کرنے کا عمل ہے۔یہ تمام عمل انسانی ذہن سرانجام دیتا ہے۔جسمانی سرگرمیوں کو اس میں عمل دخل حاصل نہیں۔نفسیات میں انسان کی جملہ سرگرمیوں اور اس کے کردار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔انسان کے ماحول، اس کے تقاضوں، ثقافت، جسمانی، معاشرتی، ذہنی و جذباتی نشوونما، نشوونما کے جملہ عوامل نیز انسانی شخصیت، اس کے عناصر اور انسانی زندگی کے دیگر شعبوں کا تجزیہ اور اس کی وجوہات پر غور کیا جاتا ہے اس کے علاوہ ان تمام محرکات و عناصر کا مطالعہ کیا جاتا ہے جن کے تحت کسی ماحول میں انسان اپنا کردار اور ذہنی سرگرمیاں انجام دیتا ہے۔

انسان زندگی میں مختلف مدارج اور منازل سے گزرتا ہے۔ان میں قبل از پیدائش اور بعد از پیدائش، طفولیت، بلوغت، پختگی اور بڑھاپے کی منازل شامل ہیں۔انسانی نشوونما سے مراد وہ جملہ تغیرات اور تبدیلیاں ہیں جو فرد میں زندگی کے آغاز سے اختتام تک جاری رہتی ہیں۔انسانی نشوونما کا تعلق اندرونی اعضاء کے افعال اور کارکردگی سے ہے۔اس میں وہ تمام تغیرات شامل ہیں جو کسی فرد میں جسمانی، ذہنی، معاشرتی اور جذباتی لحاظ سے رونما ہوتے ہیں۔نفسیات کی بدولت فرد کے کردار اور افعال میں عمر کے مدارج کے زیر اثر تبدیلیاں کا تجزیہ شامل مطالعہ رہتا ہے۔

نشوونما کے دیگر مدارج کے برعکس جذباتی نشوونما کا سراغ نفسیات ہی کا خاصا ہے۔جذبات انسانی زندگی میں نہایت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں کیوں کہ کردار، سیرت اور شخصیت کی تعمیر میں ان کا کلیدی مقام ہوتا ہے۔جذبات اچانک رونما ہو کر دیرپا اثرات کے حامل ہوتے ہیں جو فرد کی جملہ مصروفیات حیات کو متاثر کرتے ہیں۔جذبات خارجی اور داخلی پہلوؤں سے محسوس کیے جا سکتے ہیں جن کا تجزیہ کر کے نفسیات فرد کو ماحول اور حالات سے ہم آہنگ کرتی ہے۔نفسیات فرد کے داخلی اور خارجی محرکات کا سراغ لگاتی ہے۔محرکات عموماً ایک قوت یا رجحان ہوتا ہے جو فرد کو بیزاری اور بوریت سے دل چسپی کی طرف گامزن کرتا ہے۔محرکات فرد کو تحریک دینے کے علاوہ سرگرمیوں کی راہ متعین کرتے ہیں۔محرکات میں کردار، ضروریات، دل چسپیاں، آرزو، تمنائیں اور ترغیبات شامل ہیں۔فرد کی ضروریات زیست محرکات کو متاثر کرتی ہیں۔محرکات داخلی اور خارجی ہوتے ہیں جن میں چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔سماج کا طبقاتی نظام

خارج کی جبریت کو طاقت ور خارجی محرکات کی صورت میں فرد کی داخلی زندگی پر نافذ کرتا ہے۔نفسیاتی محرکات میں عزت نفس،احساس خوداری،احساس تحفظ اور عظمت کی خواہش وغیرہ شامل ہیں۔ یہ محرکات انسانی کردار میں خاصے اہم ہیں اور بعض حالات میں نفسیاتی محرکات حیاتیاتی محرکات سے زیادہ اہم ہوتے ہیں اور فرد پر زیادہ قوت اور شدت سے اثر انداز ہوتے ہیں۔زندگی کا احساس تحفظ ایک فطری اور حیاتیاتی محرک ہے۔ ہر فرد خطرے سے بچ کر زندہ رہنے کا خواہش مند ہوتا ہے لیکن کسی بیرونی حملے کے پیش نظر وطنیت کے جذبے کی بدولت جان کی قربانی کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔انسان کی ہر سرگرمی ایک محرک کی محتاج ہوتی ہے اسی لیے عموماً رجحان،نظریہ،خواہش،امنگ،مقصد،ضرورت اور دل چسپی جیسے عوامل کو محرکات کی صورت سمجھا جاتا ہے۔اس طرح فرد کے ظاہری افعال کے پس پردہ بہت سے نفسیاتی محرکات اپنا رنگ دکھا رہے ہوتے ہیں جن سے لاشعوری طور پر فرد متاثر ہو رہا ہوتا ہے۔

نفسیات بطور کرداری سائنس گروہی کردار کا مطالعہ کرتی ہے۔انسان چوں کہ فطری طور پر معاشرت پسند ہے اور وہ پیدائش سے موت تک سماجی زندگی بسر کرتا ہے لہذا فرد کی انفرادی زندگی اور شخصیت بیرونی ماحول کے تعامل سے تشکیل پاتی ہے۔جدید نفسیات میں چوں کہ فرد کے افعال و کردار کا مطالعہ ہی نہیں کیا جاتا بل کہ مقصد مطالعہ فرد اور سماج کا باہمی تعلق ہوتا ہے۔اس طرح نفسیات نہ صرف فرد کے افعال و کردار،نشوونما کے مدارج،داخلی و خارجی محرکات، جذبات، شعوری و لاشعوری کیفیات،فرد کی جذباتی گھٹن اور نفسیاتی محرکات کا سراغ لگاتی ہے بل کہ فرد اور ماحول کے باہمی تعلق اور خارجی جبریت کے نفسیاتی عوامل تک معاونت کرتی ہے۔نفسیات افراد کے مابین تصادم اور ٹکراؤ کی روک تھام کے مثبت قوانین اور بہتر تعمیری کردار کی راہ ہموار کرتی ہے۔

نفسیات اور سماج

فرد معاشرے میں دوسرے افراد سے مل جل کر معاشرتی اور تمدنی زندگی بسر کرتا ہے جہاں دوسروں کی عادات ،رسم و رواج اور تہذیب ثقافت اپناتا ہے۔معاشرتی نفسیات ان عوامل کا کھوج لگاتی ہے کہ فرد سماجی اور گروہی زندگی کن ضروریات کے زیر اثر بسر کرتا ہے اور رسم و رواج،عادات و اطوار،اعتقادات،فیشن و پروپیگنڈہ کے سماجی محرکات کس طرح فرد پر اثر انداز ہوتے ہیں۔نفسیات بطور سماجی سائنس معاشرے کے ثقافتی و معاشرتی مسائل کا مطالعہ کر کے فرد کو ان سے نبرد آزما ہونے کے قابل بناتی ہے۔نفسیاتی مسائل سے باخبر فرد سماجی مسائل و تعلقات معاشرہ سے بہتر ہم آہنگی اختیار کرتا ہے۔اگرچہ معاشرتی محرکات کا انسانی زندگی پر زیادہ انحصار نہیں ہوتا تاہم بہتر زندگی اور صحت مند سماجی مطابقت

کے لیے ان کو خاصی اہمیت دی جاتی ہے۔فرد کا کردار،صفات اور سماجی مطابقت کا انحصار معاشرے پر ہوتا ہے۔سماجی محرکات،کردار کی تعمیر وتشکیل اور معاشرتی ہم آہنگی کے ذریعے سماجی نفسیات فرد میں احساس ذمہ داری اور بہتر زندگی کی امنگ پیدا کرتی ہے۔نفسیات کا تعلق فرد کی ذاتی زندگی تک ہی محدود نہیں بل کہ معاشرتی،خاندانی اور گروہی زندگی کی جملہ مصروفیات پر حاوی ہے۔خارجی جبریت کے داخلی اثرات فرد میں احساس کمتری،فرار اور گریز جیسی نفسیاتی الجھنیں پیدا کرتے ہیں جن کی آگہی نفسیات ہی کی بدولت ممکن ہو کر خوش کن زندگی کا احساس پیدا کر کے بہتری کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔

نفسیات نے سماج میں اپنا اثر فرد کی انفرادی اور ذاتی زندگی سے بحال رکھتے ہوئے معاشرتی ترقی میں افرادی قوت اور فرد کی بہتر شمولیت کے پیش نظر طب کے مسائل کو بھی سلجھایا ہے۔طب کے شعبے سے وابستہ افراد نہ صرف مریضوں کو نفسیاتی اصولوں کے مطابق علاج کی سہولت فراہم کرتے ہیں بل کہ ذہنی و دماغی امراض کو بھی قابل علاج بناتے ہیں۔

کسی بھی ملک کی ترقی اور بہتری میں اس ملک کے پیداواری ذرائع زیادہ اہمیت کے حامل ہوتے ہیں کیوں کہ معاشی احوال نہ صرف اخلاقی قدروں کو بدل دیتے ہیں بل کہ سماجی ڈھانچے کی تبدیلی کا باعث بھی بنتے ہیں۔نفسیات نے فرد اور سماج کے باہمی تعلق کو بہتر بنانے کے لیے صنعتی اور پیداواری ذرائع میں زیادہ پیداوار اور افرادی قوت کی دل چسپی کا سامان مہیا کیا ہے۔نفسیات کی بدولت مزدور اور کارخانہ دار کے تعلقات میں جزوی بہتری،موزوں افراد کا انتخاب، سہولیات کی فراہمی اور مصنوعات کو پرکشش بنانے میں بہتری آئی ہے۔سماجی ضرورویات کی تکمیلیت کی خاطر فرد کڑے سماجی اصولوں کا پابند ہوتا ہے اور ان قوانین سے انحرف جرائم تصور کیے جاتے ہیں۔طبقاتی معاشروں میں ذاتی ملکیت کے تحفظ کے قوانین اگر چہ بنیادی انسانی مساوات سے متصادم ہوتے ہیں مگر بہتر سماجی مطابقت کی خاطر فرد کو ان اصولوں پر عمل کرنا پڑتا ہے۔اکثر معاشرتی مساوات سے عاری معاشروں میں تصادم اور ٹکراؤ کی فضاء پیدا ہوتی ہے۔

معاشرتی توازن کے لیے نفسیات جرائم کی تفتیش اور وجوہات معلوم کرنے میں آسانی پیدا کرتی ہے۔نفسیاتی طریقوں سے نہ صرف عادی مجرموں کا علاج کیا جاتا ہے بل کہ مختلف علوم وفنون سکھا کر ان کو مفید شہری بھی بنایا جاتا ہے نیز قوانین کی تیاری اور نفاذ میں نفسیاتی اصولوں سے معاونت لی جاتی ہے۔

انسانی تہذیب میں طبقاتی سماج کا آغاز دولت کی غیر مساوی تقسیم سے ہوتا ہے۔اس فرق کو قائم رکھنے کا خاطر اخلاقیات واقدار کا استعمال انسانی تاریخ میں ازل سے موجود رہا ہے۔اخلاقی جواز کے لیے زبردست طبقات انسانی

ذہنوں پر اخلاقی اور سیاسی قوانین کے بل بوتے پر اپنا استحصالی اثر ورسوخ قائم رکھتے ہیں۔ سماجی جبریت طاقت کی بدولت نچلے طبقات کو سمجھوتہ بازی پر مجبور کرتی ہے۔ انسانی فطرت میں بغاوت کے فطری عمل کو روکنے کے لیے طاقت کا استعمال غیر ضروری ہونے کے باوجود جاری وساری ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں:۔

> لیکن یہ بھی انسانی فطرت میں ہے کہ وہ ناانصافی اور استحصال کے خلاف بغاوت کرتا ہے اور جب وہ حالات کو بدلنے کی کوشش کرتا ہے تو ان کو قابو کرنے کے لیے دوسری صورت میں فوجی قوت وطاقت ہوتی ہے۔(۳۶)

طبقاتی استحصال کی نوعیت عالم گیر اثرات کی حامل ہے اور مزاحمت کو روکنے اور پیداواری وسائل پر قبضے کی ہوس اقوام وممالک میں جنگوں کی صورت اختیار کر لیتی ہے بقول سید علی عباس جلالپوری:۔

> شخصی املاک اور ریاست کے قیام کے ساتھ جنگ وجدال کی بنیاد پڑ گئی۔ طاقتور سرداروں نے کمزوروں پر تاخت وتاراج کا آغاز کیا۔ دوسروں کی املاک کو غصب کرنے کے لیے خون کی ندیاں بہائی گئیں اور بے گناہ شہریوں کو نہایت سفاکی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔(۳۷)

موجودہ عہد میں جنگ کا انداز بدل چکا ہے۔ اب لڑائی بجائے میدان جنگ کے نفسیاتی محاذ پر لڑی جاتی ہے۔ مخالف فوج اور عوام کے حوصلے نفسیاتی طور پر پست کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سماجی نفسیات فرد کو سماج سے ہم آہنگ کرنے کے لیے نہ صرف جنگ وجدال سے بعض رکھتی ہے بل کہ جنگ کے اصل محرکات منظر عام پر لانے میں مدد دیتی ہے۔ نفسیات فرد کو سماجی مطابقت کے علاوہ بالا دست طبقات کی چالیں اور منافقت بے نقاب کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ بدن بولی (Body Language) کی بدولت انسانی شخصیت کے پس پردہ محرکات ظاہر ہوتے ہیں۔ بدن بولی انسانی اعضاء چہرے کی حرکات وسکنات اور اشاروں کی منفرد اور دل چسپ زبان ہے۔ انسان کے اندر کا جہان اپنے اعضاء اور چہرے کے اتار چڑھاؤ سے اپنی چغلی خود کھاتا ہے کیوں کہ انسان اپنے اظہار کا صرف سات فی صد الفاظ سے ادا کرتا ہے اور ترانوے فی صد بدن بولی کی صورت میں ہوتا ہے۔ بقول رانا محبوب اختر:۔

> صرف چہرے سے سات لاکھ پچاس ہزار اشارے ہمارے اندر کی دنیا سے کرنوں کی طرح پھوٹتے ہیں۔ ماتھا، ہاتھ، پاؤں، بیٹھنے کا انداز، غمزہ، عشوہ و ادا کی پوری ایک زبان ہے۔ ۹۳ فی صد ابلاغ اور اظہار انہی اشاروں کنایوں سے ہوتا ہے اور لفظ کی دنیا

جہاں شکیسپیر، غالب، مارٹن لوتھر کنگ اور چرچل کی بادشاہت قائم ہے، انسانی اظہار کے صرف ۷ فی صد ابلاغ پر محیط ہے۔ اسی سائنس کا نام بدن بولی ہے۔ (۳۸)

اس طرح فرد اور سماج کا تعلق جہاں نفسیاتی اصولوں سے آگہی کی بدولت مستحکم ہوتا ہے وہاں نفسیات ہی فرد کو دوسرے افراد معاشرہ کے رویے اور رجحانات سمجھاتی ہے۔ معاشرتی نفسیات دیگر شعبہ حیات کی طرح تعلیم کو بہتر اور موثر بنانے کے لیے بھی معاون ثابت ہوتی ہے۔ تعلیم چوں کہ ایک معاشرتی عمل ہے اور تعلیم ہی کی بدولت سماج اپنی روایات و اقدار اگلی نسلوں تک منتقل کرتا ہے یوں بہتر تدریس اور رہنمائی کے لیے نصاب سازی، مقاصد تعلیم، جائزہ و رہنمائی، تدریسی اصول وقوانین کے تعین سمیت جملہ تعلیمی عمل نفسیاتی اصولوں کے مطابق زیادہ موثر کردار ادا کرتا ہے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر تمام مفکرین تعلیم افلاطون، غزالی، ابن خلدون، روسو، پستالوزی، فروبل اور تھارن ڈائیک نے معلم کے لیے تعلیمی نفسیات کے مطالعہ کو اہم قرار دیا ہے تا کہ انسانی تجربات و مشاہدات پر مبنی علوم، روایات، اقدار، اخلاقیات اور تہذیبی و ثقافتی ورثہ اگلی نسلوں تک بحفاظت منتقل ہو سکے۔

نفسیات فرد کو معاشرے میں ایک خوشحال اور پر آسائش زندگی کا راستہ دکھاتی ہے اور جذبات کی فوری تسکین کے برعکس بڑے مقاصد کے حصول کی راہ ہموار کرتی ہے۔ یہ بھی ایک حقیت ہے کہ انسانوں کے لیے فطرت پر قابو پانے کا عمل انسانی رشتوں میں توازن قائم کرنے سے آسان رہا ہے۔ انسانی ارتقاء سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسانوں کے معاشی مسائل نفسیاتی مسائل سے گہری وابستگی رکھتے ہیں تو اگر معاشی مسائل حل کرنے کی خاطر نفسیاتی اصولوں پر مبنی قوانین اور ضابطے وضع کیے جائیں تو افراد معاشرہ زیادہ متحرک اور تعمیری سوچ کے قابل بنتے ہیں۔ نفسیات اور سماج کے حوالے سے ڈاکٹر خالد سہیل لکھتے ہیں:۔

> انسانوں کے معاشی مسائل نفسیاتی مسائل سے جڑے ہوتے ہیں۔ اگر انسانوں کو بے لگام چھوڑ دیا جائے تو عین ممکن ہے کہ تہذیب و ثقافت کی روایت بری طرح مجروح ہو جائے، کیونکہ عوام کی اکثریت کامل اور سادہ لوح ہوتی ہے۔ وہ اپنے جذبات کی فوری تسکین چاہتی ہے اور بڑے مقاصد کے لیے چھوٹے مقاصد قربان نہیں کرنا چاہتی اس لیے ان پر اقلیت کو قوانین اور پابندیاں نافذ کرنا پڑتی ہیں۔ (۳۹)

ڈاکٹر خالد سہیل فرد اور سماج کے توازن میں دباؤ کے قائل ہیں وہ خوش گوار سماجی و معاشرتی زندگی میں پابندیوں اور دباؤ کو نفسیاتی حوالے سے جائز قرار دیتے ہیں:۔

TH-1775

پھر بھی رہنماؤں کو تھوڑا بہت دباؤ تو ڈالنا ہی پڑتا ہے کیونکہ عوام بنیادی طور پر نہ تو سخت کام اور نہ ہی اپنی خواہشات کی تسکین کو ملتوی کرنا چاہتے ہیں، وہ اپنے جذبات پر فوری عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔(۴۰)

اس طرح نفسیات فرد اور سماج میں بہتر تعامل اور ہم آہنگی میں کلیدی مقام رکھتی ہے۔

نفسیاتی مسائل کی بنیادیں

نفسیات کا تعلق انسان کی ذہنی اور داخلی زندگی سے ہے۔خارج کی جبریت انسان کی داخلی زندگی کو متاثر کرتی ہے جس کی وجہ سے نفسیاتی عوامل اور الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔انسان کی داخلی اور ذہنی زندگی خارج کا جو اثر قبول کرتی ہے اس سے انسان کے رویے اور رجحان بدل کر ایک نئی شخصیت کی تعمیر کرتے ہیں۔نفسیاتی مسائل کی بنیادیں تلاش کرنے میں سگمنڈ فرائڈ(Sigmund Freud) کا نام اساسی مقام رکھتا ہے۔فرائڈ نے تحلیل نفسی کے ذریعے ان لاشعوری محرکات کی نشان دہی کی جو فرد کی نفسیاتی الجھن کے پس پشت کارفرما ہوتے ہیں۔فرائڈ نے تحلیل نفسی کے ذریعے انسانی ذہن کا تجزیہ بالکل اسی طرح کیا جس طرح کوئی سائنس دان اپنی لیبارٹری میں کسی مادی شے کا تجزیہ کرتا ہے۔ہر داخلی کیفیت گویا اس کے لیے کوئی خارجی مظہر ہے جسے خوردبینی نگاہ سے دیکھا جا سکتا ہے۔عمیق مطالعے سے وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ جن قوانین فطرت کا اطلاق انسانی جسم یا اجرام فلکی پر ہوتا ہے، انہی کا اطلاق انسانی ذہن پر بھی ممکن ہے کیوں کہ وہ بھی ان ہی کی طرح چند قوانین فطرت کے تابع ہے۔

انسانی اعمال اور ان کے محرکات میں علّت و معلول کا ایک مضبوط تعلق قائم ہے۔انسان کے ہر فعل کی کوئی نہ کوئی داخلی توجیہ ہوتی ہے۔فرائڈ نے انسانی نفسیات کے حوالے سے جنس کو مثبت پہلو میں پیش کیا ہے اور اسے نفسیاتی مسائل میں ایک طاقت ور محرک قرار دیا ہے۔فرائڈ نے انسانی رویوں اور برتاؤ کا گہرائی سے مشاہدہ کیا اور حسد، رقابت، محبت، نفرت، خوف، دہشت، ندامت اور پشیمانی جیسے رویوں کے داخلی اور خارجی سراغ تلاش کرنے کی بھرپور سعی کی۔اس کا سب سے بڑا کارنامہ لاشعور کی دریافت ہے۔فرائڈ کے مطابق ہر انسان اپنی زیادہ تر زندگی لاشعور کے تحت بسر کرتا ہے۔ اس کے بیشتر افکار و اعمال کے محرکات لاشعوری ہوتے ہیں۔لاشعور اس کے نزدیک ایک ایسا برفانی تودا ہے جس کا ایک تہائی حصہ سطح آب پر اور دو تہائی سطح آب سے نیچے ہے:۔

گلیشیر کا وہ حصہ جو پانی کے اندر چھپا ہوا ہے اور کبھی ظاہر نہیں ہوتا، لاشعور ہے وہ حصہ جو کبھی ظاہر ہو جاتا ہے اور کبھی چھپ جاتا ہے، تحت الشعور اور وہ حصہ جو مستقلاً باہر رہتا ہے، شعور ہے۔(۴۱)

لاشعور کی دریافت کے بعد ان تمام انسانی افکار و اعمال جن کی بظاہر کوئی عقلی تشریح ممکن نہ تھی، تشریح پذیر ہو گے اور یہ واضح ہونے لگا کہ انسان کے ہر قول و فعل کا کوئی نہ کوئی لاشعوری سبب ہوتا ہے۔ فرائڈ نے انسانی ذہن کا تجزیہ کرتے ہوئے اسے تین عناصر کا مرکب قرار دیا۔ ان میں اڈ (ID)، ایگو (Ego) اور سپر ایگو (Super Ego) شامل ہیں۔ اڈ جبلّی اور نفسانی خواہشات پر مشتمل سراسر اندھی، عقل و منطق سے عاری، ماحول کے تقاضوں سے بے خبر قوت ہے جس کا مدّ عا و مقصد حصول لذّت ہے۔ فرائڈ چوں کہ نفسیاتی مسائل میں جنس کی اہمیت کا قائل تھا لہذا اس نے اڈ کو تمام جبلتوں کی قرار گاہ بتایا جو انسان کو عیش کوشی اور لذت پرستی کی ترغیب دیتی ہے۔ جنسی جبلّت ان میں سرفہرست ہے۔ اڈ کو خواہشات کی فوری تکمیل سے سروکار ہے جہاں حصول لذت میں رکاوٹ اور تاخیر بے چینی اور اضطراب کی مستقل کیفیت طاری کر سکتی ہے۔ اڈ کو معاشرے کی روایات و اقدار، اخلاقیات اور جائز و ناجائز کے قوانین سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا:۔

اڈ تمام نفسی و طبعی میلانات، جنسی و جبلّی رجحات اور حیاتیاتی توانائی کا منبع و مصدر ہے۔ اڈ کی سرکش قوتیں کسی اخلاقی ضابطے، مذہبی اصول یا سیاسی و سماجی قانون سے واقف نہیں۔ یہاں مکمل انتشار اور نراج کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ یہاں کی ہر خواہش اور جبلّت کا صرف ایک ہی مقصد ہے اور وہ ہے فوری تکمیل۔(۴۲)

اڈ کی ہلاکت خیزیوں سے بچاؤ کے لیے فطرت نے ذہنی انسانی کو دو باکمال قوتیں ایگو اور سپر ایگو کی بدولت حصول لذّت اور فوری تکمیل کے مابین عقلی و دانش مندانہ مفاہمتی فضاء کی راہ فراہم کی ہے۔ ایگو اڈ کی لامحدود خواہشات کو سماجی و معاشرتی حالات کے مطابق درمیانی راہ تلاش کرنے میں معاونت کرتی ہے۔ اسی بدولت فرد اور سماجی ماحول میں تصادم کے بجائے مفاہمتی فضاء تشکیل پاتی ہے۔ ایگو اڈ کے برعکس حصول لذت کے بجائے حصول حقیقت کا پرچار کرتی ہے۔ یہ خواہشات کی تکمیل میں حقائق کے پیش نظر سلامتی اور بقاء کے اصولوں پر عمل پیرا ہو کر اڈ کی معاونت کرتی ہے۔ فرائڈ کے مطابق ایگو مصائب حیات و زیست کے عقلی حل حقیقت پسندی سے تلاش کرتی ہے۔ اڈ پیدائشی جذبہ ہے جس پر حصول لذّت کی رکاوٹ ایگو لگاتی ہے۔ نفسیاتی مسائل کی بنیادوں میں ایگو بنیادی محرک ہے۔ اس کی کمزوری و طاقت دونوں حالتیں انتشار کا پیش خیمہ ہو سکتی ہیں۔ ایگو کی زیادہ سختی تصادم اور کم زوری یا نرمی حصول لذّت کی راہ فراہم کر

کے تباہی کی راہ آسان بناتی ہے، اس کا اعتدال نہ صرف ضروری ہے بل کہ پرسکون زندگی کی ضمانت بھی ہے:۔

> مختصر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایغو پیچیدہ نفسیاتی اعمال کا ایسا نظام ہے جو اڈ کی رستخیز قوتوں کو فکر و دانش کی لگام پہناتا ہے اور انہیں ماحول کے حقائق سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔(۴۳)

انسانی ذہن کا تیسرا ترکیبی جزو سپرا ایگو ہے۔ یہ لذّات نفس اور حقائق حیات کے برعکس آئیڈل کا متلاشی اور پرفیکشن کا متمنّی ہے۔ سپرا ایگو انسان کے اندر نظم وضبط نافذ کرنے والی ایک زبردست داخلی قوت ہے اور یہ معاشرے کے اجتماعی مفادات کی نگہبان اور تہذیب وشرافت کی ترجمان ہے۔ اڈ کا مزاج اور فطرت لذت کا حصول اور ماحول و معاشرے کو پس پشت ڈالنا ہوتا ہے مگر سپرا ایگو مذہب اور سماج کے قانون اور روایات کی پاسداری ہوتا ہے۔ ان دو متصادم قوتوں کی کشمکش فرد پر مختلف سمتوں سے اثر انداز ہوتی ہے۔ اڈ کی طاقت حصول لذّت کی قائل اور مایوسی و افسردگی کی بدولت نفسیاتی مسائل پیدا کرتی ہے۔ یہی اڈ کی قوت نفسانی خواہشات ذہن پر مسلط کر کے مجرمانہ افکار وخیالات کا باعث بنتی ہے۔

اڈ اور سپرا ایگو کی کش مکش میں اعتدال اور توازن کا بیڑا ایگو اٹھاتی ہے۔ ایگو دونوں کو اعتدال اور توازن کی راہ دکھانے کے لیے کبھی اڈ اور کبھی سپرا ایگو اور کبھی دونوں کی خواہشات کی تکمیل کا سامان مہیا کرتی ہے۔ اس کے لیے کبھی حسرتوں کو لاشعور میں اور کبھی تخریب کاری کو تعمیری اقدامات سے بدلتی ہے۔ اڈ، ایگو اور سپرا ایگو کے مابین فرق کے بارے میں ڈاکٹر نعیم احمد لکھتے ہیں:۔

> اڈ ایغو اور سپر ایغو کے مابین کوئی واضح خط امتیاز نہیں کھینچا جا سکتا۔ ان کے علیحدہ علیحدہ وظائف ہیں اور مختلف ناموں سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ تین اکائیاں ہیں۔ اڈ، ایغو اور سپر ایغو تین اعمال اور وظائف ہیں جو ایک ہی شعوری و نفسی وحدت کے اندر جاری وساری ہیں۔ ایغو اڈ سے ابھرتا ہے اور سپر ایغو، ایغو سے جنم لیتا ہے، ان تینوں کا تفاعل ساری عمر شخصیت کے اندر جاری رہتا ہے۔ شخصیت کی ٹوٹ پھوٹ اور اس کی متوازن تعمیر انہی تینوں اعمال کی ہم آہنگی پر مبنی ہے۔(۴۴)

نفسیاتی مسائل کی بنیادوں کے ضمن میں فرائڈ نے عہد طفولیت اور جنسی زندگی کو خاصی اہمیت دی ہے۔ بچپن کے واقعات اور کمسنی کے تجربات انسانی سیرت وکردار پر گہرے، ان مٹ اور متاثر کن اثرات مرتب کرتے ہیں۔ ابتدائی عمر

کے پانچ چھ برس کردار کی نشوونما، عادات واطوار کی تشکیل، شعور ولاشعور کی تخلیق اور جذبات واحساسات کی تربیت میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ انسان میں پسند وناپسند، محبت ونفرت اور خدشات ورجحانات کی مستقل اور دائمی عمارت کی بنیادیں یہی عہد طفولیت ہے۔ فرائڈ نے انسانی جبلتوں نیند، بھوک، پیاس، آرام، خواہش تحفظ وعافیت، جذبہ انتقام، حب ملکیت اور احساس سبقت وبرتری میں جنسی زندگی کو خاص اہمیت دی ہے۔ اس کے مطابق جنس سب انسانی اعمال پر حاوی ہے۔ انسان کی ہر خواہش اور سوچ اسی کے گرد محوسفر ہے۔ فرائڈ کے ہاں انسان کا ہر فعل جس سے ایک گونہ قلبی، ذہنی آسودگی یا لذت حاصل ہوتی ہے وہ جنسی مفہوم کی حامل ہے۔ فرائڈ کا تصور جنسی زندگی جسمانی لذّت سے بالاتر اور قلبی آسودگی کا باعث ہے۔

فرائڈ نے جنسی زندگی کی بناء پر ایڈی پس کمپلیکس (Oedipus Complex) اور کاسٹریشن کمپلیکس (Castration Complex) کی وضاحت کی کہ کس طرح ایک فرد جنسی زندگی میں حصول رکاوٹ کے باعث ان نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہوتا ہے۔ اس کے مطابق تین سے چھ برس کا ہر لڑکا اور لڑکی ایڈی پس الجھاؤ کا شکار ہوتے ہیں۔ لڑکا کسی گہرے لاشعوری جذبے کے تحت ماں کی طرف ایک انجان سی کشش محسوس کرتا ہے اور اپنے معصومانہ خوابوں اور خیالوں میں باپ کو راستے کی رکاٹ سمجھ کر راستے سے ہٹانے کی تصوراتی خواہش رکھتا ہے۔ اسی طرح ماں کے برعکس بیٹی والد کی طرف زیادہ کشش رکھتی ہے اور اپنے جیون ساتھی میں والد کے اوصاف تلاش کرنے کی لاشعوری گرفت کا شکار رہتی ہے۔ فرائڈ کے مطابق یہ کش مکش فراموشی کے باوجود لاشعور کی گہری تہوں میں موجود اور خلفشار کا مستقل باعث بنتی رہتی ہے۔

اسی طرح فرائڈ نے جنسی اعضاء میں فرق کی بدولت کاسٹریشن الجھاؤ کو بھی ایک گہرا نفسیاتی محرک قرار دیا ہے۔ سماج میں عورت کے اندر معاشرتی رویوں کے خلاف پائی جانے والی احساس کمتری اور فرار کی عمیق تہوں میں یہی الجھن مصروف عمل رہتی ہے۔ فرائڈ کو ان نظریات پر سخت تنقید کا سامنا کرنا پڑا اور معاصر نفسیات دانوں نے اسی مخالفت پر اپنے نظریات کی بنیاد رکھی البتہ اس نے تحلیل نفسی کے ذریعے شعور اور لاشعور کے تعلق، اڈ، ایگو اور سپر ایگو کے تعلق، ایڈی پس اور کاسٹریشن الجھاؤ جیسے نفسیاتی محرکات اور عہد طفولیت کی اہمیت کا ادراک مہیا کیا۔

کارل ژنگ (Carl Jung) نے لاشعور کے بجائے اجتماعی لاشعور (Collective Unconscious) کا نظریہ پیش کیا۔ اس کے مطابق کسی انسان کے لاشعور میں پیدائش سے قبل نسلی مواد موجود ہوتا ہے۔ فرد کی نسل پر ارتقائی مراحل کے دوران جو اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ اس کے لاشعور میں موجود ہوتے ہیں۔ ان اثرات میں اسلاف کے تجربات، خاندانی وراثت اور زندگی کے دھندلے نقوش لاشعور کا حصہ بن کر اجتماعی لاشعور کی تشکیل کرتے ہیں۔ ژنگ فرد

کے نفسیاتی تجزیے کے دوران نسلی ورثہ کی اہمیت کا قائل ہے۔ فرائڈ کے جنسی نظریے کے برعکس ژنگ جنسی توانائی کو طلب حیات کا دوسرا نام قرار دیتا ہے۔ ہر فعل اپنی جگہ خود اختیار ہونے کے باعث جنسی نوعیت کا نہیں ہوتا۔ نفسی توانائی دو مخالف سمتوں میں سفر کرتی ہے۔ اگر فرد ماضی سے تعلق رکھنا چاہتا ہے تو مستقبل کے بلند عزائم بھی اس کا مقصد ہوتے ہیں۔ ژنگ نے شخصیتوں کی اقسام کو پیدائشی طور پر دروں اور بیروں بیں میں تقسیم کیا ہے۔ دروں بیں اپنی ذات کے اسیر اور ذاتی خیالات واحساسات میں کھوئے رہتے ہیں۔ ان کو خارجی حقائق سے سروکار نہیں ہوتا مگر بیروں بیں خارجیت پسند اور حقائق کے متلاشی ہوتے ہیں۔ اکثر اوقات دونوں مخالف رویے ایک دوسرے میں گہری دل چسپی رکھتے ہیں مگر مستقل ملاپ اور دیرپا وابستگی تصادم کا باعث بنتی ہے۔

ژنگ مذہبی تجربے اور روحانی واردات کا قائل تھا۔ اس کے مطابق ذہنی صحت کے لیے روحانی وارداتوں سے لاشعور کو جلا بخشنا ضروری ہے۔ مذہب سے انکاری انسان کو گہرے خوف اور خدشات میں مبتلا کر دیتی ہے جس سے ذہن انسانی الجھنوں میں گھر جاتا ہے۔ ژنگ کے اجتماعی لاشعور کی وضاحت ڈاکٹر سلیم اختر یوں کرتے ہیں:۔

> اجتماعی لاشعور سے ہماری مراد وہ خاص طرح کا نفسی مزاج ہے جس کی تشکیل میں نسلی وراثت کی قوتوں کی کارفرمائی شامل ہوتی ہے۔ جس سے شعور نے نشوونما پائی ہے۔ جس طرح جسم کی تخلیقی ساخت ارتقاء کے ابتدائی مدارج کے سراغ ملتے ہیں اسی طرح انسانی سائیکی بھی اپنی تشکیل میں ان اثرات سے تہی دامان نہیں سمجھی جا سکتی۔ (۴۵)

نفسیاتی الجھنوں میں ژنگ خوابوں اور علامتوں کو اہمیت دیتا ہے۔ فرائڈ کی طرف سے خوابوں کو ناآسودہ جنسی خواہشات قرار دینے کے برعکس ژنگ فطرت کا اظہار قرار دیتا ہے۔ خواب کا مقصد لاشعور کی گمراہی کے بجائے خاص مقاصد کے اشارے ہوتا ہے۔ نفسیاتی مسائل کا آغاز علامتوں کی عدم واقفیت سے ہوتا ہے۔ ژنگ نے علامتوں کے ضمن میں اساطیر، قدیم مذہبی کتب اور وحشی اقوام کی کیمیا گری سے استفادہ کیا۔ بقول ڈاکٹر سلیم اختر:۔

> "جہاں تک علامتوں کا تعلق ہے تو یہ زندہ شے ہے۔ یہ اس شے کا اظہار ہے جس کے ابلاغ کے لیے اس سے بہتر اور موزوں طریقہ اپنانا ممکن نہ تھا۔ علامت کی زندگی آمیزی اس کے بطون میں پوشیدہ معانی سے عبارت ہے۔ (۴۶)

فرائڈ کے برعکس ژنگ کے نظریات اور تصورات مشرقی روایات واقدار سے قربت رکھتے ہیں۔ اس نے نفسیاتی مسائل کی بنیادیں تلاش کرنے میں انسانی معاشروں کی تشکیل، انسانی نسلوں کا ارتقاء، تاریخ اور مذاہب سے رہنمائی

حاصل کی۔اس کا تصور جنسی زندگی تک محدود نہ رہا بل کہ اجتماعی لاشعور،خواب اور علامتوں سے گزرتا ہوا مابعد الطبعیات تک جا پہنچا۔اس کے اکثر نظریات مذہبی اور ان کی بنیادیں وجدان ونظر اور باطنی مشاہدے پر استوار ہیں۔ژنگ نے لاشعور کے بارے میں ایک دل چسپ وضاحت کی کہ ہر مرد کے لاشعور میں ایک تصور زن اور ہر عورت کے لاشعور میں تصور مرد ہوتا ہے۔جس سے نہ صرف وہ جنس مخالف میں وہی صفات تلاش کرتا ہے بل کہ ہر جنس میں مخالف جنس کی صفات موجود ہوتی ہیں۔مرد اپنی نسوانی صفات کی بدولت قوی اور طاقت ور ہونے کے باوجود نرمی وملائمت کے جذبات رکھتا ہے جو زندگی کے تلخ اور دل نشین مواقعوں پر اکثر چھلک پڑتے ہیں۔سماج کے ضرورت مند طبقات کی مدد اور ہم دردی انہی نسوانی جذبات کی بدولت ظاہر ہوتی ہے۔عورت مردانہ جذبات کے زیر اثر کبھی کبھی نسوانی تقاضوں کے بجائے تشدد،ظلم کے خلاف شدید ردعمل اور قتل وغارت کی سطح تک اتر آتی ہے۔ژنگ کے نزدیک جنس مخالف کے جذبات کی شدت مرد اور عورت دونوں میں شخصیت کا بگاڑ پیدا کر سکتی ہے جن کا اثر نفسیاتی کش مکش اور ٹکراؤ پر منتج ہوتا ہے،یوں اعتدال ہی جذباتی ونفسیاتی مسائل سے چھٹکارے کا ضامن ہے۔

نفسیاتی الجھنوں اور فرد ونفسیات کے باہمی تعلق کے ضمن میں الفرڈ ایڈلر(Alfred Adler) کی انفرادی نفسیات کا نظریہ بھی توجہ طلب ہے۔اس کے ہاں نفسیاتی مسائل میں جنس کے علاوہ حصول قوت واقتدار،شہرت کی خواہش،تکمیل ذات اور جذبہ سبقت وبرتری بھی اساسی مقام رکھتے ہیں۔ایڈلر کے مطابق جنس بلاشبہ ایک طاقت ور نفسیاتی محرک ہے لیکن اس کی قوت اور ہمہ گیریت اس قدر نہیں جس قدر فرائڈ نے پیش کی۔ایڈلر نے انفرادی نفسیات کے حوالے سے فرد کی ذات اور انفرادیت کو زیادہ اہمیت دی ہے۔وہ فرد کے نفسیاتی تجزیے کے لیے کلی شخصیتی وضاحت کا قائل تھا۔اس کے نزدیک انسانی اعمال وکردار کا سب سے بڑا مقصد احساس کمتری(Inferiority Complex) کو مٹانا ہے۔یوں ہر طرح کے اعصابی خلل کو احساس برتری(Superiority Complex) کے ذریعے اپنے احساس کمتری کے چھٹکارے کا انداز سمجھا جا سکتا ہے۔ایڈلر نے اس بات کو بیان کیا ہے کہ ہر انسان عمر بھر احساس کمتری کی تلافی میں لگا رہتا ہے جو کسی عضوی کمزوری یا خرابی کی بنا پر اسے لاحق رہتی ہے اور یہی تلافی درحقیقت انسانی جدوجہد کا محرک ہے۔ایڈلر کا خیال تھا کہ انسان لاشعوری طور پر عمر بھر اپنے وقار اور عزت میں اضافے کے لیے سرگرم رہتا ہے۔ایڈلر نے احساس کمتری میں عضوی کمزوری کو بنیادی مقام دیا ہے لیکن اس نے عام انسانوں میں بھی احساس کمتری کی بدولت نفسیاتی مسائل کی بنیاد عضوی کمزوری کے علاوہ بھی احساس کم تری کو احساس برتری میں بدلنے کی کوشش قرار دیا۔ڈاکٹر سلیم اختر نے اس بات کو یوں بیان کیا:۔

ہر طرح کے اعصابی الجھاؤ کو احساس برتری کی بدولت ذاتی احساس کمتری سے نجات کا انداز ہی تصور کرنا چاہے۔ ایڈلر کی انفرادی نفسیات کی اساس عضوی خامیوں سے جنم لینے والی احساس کمتری پر استوار ہے۔ (۴۷)

ایڈلر کی فکر میں منتہاے مقصود کے تعین میں اسلوب حیات بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کا خیال تھا کہ فرد جبلتوں کا اس قدر اسیر نہیں جس قدر اس کا منتہائے مقصود اس کی زندگی میں ایک قوی محرک کا درجہ رکھتا ہے۔ منتہائے مقصود کے تعین میں اسلوب حیات بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ منتہائے مقصود میں تعلیم و تربیت کی بدولت فرد زندگی کے مشکل اور کٹھن مراحل طے کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے فرد زندگی کی جبریت میں پسپائی اور گریز کا رویہ اختیار کرنے کے بجائے اپنی صلاحیتوں اور عقل و دانش کا استعمال کر کے زندگی کے مسائل پر قابو پاتا ہے۔ اس کے برعکس بعض افراد زندگی کے مشکل مراحل میں گریز اور پسپائی کے رجحانات میں مبتلا ہو کر حقیقت سے فرار کی راہ تلاش کرتے ہیں جو ان کی زندگی کے جملہ پہلوؤں پر اثر انداز ہوتی ہے۔

ایڈلر نے جنسی انحرافات اور جرائم پسندی کو گریز کی متنوع صورتیں قرار دیا ہے۔ ان نفسی امراض اور مسائل کے شکار افراد زندگی کی حقیقتوں کا سامنا کرنے کے بجائے فرار کی راہ تلاش کرتے ہیں۔ منتہائے مقصود اور اسلوب حیات میں ابتدائی تعلیم اور فرد کے خاندانی رشتے اور گھریلو ماحول ایسے محرکات ہیں جو فرد کی شخصیت کی تکمیل اور تشکیل کرتے ہیں لہذا ابتدائی چند سالوں کی تربیت فرد کے کردار میں خاصے اہم ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر غلام حسین لکھتے ہیں:۔

ان ابتدائی چند سالوں میں جو عناصر خاص طور پر شخصیت پر اثر انداز ہوتے ہیں ان میں ترتیب پیدائش، والدین کی سخت گیری اور شفقت و محبت سرفہرست ہیں۔ پہلا بچہ، منجھلا بچہ سب سے چھوٹا بچہ اپنی عمر کے اعتبار سے جداگانہ اسلوب حیات اختیار کرتے ہیں۔ (۴۸)

ایڈلر نے نفسیاتی مسائل کو ایک فرد کے بجائے سماجی مطالعے کا ذریعہ بنایا اور سماج کے صاحب اقتدار افراد کا تجزیہ کیا جن کی انسانی ہمدردیاں ذاتی اور انفرادی مقاصد کے گرد گھومتی ہے۔ ایڈلر کے ان خیالات کی روشنی میں ہمارے سماج کا مطالعہ بڑا فکر انگیز ہو سکتا ہے جس میں مقتدر طبقہ ہمدردی، ایثار اور غم گساری کے جذبات سے نا آشنا ہوتا ہے اور وہ دوسروں سے اپنی ذات تک دل چسپی اور عقیدت رکھتا ہے۔

سماج اور فرد کے باہمی تعلق کو کیون ہارنی اور ایرخ فروم نے ایڈلر اور معاصرین سے ایک قدم آگے جا کر دیکھا ہے۔ ایڈلر کی زیادہ توجہ عضوی کمزوریوں کے گرد گھومتی رہی اور شخصیت کی تعمیر و تشکیل کے دیگر متنوع عوامل کو زیادہ دل چسپی

سے قابل مطالعہ نہ سمجھا گیا۔ کیون ہارنی اور ایرخ فروم نے داخلی عوامل کو متاثر کرنے والے خارجی عوامل کا جائزہ لیا جو فرد کی شخصیت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ایرخ فروم کے حوالے سے ڈاکٹر غلام حسین لکھتے ہیں:۔

"انسان کاغذ کا ایک صاف ان لکھا ورق نہیں جس پر سماج اپنی عبارت لکھ سکے بل کہ وہ ایک اساسی اکائی ہے جس کو چند مخصوص قوتیں ودیعت کی گی ہیں اور ایک سانچے میں ڈھالا گیا ہے جو سماج سے مطابقت پیدا کرتا ہے اور ردعمل کا اظہار بھی کرتا ہے۔(۴۹)

کیون ہارنی نے بھی انسان پر خارجی اثرات کے باوجود انفرادی شخصیت کو خاص اہمیت دی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ انسان کے اندر اپنی صلاحتیوں کو استعمال اور عمل میں لا کر مسائل کو حل کرنے کی خواہش اور اہلیت ضرور موجود ہے۔ ایرخ فروم اور کیون ہارنی نے انسانی تہذیب کی مجموعی نفسیات کا انسانی تہذیب کے ارتقائی مراحل کے تناظر میں مطالعہ کیا۔ انسانی معاشرتی ارتقاء میں بے بسی، بے چارگی اور احساس تنہائی کو بنیادی مسئلہ قرار دیا۔ اسی بے چارگی اور بے بسی کے نفسیاتی اثرات کے زیر اثر انسانی معاشرہ ماورائی ہستیوں کی عقیدت کا شکار ہوتا ہے۔ ایرخ فروم نے قدیم سے جدید عہد تک کے انسانی سفر میں آزادی کے تصور کو جذباتی مسئلہ قرار دیا ہے اس کے نزدیک ایک طرف انسان آزاد زندگی کا خواہش مند ہے تو دوسرے ہی لمحے آزادی سے گریزاں نظر آتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر غلام حسین لکھتے ہیں:۔

شعوری سطح پر وہ جمہوریت اور آزادی کا خواہش مند ہے لیکن یہ آزادی احساس تنہائی کو بھی جنم دیتی ہے چنانچہ اس تنہائی سے بچنے کی خاطر وہ امریت کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اس باعث فاشزم، نازی ازم کی تحریک کو فروغ حاصل ہوا اور آج کیمونزم کی طرف بھی ایک نمایاں رجحان موجود ہے۔(۵۰)

ایرخ فروم نے اس موضوع کو مزید وسعت دی اور انیسویں صدی کے سرمایہ درانہ نظام کے انسانی شخصیت پر مرتب ہونے والے نمایاں اثرات بے نقاب کیے، اس کے نزدیک سرمایہ دارانہ نظام میں تشدد کا غالب رجحان موجود ہے۔ اس تشدد کی وجہ سے بنیادی انسانی اقدار زوال کا شکار ہوئیں اور نہ صرف فرد کی شخصیت میں شکست وریخت ہوئی بل کہ انسانی ہوس نے بھی اپنے پنجے مضبوط کیے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر غلام حسین لکھتے ہیں:۔

انیسویں اور بیسویں صدی میں انسان کی داخلی اور خارجی ذات کے آشوب کی اہم دستاویز ہے Man for Himself, میں موضوع اخلاقی اقدار جو انسان کی سب سے عظیم متاع ہے، کے بحران اور شکست وریخت کا جگر خراش المیہ ہے۔ اخلاقی انحطاط اور بحران کو ایرخ فروم نے ایک ماہر نفسیات کی زبان میں پیش کیا ہے(۵۱)

ایرخ فروم شخصیت کی صحت مند تعمیر و تشکیل کے لیے سماج کو آزادی اور مساوات کے بنیادی اصول پر مرتب کرنے کا خواہش مند ہے۔ اس کے نزدیک انسان عمر بھر خود کو سماج سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور اس کی اس ہم آہنگی کے راستے کی خارجی رکاوٹیں اس کے اندر نفسیاتی مسائل کا سبب بنتی ہیں۔ سماجی ہم آہنگی کی خواہش ہی انسان میں نرگسیت کا بیج بوتی ہے۔ اس صورت حال میں فرد ایک طرف تو اپنی انفرادیت قائم رکھنے کا خواہاں ہے تو دوسری طرف جماعت میں مدغم ہونے پر مجبور ہے۔

کیون ہارنی نے عصر حاضر کے انسان میں اضطراب اور بے چینی کی وجوہات مال وزر کو قرار دیا ہے جس کے باعث نفسانفسی اور خودغرضی کی فضاء نے بنیادی انسانی اوصاف کو ختم کر کے ہزاروں الجھنوں کو جنم دیا ہے۔ اس تناظر میں موجودہ عہد کے انسان کے نفسیاتی مسائل کی جڑیں فرائڈ، ژنگ اور ایڈلر کے بجائے کیون ہارنی اور ایرخ فروم کے نفسیاتی عوامل و محرکات اور طبقاتی سماج کی گہرائیوں میں بہتر طور پر تلاش کیے جا سکتے ہیں۔

ترقی پسند تحریک اور طبقات

ترقی پسند خیالات برصغیر پاک و ہند میں جنگ عظیم اوّل کے بعد ہی سماج کی نچلی سطح پر نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے مگر ایک باقاعدہ اور منظم تحریک کی صورت ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ ظاہر ہونا شروع ہوئی۔ ترقی پسند تحریک کی بدولت ادب میں نئے رجحانات اور تصورات ایک شعوری احساس کی صورت میں نمایاں ہوئے جس کا اثر ادیبوں نے انقلابی تصورات اور خیالات کی صورت میں قبول کیا۔ اس تحریک نے ادب اور سماج کے تعلق کو نئی سمت مہیا کی اور ادب سے سماج کو بدلنے کی کوششوں کا آغاز ہوا۔ ترقی پسند تحریک کا مقصد ادب کے ذریعے ہندوستان میں زندگی کے بنیادی مسائل کا حل تلاش کرنے کے ساتھ ساتھ ان مسائل کا حقیقت پسندی سے اظہار کرنا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ بھوک، افلاس اور سماجی پستی کی بدولت ہندوستانی سماج میں زندگی کی بے چینی و جبریت کا اظہار کرنا اور ان مسائل کو بطور موضوع شاعری و فکشن کی مدد سے اجاگر کرنا اس تحریک کا خاصا تھا۔ اس تحریک کا خواب ہندوستان میں انصاف اور برابری کے اصولوں پر قائم ہونے والا سماج تھا۔ اس ضمن میں سید جاوید اختر لکھتے ہیں "اس تحریک نے طبقاتی شعور کو بیدار کیا اور ایک غیر طبقاتی انسانی سماج کا خواب دیکھا جہاں سماج کی تشکیل برابری کے بنیادی اصولوں پر کرنا مقصود تھا" (۵۲)

طبقاتی سماج کے خاتمے اور برابری کے اصولوں پر سماجی تشکیل کے خواب کی بدولت ترقی پسند تحریک پر مارکسی نظریات کا غلبہ رہا اور اشتراکیت کے اصولوں کا پرچار کیا گیا۔ اس تحریک نے ادب کے فرسودہ تصورات میں تبدیلی کے

رجحانات متعارف کروائے اور ادب برائے ادب کی مخالفت میں ادب برائے زندگی کا تصور پیش کیا۔ اس تحریک کی بدولت ایک نئی حقیقت پسندی کی بنیاد پڑی۔ ایسی حقیقت پسندی جو سماجی اور انفرادی حقیقتوں کو گہری نظر سے جانچے اور ادیب کے ذاتی محسوسات اور انسانی زندگی کے خمیر کو اپس میں اس طرح ملائے کہ ادبی کارنامے خلوص کے ساتھ تنقید حیات سے بھی مزین ہوں۔ ایسی تنقید حیات جو انسان کی داخلی صلاحیتوں کو ابھارنے کے علاوہ ادب اور سماج کے تعلق کو عام کرنے میں مددگار ثابت ہو۔

ترقی پسند ادیب اس خیال سے متفق تھے کہ تہذیبی ترقی کے لیے معاشی اور اقتصادی اقدار میں ہمواری کا عنصر کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔ اس طرح ادب کو اقتصادیات سے وابستہ کرنے کی شعوری کوشش کی گئی۔ ترقی پسند ادیب ادب کو طبقاتی کش مکش، دولت کی مساوی تقسیم، ذرائع پیداوار پر یکساں قبضے اور برابری کے اظہار و ابلاغ کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ ادب چوں کہ معاشرے کا ترجمان و عکاس ہوتا ہے، اس لیے ترقی پسند ادیبوں نے ترقی پسند تحریک کے زیر اثر جہاں بھوک، غربت، استحصال اور جبریت کی نفسیات اور ان کے فرد اور طبقے پر نفسیاتی اثرات اور نفسیاتی الجھنوں کو اپنے ادب کا موضوع بنایا وہاں جنس کے موضوع کو بطور خاص استعمال کیا اور جنسی گھٹن کی بدولت نفسیاتی الجھنوں کا سراغ لگایا۔ ترقی پسند ادیبوں نے جنسی الجھنوں کے نفسیاتی اثرات کھوجنے کے لیے سگمنڈ فرائڈ کے جنسی نظریات کو مشعل راہ بنایا جس سے لاشعور کی گرفت، تحلیل نفسی، جنسی انحرافات، ابتدائی عمر اور ایڈی پس و کاسٹریشن الجھاؤ کی بنیاد پر جنسی گھٹن کے نفسیاتی اثرات نمایاں ہوئے۔ ترقی پسند تحریک کے نمایاں موضوعات میں طبقاتی جبریت کی چکی میں پستے نچلے کرداروں کا استحصال اور اندرونی شکست و ریخت کو مرکزیت بخشی گئی۔ ترقی پسند تحریک کے زمانہ عروج میں طوائف اور محنت کش طبقہ جنس و معاش کے امتزاج اور قانون و سماج کی جبریت کے نفسیاتی اثرات کا استعارہ بن کر نمودار ہوا۔

ترقی پسند تحریک کے ہیرو اعلیٰ طبقات کے بجائے محنت کش اور معمولی ملازمت پیشہ افراد ہوتے تھے جو ظلم و ناانصافی کے سماج کو برابری اور آزادی کے بنیادی اصولوں کے تحت بدلنے کی خواہش رکھتے تھے۔ ترقی پسند ادیب زندگی کے مسائل سے گہری واقفیت، انسان دوستی کے قائل اور معاشرے کی حقیقی تبدیلی کے خواہاں تھے۔ اس تحریک کے غالب رجحانات میں داخلی اور خارجی حقیقت نگاری نمایاں مقام رکھتی ہے۔ اس تحریک کے زیر اثر تخلیق ہونے والے ادب میں نچلے اور متوسط طبقے کی محرومیوں، مجبوریوں، انسانی رشتوں کی نزاکتوں اور لطافتوں کا فنکارانہ اظہار ملتا ہے اس کے ساتھ ساتھ ان طبقات کی کمزوریوں، جذبات کی گھٹن، ناکامی اور حسرتیں خوب صورت پیرائے میں ابھرتی ہیں۔ ترقی پسند ادب کے بارے میں سید وقار عظیم لکھتے ہیں:۔

> اس نئے دور کا افسانہ موضوع اور تنوع کے اعتبار سے اسلوب کے نئے پن کے لحاظ سے اور فکر و تخیل اور احساس کی گونا گونی کے نقطہ نظر سے پچھلے دور کے افسانوں سے بہت مختلف نظر آتا ہے۔ اس میں جدت اور روایت کا بڑا ثیریں اور لطیف امتزاج ہے۔ اس میں ایک خاص عہد کی سیاسی زندگی کے پیدا کیے ہوئے معاشی نتائج کی بڑی واضح اور مکمل تصویریں ہیں اور خارجی حقائق کی تصویروں کے ساتھ ساتھ انسان کے جذبات، احساسات، افکار اور نفسیاتی ردعمل کا صحیح عکس بھی۔(۵۳)

ترقی پسند تحریک کے زیر اثر حقیقت نگاری کے رجحانات کی بدولت سماج کی سچی تصویر کشی کی گئی اور طبقات کی تخلیق میں موثر کردار ادا کرنے والے جملہ عوامل کو موضوع بحث بنایا گیا۔ ہندوستانی معاشرے کی عریاں حقیقت نگاری نے نچلے اور متوسط طبقات پر اثر انداز ہونے والے معاشرتی، اخلاقی اور معاشی عوامل کو نہ صرف کرداروں سے بام عروج بخشا بل کہ داخلی و خارجی جبریت کے نفسیاتی اثرات کو شاعری، ناول اور افسانے میں نمایاں کرنے کی بھرپور شعوری کوشش کی گئی۔

اردو ادب اور طبقاتی نفسیات

اردو کے افسانوی ادب میں کرداروں سے طبقات کی نہ صرف نمائندگی کی گئی بل کہ ان طبقات پر خارجی جبریت کے زیر اثر نفسیاتی الجھنوں کو بھی موثر انداز سے بیان کیا گیا۔ کرداروں کی طبقاتی نفسیات کا شعور زیادہ تر فکشن میں ترقی پسند تحریک کے ساتھ مارکس اور فرائڈ کے نظریات کی بدولت زیادہ شدومد سے ہوا۔ یوں تو طبقات کا عکس داستانوں میں بھی موجود تھا۔ داستانوں میں اس عہد کی معاشرتی اور سماجی زندگی کے عکس کے متوازی اعلی طبقات کی پر آسائش زندگی کا اظہار ضرور ملتا ہے۔ داستانوں کی دنیا زیادہ تر تخیل پر مبنی تھی۔ اس تخیل کی تہہ میں انسان کی آرزوؤں، تمناؤں، نا کردہ گناہوں اور تشنہ تکمیل حسرتوں کا ہاتھ نظر آتا ہے۔ ماضی کے انسان نے مختلف تخیلی صورتوں میں اپنی خواہشات کی تجسیم کی جس کا اظہار داستانوں کے کرداروں کی صورت میں ظاہر ہوا۔ ان داستانوں میں انسان کے اندر کامیابی و کامرانی کی شدید خواہش موجود ہے اور تخیل کی بنیاد پر کائنات کو اپنے قابو میں لانے کی کوشش موجود ہے جو انسان کے اندر حقیقت سے فرار کی لاشعوری گرفت کا اظہار ہے۔

داستانوں کے کرداروں میں اعلی طبقے کا نمائندہ کردار بادشاہ اور اس کا خاندان ہوتا تھا۔ بادشاہ کے طلسماتی محلات، باغات، ناز و نعم میں پروردہ شہزادے اور شہزادیاں، ان کا حسن و عشق، جادوئی اوزار، زیورات اور رنگا رنگ مجالس

اس عہد کی شاہی زندگی سے متعلق ہیں۔ بادشاہ، اس کے محل کی دل کش وخوش نما زندگی، خوش حالی اور فارغ البالی سے متعلقہ قصّے کہانیاں زندگی کی آسائشوں سے عاری نچلے طبقے کی شاہی زندگی سے متعلق تخیل آرائی کے شاہکار ہیں جوان کرداروں میں لاشعوری طور پر اپنی ناآسودہ خواہشات کی تکمیل کرتے ہیں۔ داستانوں کے مرکزی کرداروں کے علاوہ بادشاہ سے لے کر عام فرد اور بے جان اشیاء کے کرداروں کا مثالی پن دراصل داستان گو کی تشنہ خواہشات کی تخیلاتی تکمیل کا اظہار ہے۔ ان ادھوری آرزوؤں کی تکمیل میں حصول دولت کی خواہش کے لیے ہر ممکن اقدام سماجی غربت اور پستی زندگی کے نفسیاتی اثرات ہیں۔ داستانوں کے کرداروں میں بتدریج تبدیلی اس عہد کی طبقاتی جبریت کی بدولت ظاہر ہونے والے سماجی روّیے اور رجحانات ہوتے ہیں۔ داستانوں کے مرکزی کردار کے آئینے میں اس عہد کی اقدار اور معاشرتی احوال کا سراغ ملتا ہے۔

داستانوں کے کردار اور مہمات بہت سے نفسیاتی حقائق بے نقاب کرتے ہیں۔ مہمات کے دوران کٹھن راستے، مصائب وآلام، خوف ناک مخلوق سے نبرد آزمائی اس کے لاشعور میں موجود خوف اور ڈر کا ظہار ہے۔ اس طرح مہمات کی اصل داخل سے خارج کا سفر کرتیں ہیں۔ کرداروں کی جسمانی نشوونما انداز واطوار اور شخصیت کی ہمہ گیر تبدیلیاں افراد پر فطرت کی گرفت اور سماجی جبریت کی غماز ہیں۔

داستانوں میں انسان، کائنات اور فطرت کے بارے میں ابتدائی دور کے انسان کا تصور اور مصائب زیست پوری طرح جلوہ گر ہیں۔ داستانوں کی پوری فضاء علامتی حقیقتیں ہیں جو ایک باطنی وحدت میں ڈھلتی ہیں۔ ان کرداروں کی تعمیر وتشکیل میں بلاشبہ تشنہ خواہشات کی تکمیل کا سامان موجود ہے مگر انہی خواہشات پر حیات انسانی کی بلند وبالا عمارت استوار ہے جہاں ایک مثالی سماج کے قیام کا تصور ضرور ابھرتا ہے۔ اس معاشرتی تشکیل کی بنیادیں مساوات اور انصاف پر استوار اور مثالی کردار کی صفات، عادات واطوار اور دستور حیات انسانی اوصاف سے مزین فرد کی سماج سے ہم آہنگی کا آئینہ ہیں۔ داستانوں کے کرداروں میں نچلے طبقات پر خوف، بے چارگی اور حقائق سے فرار کی فضاء چھائی ہوئی ہے۔ یہ طبقہ اپنی زندگی میں نہ صرف گریز کی راہ تلاش کرتا ہے بل کہ اعلی طبقات میں شمولیت کا بھی خواہش مند ہے۔ یہ طبقہ عام انسانی سطح پر زندگی جینے کی مشقت کے بجائے ماورائی طاقتوں سے اپنی صلاحیت بڑھانے میں مصروف ہے۔ جادو، منتر اور جادوئی گھوڑے اس عہد میں زندگی بسر کرنے والے فرد کی حقیقی زندگی سے نہ صرف فرار کو ظاہر کرتا ہے بل کہ طبقاتی نفسیات کے ضمن میں اس بات کا اظہار ہے کہ خوف، دہشت اور معاشرتی گھٹن کی فضاء انسانوں کو لاشعوری طور پر زندگی کا بالغ نظری اور حقائق سے سامنا کرنے کے بجائے فرار کی راہ دکھاتی ہے۔ دوسری طرف اعلی طبقے کے اندر زندگی کی تمام

رونقیں، آسانیاں، سہولیات اور کشش موجود ہے وہ اپنی دنیا میں مگن اور نچلے طبقات کو اپنا خدمت گار سمجھتا ہے۔ طبقاتی کش مکش اور معاشرتی جبریت کا اظہار داستانوں میں موجود ہے۔

اردو کے افسانوی ادب میں ناول طبقاتی نفسیات کے حوالے سے ایک قابل مطالعہ صنف ہے۔ داستان کا انسان سماج کے زیر اثر زندگی بسر کر رہا تھا مگر انسانی سماج کی ترقی میں تعقل کے ذریعے فطرت پر قابو پانے کی جستجو نے ناول کو جنم دیا۔ معاشرتی اور معاشی سماجی تغیر و تبدل کے دوران تخیل سے حقیقت نگاری، تحیر نے تعقل اور زرعی معاشرے نے صنعت تک کا سفر کیا۔ ان سماجی اور معاشی تبدیلیوں نے انسانی فکر و احساس کو بدلا اور داستان نے ناول کی صورت اختیار کی۔ اردو ناول نگاری میں نذیر احمد کا عہد جاگیرداریت کے ڈوبتے سورج اور نئی سرمایہ دارانہ ترقی کے آغاز کا عہد تھا۔ اس عہد میں سماج اپنی تبدیلی کے باوجود جاگیرداریت کی روایات میں جکڑا رہا اور انسانی سماج قدیم و جدید کے درمیان جھولتا رہا۔ معاشرے کے اعلیٰ طبقات قدیم روایات پر کاربند رہے تو نچلی سطح پر جدید عہد کی تبدیلی کے اثرات مدہم اور ہلکے انداز سے نمودار ہونا شروع ہوئے۔ نذیر احمد معاشرتی اصلاح کے ذریعے نئی تبدیلی کا راستہ بدلنے کے دوران نفسیاتی کش مکش کا شکار ہوئے اور کرداروں کی طبقاتی نمائندگی پرانی روایات کی بقاء اور نئی صبح کے آغاز کے درمیان محو سفر رہی۔ ابن الوقت ایک ایسے طبقے کے طور پر ابھرا جو نئی سماجی تبدیلی کے باوجود قدیم و جدید کے درمیان معلق رہا مگر فسانہ مبتلا داخلی زندگی کی کش مکش کو گھریلو زندگی میں پیوست کرتا ہے۔ توبۃ النصوح کے بارے میں ڈاکٹر غلام حسین لکھتے ہیں:۔

> اس ناول میں ہمیں انیسویں صدی کے مسلم معاشرے کے بہت سے روشن اور تاریک پہلو، امیروں اور امیر زادیوں کے مشاغل نچلے طبقوں کی اقتصادی مشکلات، جاگیرداری عہد کی فرسودہ راویات اور ایک نئی تہذیب کے ابھرتے ہوئے نقوش ہمیں جا بجا نظر آتے ہیں۔(۵۴)

سرشار کے ناولوں میں لکھنوی تہذیب ابھر کر سامنے آتی ہے۔ لکھنو کی تہذیب کے اکثر نمائندہ کردار نفسیاتی حوالوں سے خوف اور فرار کی کوششوں کے دوران عیاشی کی روش اختیار کر لیتے ہیں۔ سرشار نے نوابوں کی عیاشیوں اور عورتوں کے استحصال کو "جام سرشار" میں نمایاں کیا۔ روایات سے وابستگی، خارجی زندگی میں تبدیلی کی جھلک اور خواہش کے ٹکراؤ نے جن نفسیاتی مسائل کو جنم دیا ان کا عکس اس عہد کے ناولوں میں موجود ہے۔ عبدالحلیم شرر عظمت ماضی کے سنہرے دنوں کے سہارے حال و مستقبل میں تبدیلی کے خواہش مند ہیں۔ شرر نے بڑی جانفشانی سے تاریخ اسلام کے واقعات کو ناولوں میں سمویا ہے مگر ان کے ناول داستانوں کی پچھلی دنیا کے قریب آ گئے جہاں تخیل زیادہ طاقت ور نظر آتا

ہے۔ دراصل ان کے ناولوں میں قومی شناخت سمیت نئی تہذیب کو قبول کرنا، لکھنو کی تہذیب کا ڈوبتا سورج اور ماضی کی طرف رجوع کرنے کے متصادم رویّوں کا اظہار ملتا ہے اور اس عہد کے کردار انھی رویوں سے متعلق کرداروں اور طبقات کے نمائندہ ہیں۔

بدلتے عہد کے اثرات ناول کے کرداروں پر پڑے اور خارجی حقیقت نگاری کے ساتھ داخلی حقیقت نگاری کا دبستان ظاہر ہوا۔ داخلی حقیقت نگاری کے نمائندہ ناول نگار مرزا رسواء ہیں۔ مرزا رسواء نے عورت کے اندر احساس تحفظ کی نفسیات کے علاوہ مختلف طبقات کی نمائندگی کا حق ادا کیا۔ داخلی تصادم اور اضطراب وانتشار رسواء کے کرداروں کی خاص پہچان ٹھہری۔ داخلی اضطراب وانتشار کی کیفیت مرزا سعید دہلوی سے لے کر نیاز فتح پوری تک متنوع رنگوں سے مزین نظر آتی ہے۔ قاضی عبدالغفار نے اپنے گردوپیش کی حقیقی دنیا میں عورت کے داخلی ارتقاء اور مردوں کے مکروفریب کو نمایاں کیا۔ طوائف ہونے کے باوجود گھریلو زندگی کا خواب طبقہ طوائف میں موجود جذبے کا دل کش اظہار "لیلیٰ کے خطوط" اور سماجی جبر کے داخلی اثرات "مجنوں کی ڈائری" میں موجود ہیں۔ انگریزی سامراجیت کے خلاف شدید نفرت، طبقاتی سماج میں پستے نچلے طبقے کے کسانوں کی حالت زار، عورت کی مظلومیت اور متوسط طبقے کی معاشی پریشانیوں کے نفسیاتی اثرات پریم چند کی ناول نگاری کی نمایاں صفات ہیں۔ متوسط طبقے کی امارت پسندی اور کھوکھلی نمائش کے پس منظر میں اس طبقے کی تشنہ خواہشات اور بے سروسامانی کو ظاہری رکھ رکھاؤ سے چھپانے کی کوشش کے نفسیاتی محرکات کی تلاش ان کے ہاں موجود ہے۔ نچلے درجے کے قرض تلے دبے استحصال زدہ کسانوں کی سسکتی زندگی و زمین داروں، ساہوکاروں، برہمنوں، تھانے داروں اور پٹواریوں کی چیرہ دستیوں کی نفسیاتی الجھنوں کو پریم چند نے ایک حقیقت پسند فن کار کے طور پر متعارف کروایا۔ "گئودان" کے ہیرو کے بارے میں قمر رئیس لکھتے ہیں:۔

> اس کا کردار اردو ادب کے عظیم اور امر کرداروں میں سے ایک ہے، وہ نہ صرف اپنے طبقہ کے سماجی مسائل کا نمائندہ ہے بل کہ ہم اس کے کردار میں جاگیردارانہ نظام زندگی میں پرورش پاتے ہوئے کسان کی نفسیات کے سارے پیچ خم کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔(۵۵)

پریم چند نے اس طبقے کی زندگی کے مسائل اور نفسیاتی الجھاؤ کا ذکر کیا جو صدیوں سے اعلیٰ طبقات کی خدمت گزاری اور ستم کی پالیسوں تلے جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے کوشاں ہے۔ انسانی محنت کی عظمت کا شعور، مساوات کا احساس اور محنت کش طبقہ کے استحصال پر پریم چند کی گہری نظر تھی۔ انھوں نے ان احساسات کی بدولت فرار، گریز، بددلی، اکتاہٹ اور بیگانگی جیسی نفسیاتی الجھنوں کو کمال مہارت سے اپنے ناولوں میں برتا۔ بیسویں صدی میں

فکشن نگاری کا انداز بدلا اور کردار نگاری میں داخلی حقیقت نگاری کی بدولت کرداروں کے لاشعور کی کھوج میں خارجی محرکات بے نقاب ہوئے۔ تحلیل نفسی کی مدد سے کرداروں کے اندر کی دنیا کو کریدنے کا رجحان فروغ پانے لگا اور جنس و معاش کے نفسیاتی اثرات ناولوں میں ظاہر ہونے لگے۔ ترقی پسند تحریک نے ناولوں میں حقیقت نگاری کو فروغ دیا جہاں غربت، مفلسی اور بھوک کو نچلے طبقات میں پیش کرتے ہوئے عریاں حقیقت نگاری کے نادر نمونے تراشے گئے۔ اشتراکی میلانات سے نئے خیالات ور جحانات، نئی بیداری اور سیاسی وسماجی تبدیلی نے ناول کے انداز کو بدل دیا۔ اس تحریک نے کارل مارکس کے نظریہ مادیت کے گہرے اثرات قبول کیے کہ مادہ حقیقت ہے اور کبھی فنا نہیں ہوتا اور صحت مند مادی ارتقاء کی بنیاد ذرائع پیداوار اور دولت کی منصفانہ تقسیم پر ہے۔ فرائڈ نے انسانی ذہن میں لاشعوری محرکات تلاش کیے جو نظروں سے اوجھل ہونے کے باوجود خارجی دنیا پر اثرات مرتب کرتے ہیں اور ان نظریات کی بنیاد پر اس تحریک سے وابستہ ناول نگاروں نے ناول تخلیق کیے۔ سجاد ظہیر نے شعور کی رو، کرشن چندر نے اشتراکی حقیقت نگاری اور عصمت چغتائی نے تحلیل نفسی کی بنیادوں پر کرداروں کا مطالعہ کیا۔

اردو ناول نگاری میں حجاب امتیاز علی نے "اندھیرا خواب" کے ایک کردار صوفی کی نفسیاتی الجھنوں کو فرائڈ کے ایڈی پس الجھاؤ کے حوالے سے تلاش کیا۔ تقسیم کے بعد فسادات کے موضوع پر ناولوں کا ایک نیا عہد شروع ہوا۔ ان میں انسان کی حیوانی و درندگی کی خواہشات کے پس پردہ نفسیاتی محرکات کا کھوج لگایا گیا۔ اردو ناول کے تناظر میں ایک بات شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ ناول نگار تہذیبی تصادم میں اپنے تاریخی ورثے، روایات و اقدار سے گہری عقیدت اور وابستگی رکھتے تھے اور جدیدیت کے باوجود روایات کے پاسدار نظر آتے ہیں جو سماجی جبریت کے نفسیاتی اثرات کی بدولت ممکن ہوا ہے۔ خواتین ناول نگار طبقاتی سماج سے ایک حد تک آزادی کی خواہش مند رہیں مگر کسی گہرے معاشرتی ٹکراؤ اور تصادم کی گرج چمک سے ایک حد فاصل کے ساتھ ان کے کردار نسوانی نفسیات کے زیر اثر سمجھوتا بازی کی روش پر قائم رہے۔ ان ناول نگاروں کے ہاں ممتا کا جذبہ تمام تر مردانہ سماج کے استحصال کے باوجود قوی نظر آتا ہے۔ خواتین ناول نگاروں نے ایڈلر کی اس بات کو مشعل راہ بنایا کہ پورا انسانی سماج عورت کی ممتا سے وابستہ ہے۔ اسی لیے طوائف کے بطن میں بیٹھی گھریلو عورت بھی شاید اسی جذبے اور رویے کی گرفت کا شکار ہو کر استحصال کے باوجود گرہستی کی خواہش مند ہوتی ہے۔ اردو ناول میں کرداروں کے مختلف طبقات پر خارجی جبریت کے محرکات اور ان کے نفسیاتی اثرات موجود ہیں۔

داستان سے ناول اور ناول کے بطن سے افسانے نے جنم لیا۔ ناول کا موضوع سماجی شکست وریخت اور افسانے

کا موضوع فرد کی داخلی کیفیات کا اظہار ہے۔فرد اور سماج کو ہم آہنگ کرنے کی غرض سے اردو افسانے نے اظہار کی راہ پائی۔ پریم چند کی افسانہ نگاری میں قومی زندگی کی شدت کے ساتھ ساتھ خاندان کی روایت برقرار رکھنے کا رجحان غالب نظر آتا ہے۔نوجوانوں کی داخلی زندگی اور قدیم خاندانی نظام سے بغاوت کی صدا یلدرم کے افسانوں کا موضوع بنی۔ یلدرم نے مرد اور عورت کے فطری تعلق کو قائم رکھنے پر ہی زور نہیں دیا بل کہ دونوں کے فطری تعلق کی راہ میں رکاوٹوں کی بدولت پیدا شدہ نفسیاتی الجھنوں کا کھوج لگایا۔ان کے ہاں جذبہ اور تخیل پوری شدت سے محسوس ہوتا ہے۔ پریم چند کے ہاں طبقاتی جبریت اور معاش کی الجھنوں کا عکس ان کے ناولوں کی طرح افسانے میں بھی اپنا الگ اور منفرد رنگ دکھاتا ہے۔ان کے ہاں ضروریات زندگی کی عدم دستیابی سے انسان کی ذات میں ابھرنے والی توڑ پھوڑ کا نمایاں ذکر ہے۔

متوسط طبقے کی پریشانیوں، معاشرتی و معاشی استحصال اور جذبات کی کش مکش کے آئینہ دار افسانے سدرشن، دہلی کے متوسط گھرانوں کی عکاسی راشد الخیری اور اعظم کریوی نے دیہاتی زندگی کی الجھنوں کا ذکر اپنے افسانوں میں کیا۔اوپندر ناتھ اشک نے نچلے طبقے میں عورت کی مجبوریوں، نا آسودگیوں اور محرومیوں کو منفرد اور متنوع انداز سے اپنا موضوع بنایا، مزدور طبقے کی سماجی و معاشی جبریت اور اس طبقے پر مرتب ہونے والے اثرات کو نمایاں کیا۔۱۹۳۰ء کے بعد کا ہندوستانی معاشرہ عالمی کساد بازاری کے باعث معاشی الجھنوں کا شکار ہوا۔اس معاشی نا آسودگی نے دیہات کی پرسکون اور بے فکری کی زندگی کو بے روزگاری اور اضطراب کی کیفیت سے دوچار کیا جس کی بدولت ایک بڑی دیہاتی آبادی گاؤں و دیہات سے شہروں میں سکونت اختیار کرنے پر مجبور ہوئی۔ گاؤں کی آسودہ زندگی کے شب و روز جب شہروں کی افراتفری اور مصنوعی پن کی الجھن کا شکار ہوئے تو ہندوستان کے ادیبوں نے معاش کی بدولت پیدا ہونے والے داخلی اثرات کو اپنے کرداروں میں برتا۔ یہ دراصل بدلتے عالمی منظر نامے کے لاشعوری اثرات تھے جن سے ادیب متاثر ہوئے اور ان کے کرداروں کی زبان ان ہی کی تشنہ خواہشات کے عکاس تھی۔اس حقیقت نگاری نے ادب برائے زندگی کو فروغ دیا اور خارجی و داخلی حقیقت نگاری کا رجحان ابھر کر سامنے آیا۔

کرشن چندر کے اکثر افسانے زندگی کی تلخیوں اور نا آسودگیوں کے گرد گھومتے ہیں جہاں معاشرتی اونچ نیچ اور طبقاتی سماج کی کش مکش میں متوسط اور نچلا طبقہ زندگی بسر کرتا ہے۔ "پانی کا درخت"، "پالنا"، "کالو بھنگی" اور "پورے چاند کی رات" اس قبیل کے نمائندہ افسانے ہیں۔احمد ندیم قاسمی کے کردار دیہاتی زندگی میں غربت اور مفلوک الحالی کے چکی میں پس رہے ہیں۔ "بگولے" میں کرداروں کی معاشی مجبوریوں کے نفسیاتی پہلوؤں کی جھلک نظر آتی ہے۔

بیدی نے انسان کی سماجی اور معاشرتی زندگی کو گہرائی میں جا کر محسوس کیا ہے۔ان کا افسانہ "گرم کوٹ" ایک

متوسط طبقے کے فرد کی ذہنی الجھنوں اور معاشی دقتوں کا اظہار ہے۔طبقاتی سماج کے نفسیاتی اثرات ان کے ایک افسانے "تلاداں" میں شدت سے نظر آتے ہیں "طبقاتی سماج غریب بچّوں میں جونفسیاتی الجھنیں پیدا کرتا ہے، "تلاداں" ان الجھنوں کا عمدہ تجزیہ ہے"(۵۶)

بیدی کے اکثر افسانے ہندوستان کے متوسط طبقے کی مجبوریوں کے ترجمان ہیں۔ان کے افسانے طبقاتی سماج کی جبریت کے نفسیاتی اثرات کا بہترین اظہار ہیں۔اسی عہد کے ایک اور با کمال افسانہ نگار سعادت حسن منٹو ہیں جن کے افسانوں کی حقیقت نگاری، جنسی گھٹن کا اظہار، سماج کی منفرد تصویر کشی، سماجی خود ساختہ بندھن وضابطے اور طبقاتی و معاشی مسائل کا بیان ان کی خاص پہچان ہے۔ترقی پسند تحریک کے اثرات کی بدولت اس عہد کے اکثر افسانہ نگاروں کے ہاں طبقاتی معاشرے کی جبریت اور اس جبریت کے نفسیاتی اثرات گہرے یا مدہم انداز سے محسوس کیے جا سکتے ہیں۔اسی عہد کے ایک اور افسانہ نگار غلام عباس ہیں۔غلام عباس نے طبقاتی سماج میں زندگی بسر کرنے والے نچلے اور متوسط طبقات پر خارجی جبریت کی بدولت پیدا شدہ نفسیاتی الجھنوں کو نمایاں کیا۔ان کے افسانوں میں معاش، جنس، جنس ومعاش اور ماحول وقانون کے خارجی عوامل کے داخلی اثرات کو متنوع رنگوں سے بیان کیا گیا۔ممتاز شریں نے دور بلوغت کے نفسیاتی مسائل سے اپنے افسانوں کو انفرادیت بخشی تو ممتاز مفتی نے "اسارائیں" میں عورتوں کی لاشعوری کش مکش کے دوران ہسٹریا کیفیات کو بیان کیا۔

قرۃ العین حیدر نے اپنے افسانوں میں ہندوستان کے اعلیٰ طبقے کی نمائندگی کی، جو مغربی طرز زندگی کی روش پر زندگی گزارنے کا خواہش منداور ہندوستانی تہذیب سے دوری قائم رکھنے کی لاشعوری گرفت کا شکار ہے۔اس طبقے پر احساس کمتری کو احساس برتری میں بدلنے کا نفسیاتی رجحان غالب ہے۔مسعود شاہد کے ہاں طبقاتی کشمکش کا عنصر غالب ہے۔اردو افسانے کی داخلی حقیقت نگاری میں سماجی گھٹن، اعصابی تناؤ، نرگسیت، گریز، فرار اور احساس کمتری جیسی نفسیاتی الجھنوں کو نچلے اور متوسط طبقات کی زندگیوں میں تلاش کیا گیا ہے۔خارجی حقیقت نگاری میں جنس، معاش، طبقاتی استحصال اور خارجی حاکمیت کو نمایاں انداز سے جگہ دی گئی جہاں طبقاتی معاشرے کی عدم مساوات پر مبنی بنت فرد کی اندرونی شکست وریخت میں کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔" گھر سے گھر تک" متوسط طبقے کی احساس کمتری، اعلیٰ طبقے میں شمولیت کی شدید خواہش اور بہروپ کا آئینہ دار ہے۔خدیجہ مستور نے متوسط اور نچلے طبقات میں سماجی پابندیوں تلے دبے کرداروں کو بیان کیا۔

اردو ادب کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ داستان، ناول اور افسانے میں طبقات کو نہ صرف موضوع بنایا گیا ہے بلکہ

داخلی اور خارجی حقیقت نگاری کے زیر اثر ان طبقات کا گہرائی سے مطالعہ کیا گیا۔ ترقی پسند تحریک کی بدولت ناول اور افسانہ نئے رجحانات سے آگاہ ہوا۔ فکشن نگاروں نے سماج میں بیداری کی لہر پیدا کی اور رفتہ رفتہ عوامی سوچ کو تبدیل کیا۔ انہوں نے مفلسی، غربت، بھوک اور نچلے طبقے کی زندگی اور استحصال کو پیش کیا۔ اسی دور میں افسانے کے اندر خاص طور پر طبقاتی سماج کی لاشعوری گرفتوں کا سراغ لگایا گیا۔ مرد اور عورت کی علیحدہ نفسیات اور مارکسیت کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاروں نے فرائڈین کو اپنایا اور جنسی گھٹن کو بطور موضوع استعمال کیا۔ اس طرح اردو افسانے میں جرات اور دلیری کے ساتھ انفرادی اور اجتماعی نفسیات کے موضوعات فن کے سانچے میں ڈھلے۔

انسانی معاشرے کی تشکیل طبقاتی بنت سے وقوع پذیر ہوتی ہے۔ معاشرے کی طبقاتی اکائیاں اپنا مخصوص وجود اور پہچان رکھتی ہیں جہاں ہر سماجی اکائی کی بقا کا سامان اس کی انفرادیت میں مضمر ہوتا ہے۔ طبقاتی تشکیل میں سیاسی، سماجی، معاشرتی، معاشی اور مذہبی عناصر کلیدی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ معاشرے کی طبقاتی صورت پذیری میں سماجی ارتقا کا عمل متاثر کن اثرات مرتب کرتا ہے جس کی بدولت انسانی سماج متنوع طبقاتی مراحل سے گزرتا رہتا ہے۔ ہر بدلتے عہد کے سماجی عوامل معاشرے کو طبقات میں تقسیم کرتے رہتے ہیں۔ معاشرے کی طبقاتی گہرائیوں میں سماجی عدم مساوات، خارجی حاکمیت کا زبردستی نفاذ اور طاقت کے بل بوتے پر انسانی جذبات و احساسات کا استحصال کارفرما ہوتا ہے۔ سماج میں طاقت ور طبقات اپنی بقا اور بالادستی کے لیے طبقاتی تقسیم کا غالب رجحان رکھتے ہیں۔ اس طرح سماج میں طبقات کا وجود اپنی کوکھ میں طاقت اور بے بسی کے مابین ازلی کش مکش سے لبریز ہوتا ہے۔ سماج کی طبقاتی بنت کاری افراد معاشرہ کی طبقاتی نفسیات مرتب کرنے میں طاقت ور محرک کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جس کی بدولت طاقت ور طبقات میں استحصال کا غالب رجحان اور تشدد کی نفسیات کے علاوہ کم زور طبقات میں سمجھوتہ بازی کے رجحانات طبقاتی بنت سے ہی اظہار کی راہ پاتے ہیں۔ اردو فکشن نگاروں نے ترقی پسند تحریک کی حقیقت نگاری کی وساطت سے سماج میں طبقات کا وجود، طبقاتی تشکیل کے عوامل اور ان کے نفسیاتی اثرات کا سراغ لگایا جس سے اردو ادب میں نئے رجحانات، وسعت اور بالغ نظری سے سماجی مطالعہ قابل عمل بنا۔

حوالہ جات

۱۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، مرتب، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص ۱۴۵

۲۔ سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر، جدید اردو افسانے کے رجحانات، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص ۲۱۰

۳۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، افسانہ اور افسانہ نگار۔ تنقیدی مطالعہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء ص ۲۲، ۲۳

۴۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو افسانہ اور افسانہ نگار، الوقار پبلیشرز، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۲۰

۵۔ سنبل نگار، ڈاکٹر، اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ، دارالنور، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۱۴۷

۶۔ انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ۔ ایک صدی کا قصہ، مثال پبلیشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۱۶

۷۔ محمد اسلم قریشی، ڈاکٹر، ڈرامہ نگاری کا فن، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۱۴۳

۸۔ علی عباس جلالپوری، تاریخ کا نیا موڑ، تخلیقات، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۶

۹۔ ایضاً، ص، ۱۹

۱۰۔ سبط حسن، موسیٰ سے مارکس تک، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۱۱ء، ص ۵۲

۱۱۔ ایضاً، ص ۵۶

۱۲۔ علی عباس جلالپوری، تاریخ کا نیا موڑ، تخلیقات، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۹

۱۳۔ محمد عاصم بٹ، مضمون: "مہاویر" مشمولہ، ہم شہری، شمارہ نمبر ۲۸، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۴۳

۱۴۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ کیا کہتی ہے، فکشن ہاؤس، لاہور، اشاعت دوئم، ۲۰۰۴ء، ص ۱۵

۱۵۔ قاضی جاوید، روسو، مشعل بکس، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۹

۱۶۔ ایضاً، ص ۵۰

۱۷۔ ایضاً ص ۵۱

۱۸۔ سبط حسن، موسیٰ سے مارکس تک، ص ۲۷۵

۱۹۔ علی عباس، جلالپوری، تاریخ کا نیا موڑ، ص ۹۶

۲۰۔ ایضاً ص ۹۶

۲۱۔ ایضاً ص ۱۰۳

۲۲۔ رومیصاء موہانی: "مضمون، اشتراکیت اور مولانا حسرت موہانی"، مشمولہ، مولانا حسرت موہانی ایک ہمہ جہت شخصیت، مرتب، محمد اصغر سید کاظمی، حسرت موہانی میموریل لائبریری اینڈ ہال ٹرسٹ، کراچی، ۲۰۰۴ء، ص ۱۵۵

۲۳۔ نقاش کاظمی، مضمون: "مولانا حسرت موہانی عظیم صحافی اور آہنی عزم کے انسان"، مشمولہ، مولانا حسرت موہانی، ایک ہمہ جہت شخصیت، ص ۳۴۵

۲۴۔ علی عباس، جلالپوری، تاریخ کا نیا موڑ، ص ۱۱۳

۲۵۔ سبط حسن، موسیٰ سے مارکس تک، ص ۲۶

۲۶۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ کیا کہتی ہے، ص ۳۷

۲۷۔ ایضاً ص ۷۷

۲۸۔ عبیداللہ سندھی، مولانا، قرآنی شعور انقلاب (جمع ترتیب: "بشیر احمد شیخ لدھیانوی، خدا بخش غازی مرحوم) کلی دارالکتب، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۱۲۸

۲۹۔ ایضاً، ص ۹۱

۳۰۔ غالب احمد، تشدّد: تاریخی تناظر میں، مشعل، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۲۲

۳۱۔ نذیر احمد تشنہ، پروفیسر، رہبر علم التعلیم، قریشی پبلیشرز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۵۲۰

۳۲۔ عطاء الرّحیم، ڈاکٹر، نفسیات، کفایت اکیڈمی، کراچی، ۱۹۷۳ء، ص ۲۸

۳۳۔ ایضاً، ص ۱۷

۳۴۔ ایضاً، ص ۱۹

۳۵۔ محمد عارف ضیاء، ڈاکٹر، محمد اسلم میاں، تعلیمی نفسیات اور نصاب، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۴ء، ص ۲۹

۳۶۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ کی آگہی، تاریخ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۲۱۲

۳۷۔ علی عباس جلالپوری، تاریخ کا نیا موڑ، ص ۱۹

۳۸۔ محبوب اختر رانا، روزنامہ، خبریں، کالم، بدن بولی، ۱۴ اگست، ۲۰۱۳ء

۳۹۔ خالد سہیل، ڈاکٹر، انسانی شعور کا ارتقاء، سٹی بک پوائنٹ، کراچی، ۲۰۱۲ء، ص ۳۳

۴۰۔ ایضاً، ص ۳۳

۴۱۔ نعیم احمد، ڈاکٹر، فرائڈ نظریہ تحلیل نفسی، مشعل، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۳۰

۴۲۔ ایضاً، ص ۳۱

۴۳۔ ایضاً، ص ۳۷

۴۴۔ ایضاً، ص ۴۱

۴۵۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو میں تنقید کا نفسیاتی دبستان، مقالہ، پی ایچ ڈی، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور، ۱۹۷۶ء، ص ۲۸۷، ۲۸۸

۴۶۔ ایضاً، ص ۴۲

۴۷۔ ایضاً، ص ۳۴۸

۴۸۔ غلام حسین، ڈاکٹر، اردو افسانے کا نفسیاتی مطالعہ، مقالہ۔ پی ایچ ڈی، سندھ یونی ورسٹی، ۱۹۷۹ء، ص ۸۸

۴۹۔ ایضاً، ص ۹۱

۵۰۔ ایضاً، ص ۹۵

۵۱۔ ایضاً، ص ۹۷

۵۲۔ جاوید اختر سید، ڈاکٹر، اردو کی ناول نگار خواتین، مقالہ، پی ایچ ڈی، بہاء الدین زکریا یونی ورسٹی، ملتان، ص ۸۵

۵۳، وقار عظیم سید، داستان سے افسانے تک، اردو اکیڈمی، سندھ، ۱۹۶۰ء، ص ۲۱، ۲۲

۵۴۔ غلام حسین، ڈاکٹر، اردو افسانے کا نفسیاتی مطالعہ ص ۳۴۸

۵۵۔ قمر رئیس، پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار، دوسرا ایڈیشن، سرسید بک ڈپو، علی گڑھ، ۱۹۶۳ء، ص ۸۵

۵۶۔ غلام حسین، ڈاکٹر، اردو افسانے کا نفسیاتی مطالعہ ص ۵۳

باب نمبر۲

غلام عباس کا طبقاتی ونفسیاتی شعور

غلام عباس اردو کے ایک اہم اور صاحب طرز افسانہ نگار ہیں۔ان کی افسانہ نگاری میں دیگر افسانوی خصوصیات کے ساتھ ساتھ سماج میں موجود طبقات کا نہ صرف وجود بل کہ متوسط، نچلے متوسط اور نچلے طبقات پر خارجی جبریت کی بدولت پیدا شدہ نفسیاتی اثرات کا منفرد اظہار بھی ملتا ہے۔انھوں نے طبقات پر معاش،جنس،جنس ومعاش اور ماحول و قانون کی جبریت کے نفسیاتی اثرات کا سراغ لگایا۔وہ خود ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور اپنی ابتدائی عمر میں ہی معاشی تنگ دستی کے سبب معمولی ملازمتوں کا سہارا لینے کی مجبوری نچلے طبقات کی معاشی الجھنوں اور خارجی جبریت کی نفسیاتی تفہیم میں ان کی معاون ثابت ہوئی۔

غلام عباس کے طبقاتی اور نفسیاتی شعور کی درست تفہیم کے لیے ان کے عہد کا معاشرتی،معاشی،نفسیاتی اور فکری حوالوں سے جائزہ لینا ناگزیر ہے کیوں کہ کوئی بھی ادیب یا فن کار اپنے عہد کی صورت حال سے الگ ہو کر اعلیٰ ونمائندہ ادب تخلیق نہیں کرسکتا ہے۔" انسانی شعور میں خارجی حقائق منعکس ہوتے ہیں جو شعور سے علاوہ اپنی ذات میں موجود ہیں۔انہی حقائق سے فن کار اور ادباء اپنے موضوعات لیتے ہیں اور عمل تخلیق سے انہیں دل کش روپ عطا کرتے ہیں"(۱)

غلام عباس کی افسانہ نگاری کا زمانہ ترقی پسند تحریک کی سماجی حقیقت نگاری کی بدولت اردو افسانے کے عروج کا زمانہ تھا۔ان کے عہد تک اردو افسانے کا سفر حقیقت نگاری اور رومان پسندی کے امتزاج سے پروان چڑھا لیکن ترقی پسند تحریک نے طبقاتی جبریت کے عوامل اور ان کے نفسیاتی اثرات کی اردو افسانے میں راہ ہموار کی۔

معاشرتی وفکری پس منظر

ہندوستان کا معاشرہ ایک قدیم ترین سماج تھا جس نے گنگا جمنا اور سندھ کے کناروں پر اپنے خدو خال تراشے۔یہ معاشرہ بتدریج پتھر،دھات اور لوہے کے عہد سے گزرا۔ہندوستانی معاشرہ تہذیب کے ابتدائی ادوار سے ہی طبقاتی تقسیم کا شکار رہا۔ذات پات اور اونچ نیچ کی طبقاتی صورت حال نے معاشرتی ومعاشی مسائل کا انبار لگا دیا جس کے اثرات اس قدر شدت اختیار کر گئے کہ بیرونی حملہ آوروں نے آسانی کے ساتھ مقامی آبادی کو ساتھ ملا کر بظاہر برابری و

مساوات کا پرچار کر کے ہندوستان پر نہ صرف قبضہ کیا بل کہ اپنے اقتدار کو طول بھی بخشا۔

ہندوستان میں انگریز کی آمد تجارتی مقاصد کے تحت ہوئی جس نے مقامی آبادی کے طبقاتی و معاشی مسائل کو مزید وسعت دے کر قبضہ جمالیا۔ انگریزی سامراج نے دیگر مقبوضات کی طرح ہندوستان میں معاشی، سیاسی، تعلیمی اور ذہنی و فکری حکمت عملیاں وضع کیں جو براہ راست یا بالواسطہ طور پر ان کے متعینہ مقاصد کو پورا کرتی تھیں۔ انھوں نے مقامی آبادی کے مسائل کو جدید انداز اور نئے نو آبادیاتی نظام کی تشکیل سے واضح کرتے ہوئے یہ بات محکوموں کے ذہنوں پر مرتب کی کہ انگریز سرکار ان کے لیے ایک نعمت اور نجات دہندہ ہے۔

یورپی اقوام نے نو آبادیاتی نظام کو مضبوط کرنے اور مقامی آبادی کے استحصال کا جواز مقامی باشندوں کے سست اور کاہل نظریے میں تلاش کیا اور خود کو ہندوستانی معاشرے کی فلاح کا ضامن بنا کر پیش کیا۔ "اس لیے سست اور کاہل مقامی باشندوں کا مفروضہ محض نو آبادیات کے استحصال کے لیے پیدا کیا گیا۔" (۲) نو آبادیاتی انتظام کے ردعمل میں مقامی آبادی کے اندر وطن سے عقیدت کے جذبات پیدا ہوئے اور حکومتی معاملات میں اپنی شمولیت کی راہ تلاش کرنے کی پنچلی لہر نمودار ہوئی۔

انگریز سرکار نے اپنے تجارتی مقاصد کے حصول کی خاطر ہندوستان میں ریلوے، سڑکیں اور ڈاک کے نظام کو متعارف کروایا جس کی بدولت فاصلوں میں کمی آئی اور دیگر علاقوں میں میل جول کی فضاء پیدا ہوئی۔ اس سے لوگ ایک دوسرے کے مسائل سے واقف ہوئے۔ انگریزی تعلیم اور محدود پیمانے کے سکولوں و مدارس سے علم و شعور کا آغاز ہوا۔

ہندوستان میں نئے نو آبادیاتی نظام نے طبقات کا نیا ڈھانچہ وضع کیا جس میں انگریز سرکار کا تابع فرمان شہری متوسط طبقہ بھی شامل تھا۔ متوسط طبقے نے انگریزی تعلیم کے ذریعے اپنے لیے نچلے درجات کی ملازمتوں کو ممکن بنایا۔ ملازمتوں کی محدود فراہمی و علمی آگہی کے علاوہ تحفظ و سکون اور جمالیاتی ضرورتوں نے ادب و فن کی روایت کو جنم دیا۔ قدیم ہندوستان میں جہاں علم و ادب پر اعلیٰ طبقے کی اجارہ داری اور حکومتی سرپرستی کا رواج تھا اسے انگریزی سامراج نے نفرت اور حقارت کے پیش نظر غیر ضروری قرار دے دیا۔ اس طرح تخلیق میں دیگر سماجی طبقے بھی شامل ہوئے۔ نچلے اور متوسط طبقات کی جمالیاتی حس بیدار ہوئی اور ادب و فن کو فروغ حاصل ہوا۔ انیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے آغاز پر ہندوستانی ادب میں اصلاح پسندی، قوم پرستی اور انسان کی سماجی زندگی کی عکاسی کے رویے پھلے پھولے اور ادب بنیادی طور پر انسان دوستی کی سمت اختیار کرنے لگا۔ برِعظیم پر دو صدیوں کی انگریز حکمرانی نے معاشرے کے اندر بہت کچھ بدلا اور کئی مثبت و منفی تبدیلیاں رونما ہوئیں جن کا اہل ہند نے کبھی کھلم کھلا اور کبھی کبھار ڈھکا چھپا اظہار کیا۔

تقدیر پرستی کی جبریت سے انسانی سوچ وفکر کی آزادی میں انسان دوستی کی تحریک نے یورپ کے متوسط طبقے کو نہ صرف متاثر کیا بل کہ اس سوچ اور فکر نے سماجی اور اقتصادی میدانوں میں اٹھارویں صدی کے نصف آخر تک روشن اور آزاد خیالی کو مزید مستحکم کیا کیوں کہ خارجی جبریت انسانی فلاح میں ایک بڑی رکاوٹ تھی۔ روسو کے معاہدہ عمرانی میں حکومت کے قیام و استحکام میں فرد کی مرضی کو بنیادی اہمیت دی گئی۔ نئے معاہدہ عمرانی کی بدولت فرد اور عوام حکومتی معاملات میں باہمی معاہدے توڑ کر ایک دوسرے سے آزاد ہو سکتے ہیں۔ یہ دراصل نئے طبقات اور پھر ان کے مابین نئے معاہدہ عمرانی کے تحت نئی ایڈجسٹ منٹ کا اعلان تھا۔ اس آزادی سے سماج کے پس ماندہ طبقات کو معاشرتی احترام حاصل ہوا اور آزاد خیالی ایک ضرورت کے طور پر ابھری:۔

> آزاد خیالی ایک سیاست، ایک نظریہ بن گئی جو ایسے دساتیر، قوانین اور سیاسی تجاویز کا محرک بنی جن کا مقصد عاقلانہ منشاء کی عمل داری پر منحصر انفرادی آزادیوں کا فروغ اور تحفظ تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ معیار اتنا مبہم تھا کہ لبرل ازم کے کئی متضاد تصورات ابھر کر سامنے آئے (۳)

آزاد خیالی جسے روشن خیالی بھی کہا جاتا ہے، کے تصورات نے سیاسی حوالوں سے فرد اور ریاست کے حقوق کو متوازن کرنے کی باقاعدہ کوشش کی اور شہریوں کے جان و مال اور عزّت و وقار کے تحفظ کے علاوہ ظلم و استبداد سے بچاؤ اور سماجی مساوات و برابری کے اصولوں کا پرچار کیا۔ آزاد خیالی کی بدولت مذہبی اجارہ داری اور جاگیرداری کا خاتمہ، جدید لبرل فکر، نئے متوسط طبقے کا ظہور اور سرمایہ دارانہ نظام کا فروغ ممکن ہوا۔ آزاد خیالی کے ذریعے انسانی حقوق کے حصول کی راہ آسان ہوئی جس سے فرد کی انفرادی اور شخصی آزادی، اس کے جذبات، احساسات، خواہشات، رجحانات اور ترجحات کو نہ صرف مقدس مانا گیا بل کہ کسی طرح کی بیرونی جبریت کو ناجائز اور آزادی کی راہ میں رکاوٹ تصور کیا گیا۔

آزاد خیالی نے حکومت اور فرد کے معاملات میں حد فاصل قائم کی۔ فرد کی آزادی نے شخصی جائیداد اور آزاد تجارت کے نام پر اکثریت کی رائے کو مقدس تسلیم کرتے ہوئے دوبارہ اشرافیہ کی برتری کی طرف آغاز سفر کیا۔ اس نئی سوچ میں شخصی آزادی کے نام پر دوسروں کا استحصال بھی کیا گیا۔ آزادی کا یہ تصور آہستہ آہستہ آزادی رائے، اظہار و انتخاب کی صورت میں یورپ کے جمہوری نظام کی طور پر ابھرا۔ اسی تصور نے فرد کی مکمل آزادی کو نہ صرف اپنے آپ اور سماج تک محدود رکھا بل کہ عالمی سطح پر آزاد ریاستوں کے قیام اور آزادی کی حمایت کو ممکن بنایا۔

اس آزاد اور روشن خیالی کے رویوں نے یورپ میں عقلیت پسندی کو فروغ دیا۔ عقلیت پسندی نے مذہبی

بنیادوں کے برعکس کائنات وحیات کو عقلی بنیادوں سے سمجھنے کی کوشش گئی۔ سائنسی انکشافات، مارکسزم، فرائیڈین نفسیات اور ڈارون کے نظریات سے فرد نے معاشرتی اور داخلی مسائل کے حل کی خاطر عقل پر انحصار کرنا شروع کر دیا۔

نئے طبقاتی نظام کے تسلسل میں روشن و آزاد خیالی کو گہرا دھچکا سرمایہ داری نظام کی اجارہ داری سے لگا۔ ایک طرف انسانی مساوات اور برابری پر مبنی معاشرے کے قیام کے دعوئے شدت سے ہوتے رہے تو دوسری طرف سرمایہ دار طبقے نے اپنی پیداوار میں اضافے اور حصول زر کی ہوس میں مزدور طبقے کا استحصال شدّ و مد سے جاری رکھا۔ آزاد اور روشن خیالی سے متاثر دانش ور اس حقیقت تک پہنچے کہ فرد کی آزادی میں خارجی حاکمیت کا وجود بڑی رکاوٹ ہے۔ انیسویں صدی تک طبقاتی معاشرے کی نوعیت اس قدر واضح ہوگئی کہ محروم طبقات اور افراد کے تحفظ کی خاطر قانون سازی کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ مزدور طبقات کے اوقات کا کا تعیّن، پیداوار کی مساوی تقسیم اور اجرت کی خاطر ریاست کے وجود کو تسلیم کیا جانے لگا۔ یورپ کی قوم پرستی کی شدّت نے نوآبادیاتی نظام کو وسعت دے کر اعلیٰ و ادنی، حاکم و محکوم اور طاقت ور و کم زور کی عالمی کش مکش نے دو عالمی جنگوں کو بنیاد فراہم کی۔ یورپ میں سرمایہ داری نظام پر تنقید و اصلاح کی نئی مباحث کا آغاز ہوا اور نچلے طبقات کے مسائل کا تجزیہ کیا جانے لگا۔ اشتراکیت و اشتمالیت ان ہی مباحث کا نتیجہ ہے۔ آزاد خیالی، روشن خیالی، انسان دوستی اور دیگر عقلیت پسندی کی تحریکوں کے علاوہ بیسویں صدی میں کارل مارکس کے نظریات اور رومانویت پسندی کے رجحانات کے ساتھ ساتھ وجودیت اور جدیدیت کے اثرات بھی ہندوستانی فکر پر گہرے مرتب ہوئے۔

متوسط طبقات کے ہندوستانی ادیبوں اور شاعروں کو یورپ کی رومانویت، ترقی پسندی، حقیقت نگاری اور مارکسی نظریات کے علاوہ فرائیڈ کے نفسیاتی تصورات نے متاثر کیا مگر انگریزی سامراجیت کی جبریت اور اپنی اقدار و روایات کی منہدم ہوتی بنیادوں نے ایک نئی فکری راہ دکھائی۔

نفسیاتی تناظر

انسانی ذہن، اعمال و افکار، جذبات و احساسات اور شعور و لاشعور کا مطالعہ نفسیات کی بنیاد بنا۔ فرائیڈ کی تحلیل نفسی کی دریافت نے نفسیاتی عوامل کا سراغ لگایا۔ یوں تو لاشعور کی دریافت کا تعلق ۱۷۰۰ء سے ۱۹۰۰ء تک دو صدیوں کے ارتقاء کا نتیجہ ہے مگر لاشعور کے تشکیلی عناصر کی دریافت اصل کارنامہ تھا۔ اس کی بدولت ذہن انسانی مادی شے کی طرح قابل مطالعہ بنا۔ فرائڈ سے پہلے لاشعور کا استعمال گوئٹے، ورڈورتھ اور کولرج کے ہاں شاعرانہ وجدان کی صورت میں ملتا

ہے۔کولرج چوں کہ شاعری اور فلسفے پر گہری نظر رکھتا تھا اس لیے وہ اپنے فن پاروں میں شعور اور لاشعور کے احساس سے پوری طرح آگاہ تھا۔

> کولرج کی تحریروں میں جدید نفسیات کے کئی تصوّرات اپنی ابتدائی خام یا مجمل صورت میں ملتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ کولرج میں زیادہ گہرائی تھی اسے فلسفے کا رچا ہوا شعور تھا(۴)

کولرج کی طرح گوئٹے بھی لاشعور کے تصور سے آگاہ تھا لیکن وہ ان دونوں کی تفریق کا قائل نہ تھا اور شعور و لاشعور کو ایک ہی وقوعے کے دو پہلو قرار دیتا تھا۔لاشعور کی گہری دل چسپی کا سراغ یونگ نے فاوسٹ کے دوسرے حصّے کی تشریح کے دوران لگایا۔اسی طرح شلیر کی لاشعوری آگہی اس امر کی وضاحت کرتی ہے کہ فرائڈ سے قبل شعور اور لاشعور کا شعور موجود تھا مگر فرائڈ کا کارنامہ انسانی ذہن کا سائنسی تجزیہ تھا۔اس نے پہلی مرتبہ اس بات کی وضاحت کی کہ انسانی اعمال اور ان کے ذہنی محرکات میں علّت و معلول کا رشتہ قائم ہوتا ہے اور انسان کا ہر شعوری عمل لاشعوری محرکات کا مرہون منت ہوتا ہے۔اس کے نزدیک جنس انسانی اعمال کا طاقت ور محرک ہے اور جنسی خواہشات کو دبانے سے نفسیاتی الجھنوں کی راہ ہم وار ہوتی ہے۔اس کی بدولت فرد اور معاشرہ بری طرح متاثر ہوتا ہے۔فرائڈ نے جب لاشعور کے نظریے کو علمی بنیادوں پر استوار کیا تو دیگر انسانی علوم کی مانند ادب بھی اس کے نظریات سے متاثر ہوا۔اسے چوں کہ ادب سے گہری دل چسپی تھی اور وہ شکسپیئر کا نہ صرف حوالہ دیتا تھا بل کہ ایڈی پس الجھاؤ کی اصطلاح بھی یونانی ڈرامہ نگار صفوکلیز کے ایک المیہ ڈرامے کے مرکزی کردار "ایڈی پس" سے مستعار ہے۔اس کے علاوہ اس کے پسندیدہ ادیبوں میں روسی ناول نگار دوستوئفسکی پر بھی ایک مقالہ ملتا ہے۔فرائڈ نے ادب سے گہری عقیدت کا اظہار اس لیے بھی کیا کہ اسے تحلیل نفسی کے لیے منتخب مثالیں اور اصطلاحیں ادب سے ہی میسر آتی تھیں۔ایک معالج کے طور پر انسانی ذہن کے مطالعے میں اسے محسوس ہوا کہ ادب پاروں میں لاشعوری محرکات پوری شدت سے موجود ہوتے ہیں اور نفسیاتی مریضوں کی الجھنیں ناول کی مانند ہوتی ہیں۔اس نے ناول نگار بننے کی خواہش کے علاوہ ادیبوں اور ان کے فن پاروں کی نفسی چھان پھٹک بھی کی۔ فرائڈ نے نفسیاتی تنقید کو نئی سمت دکھائی۔اس کی تحقیق کی مطابق افسانوں اور قصّوں میں مہم جو ہیرو کی مہمات دراصل ان کے تخلیق کاروں کی تشنہ خواہشات ہوتی ہیں۔اس طرح ہیرو کا باطنی مطالعہ مصنف کا داخلی مطالعہ ہوتا ہے۔

فرائڈ کے علاوہ ایڈلر نے انسانی زندگی کو تین نفسیاتی جہتوں میں تقسیم کیا۔زندگی کی ان جہتوں میں پہلا قدم شعور کے طبعی قوانین کو حاصل ہے۔جس کی زیر اثر زندگی رواں دواں ہوتی ہے۔سماج کی ضروریات اور روایات کا احترام دوسرا

درجہ اور تیسرا درجہ جنسی تفریق ہے جس کی وجہ سے نفسیاتی الجھنیں پیدا ہوتی ہیں۔فرد طبعی قوتوں کی طاقت و ہیبت کے سامنے خود کو کم زور اور بے بس تصور کر کے احساس کم تری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ پیدائش کے ساتھ ہی خوراک کا حصول اور احساس تحفظ فرد کو اندر سے کم زور کرتے ہیں اور خاندان و سماج کے بالغ افراد کا اثر و رسوخ، تجربات، طاقت اور مداخلت ایک نئی احساس کم تری کی راہ ہم وار کرتی ہے۔فرد عمر بھر احساس کم تری کو احساس برتری میں بدلنے کی کوشش جاری رکھتا ہے۔اپنی کوشش میں ناکامی فرد کو خیالی دنیا کی راہ دکھاتی ہے جہاں زندگی کا ہر فعل اس کے ذاتی قبضے اور حکم کے تابع ہوتا ہے۔ یہ امر کہ فرد اپنے احساس کم تری سے نجات کے لیے کون سا ذریعہ اختیار کرتا ہے وہ راستہ ہی فرد کے مستقبل میں تعمیر و تخریب کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

ہمارے اعمال صرف خارجی عوامل اور داخلی تحریکات کے ردعمل کے طور پر ظاہر نہیں ہوتے بل کہ یہ اس مقصد کی نسبت سے منطبق ہوتے ہیں جن کا حصول ایک فرد اپنی زندگی کا لاشعوری آدرش قرار دے لیتا ہے۔ایڈلر ہمارے طریق کار کو ایک ہیولی قرار دیتا ہے۔ ہر وہ نفسیاتی تجربہ خواہ وہ ایک ہی تصور ہو یا جذبہ جو اس ہیولی سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتا ہم اسے اپنی زندگی میں قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔اس طرح خارجی عوامل صرف انھی کا عمل قبول کرتے ہیں جو ہمارے آدرش اور ہمارے لائحہ عمل سے ہم آہنگ ہوں۔ یہ آدرش بالعموم وقت اور اقتدار کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں اور انسان کا عمل یہاں اشتراک عمل کے بجائے اکثر جارحانہ ہوتا ہے۔دراصل معاشرہ فطرت کے مقابلے میں انسان کی انفرادی کم زوریوں کا ایک حل ہے۔

یونگ ایڈلر کی نسبت زیادہ وسیع النظر اور بلند پایہ فلسفیانہ نقطہ نظر پیش کرتا ہے۔وہ ذہن کو ایک متحرک قوت قرار دیتا ہے۔اس کے مطابق انسانی اعمال ذہن میں وقوع پذیر ہوتے ہیں۔یونگ نے شخصی لاشعور کے بجائے اجتماعی لاشعور کا تصور پیش کیا۔اجتماعی لاشعور میں انسانیت کے تمام تجربات کا حاصل ہوتا ہے۔وہ نفسیاتی عوامل میں فکر، جذبے اور احساس کے ساتھ وجدان کا قائل تھا۔یونگ واہمے کی تخلیقی اہمیت کی مدد سے لاشعور کی وضاحت کرتا ہے۔انسان کا اجتماعی لاشعور مسلسل فرد کے انفرادی اعمال پر اثر انداز ہوتا ہے۔اس کے نزدیک لاشعور کی زبان حسّی تصورات ہیں اور یہی حسّی تصورات شاعری و فکشن میں فن کار کے داخل کا اظہار کرتے ہیں۔فرائیڈین نظریات میں فرد کی ذہنی کش مکش، لاشعوری محرکات کا تعین، احساس کم تری اور اجتماعی لاشعور کے انسانی شخصیت پر پڑنے والے اثرات کمال کو پہنچے ہوئے ہیں۔مگر ان کے علاوہ سماج و فرد کے باہمی تعلق اور اس کے نفسیاتی اثرات کیون ہارنی اور ایرخ فروم نے تلاش کیے۔ان دونوں نے فرائڈ کے نظریات میں حیاتیاتی تقاضوں کی بنیاد پر اعتراضات اٹھائے۔ان کے خیال میں فرائڈ انیسویں صدی کے

میکانکی تصور حیات سے بری طرح متاثر تھا اور اس پر ڈارون کی فکر کے اس قدر اثرات تھے کہ اس نے شخصیت کی تشکیل کے دیگر عناصر کو پس پشت ڈال دیا۔

کیون ہارنی اور ایرک فروم نے خارجی عوامل کا گہرائی سے جائزہ لیا جو فرد کی داخلیت کو متاثر کرتے ہیں۔ دونوں نے فرد کو مجبور محض کے بجائے شخصیت کے داخلی و خارجی اثرات کو نمایاں اہمیت دی۔ ان دونوں ماہرین نے انسانی تہذیب کے ارتقاء کا مطالعہ کرتے ہوئے انسانی صورت حال، بے بسی، بے چارگی اور احساس تنہائی جیسے خارجی عوامل کو وضاحت سے بیان کیا جو فرد کی نفسیاتی الجھنوں کا باعث بنتے ہیں۔ ایرخ فروم نے اخلاقی انحطاط اور اخلاقی اقدار کے زوال کو انسانی بے چینی اور احترام آدمیت کی گراوٹ کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے سرمایہ دارانہ نظام میں اس کی جڑیں تلاش کیں۔

مقصدیت، انسانی شعور اور آزادی کا جو رجحان فرائڈ اور اس کے معاصرین میں ہلکی لہر کی صورت میں نمودار ہوا اس کا اظہار انسان کی آزادی کے قائل دیگر مکاتب فکر میں شدت سے ظاہر ہوئے۔ گیسٹالٹ اور لیون نے دلائل سے فرد کی آزادی کو اجاگر کیا اور یہ ثابت کیا کہ فرد اور ماحول میں ایک جیسی توانائی موجود ہوتی ہے یہ دونوں یکساں قوت سے ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس مکتبہ فکر سے وابستہ دیگر ماہرین نفسیات نے انسان کے اندر حقیقت کی تلاش کے کئی پہلوؤں کی نشان دہی کی ہے۔ وارتھ مائیر کے مطابق انسان ہمیشہ روشنی میں سفر کرتا ہے اور اندھیرے میں روشنی کی تلاش کے لیے جزو کے بجائے کل پر انحصار کرتا ہے۔ گیسٹالٹ مکتبہ فکر نے انسان کو ایک باشعور اور با مقصد ہستی تسلیم کروانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ ان کے نزدیک فرد ماحول سے متاثر ہونے کے بجائے زیادہ قوت سے ماحول کو متاثر کرتا ہے۔

نفسیات کے جدید مکتبہ فکر میں وجودی تحلیل نفسی نے ادب اور نفسیات دونوں کو متاثر کیا۔ سارتر نے فرائڈ کی تحلیل نفسی پر شدید اعتراضات اٹھائے۔ اس کے نزدیک سائیکی کا عمل ہم زمان و ہم مکان شعور پر مبنی ہے اور لبیڈو کا متبادل فرد کی اپنی ہستی کے انتخاب پر منحصر ہے۔ اس نے جبریت کے بجائے مقصد حیات کو زیادہ اہمیت دی۔ فرائڈ کے لاشعور کے بجائے اس نے انسان کی خود فریبی اور دھوکا دہی کی صورتوں کا ذکر کیا جن کے تحت انسان عملی مسائل سے جان بوجھ کر روگردانی کرتا ہے۔ وجودی تحلیل نفسی کو وسعت دینے میں کولن ولسن نے کلیدی کردار ادا کیا۔ اس نے انسان کی داخلی اور خارجی الجھنوں اور کرب والم کو نفسیاتی اور تاریخی حوالوں سے جانچا۔ اس نے فلسفہ اور نفسیات میں نئی وجودیت کی بنیاد رکھی۔ اسی عہد میں سمون دی بوائر نے عورت کی نفسیات، اس کی الجھنوں اور سماجی مرتبے کا تعین کیا اور "دی سیکنڈ سیکس" کے نام سے ایک شہرہ آفاق کتاب لکھی۔

جدید نفسیات نے افسانوی ادب میں نئے رجحانات کو جنم دیا۔ان رجحانات میں "شعور کی رو" بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔اس کا پہلا براہ راست اثر ورجینا وولف نے محسوس کیا اور فکشن میں تکنیکی تبدیلی کی صلاح دی۔اس کا براہ راست اثر اردو فکشن پر پڑا۔حسن عسکری،قرۃ العین حیدر اور احسن فاروقی نے اسے عمدگی سے برتا۔اس طرح اردو ادب میں کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ شروع ہوا اور سماج کے مختلف طبقات پر خارجی جبریت کے عوامل کی تلاش شروع ہوئی جس نے طبقاتی نفسیات کی راہ ہموار کی۔

ہندوستانی ادیبوں پر دیگر خارجی اثرات کے ساتھ ساتھ معاشی تبدیلیوں کا بھی گہرا اثر ہوا۔اس علاقے کی معاشی صورت حال کو بدلنے میں انگریزی دور حکومت خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کی بدولت بننے والی حکومت نے مقامی صنعت وتجارت کا ڈھانچہ بدل دیا۔انگریزی تعلیم یافتہ ہندوستانی طبقے نے یورپی نظریات وافکار اور سیاسی ومعاشی شعور کے زیر اثر قوم پرستی کی تحریک چلائی تو اس بات کو بے نقاب کیا کہ انگریزی راج معاشی لوٹ گھسوٹ اور دولت کے ناجائز حصول پر مبنی تھا۔انگریزوں نے مقامی صنعت ووسائل کو بری طرح لوٹ کر آبادی کو معاشی مسائل میں مبتلا کیا لہذا ہندوستان کی کامل آزادی اور وسائل پر مقامی قبضہ ہی بہتر مستقبل اور معاشی مساوات کا ضامن ہو سکتا ہے۔

انگریزوں سے قبل ہندوستانی سماج سیاسی انتشار کا شکار ضرور رہا مگر معاشی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔اس کے خود مختار صوبوں میں بڑے بڑے تجارتی مراکز قائم تھے جہاں ملکی اور غیر ملکی مال آتا تھا جس کی وجہ سے مقامی آبادی قدرے بہتر زندگی بسر کر رہی تھی۔اس دور میں مقامی صنعتوں میں کپڑے کی صنعت ترقی کے عروج پر تھی مگر انگریزی راج نے معاشی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کیں اور ترقی کو طے شدہ منصوبے کے تحت روک کر معاشی مسائل پیدا کیے۔مقامی صنعت کے زوال میں انگریزوں کے مفادات اور ترقی مضمر تھی:۔

> اگر ہندوستان کی یہ معاشی سرگرمیاں جاری رہتیں اور ان میں کوئی رکاوٹ نہ آتی تو ہندوستان جاگیردارنہ دور سے نکل کر سرمایہ داری کے زمانے میں داخل ہو جاتا،کیوں کہ اس کے معاشی نظام میں جو تبدیلیاں آ رہی تھیں اور اس میں جو صلاحیتیں پنہاں تھیں وہ اس تبدیلی کے عمل کو تیز کر رہی تھیں (۵)

انگریزوں نے معاشی ترقی کو نہ صرف روکا بل کہ مقامی صنعت کی بربادی کے ساتھ اس ملک میں جاگیرداریت کو فروغ دیا۔اس عہد میں برطانوی معاشرہ خود جاگیرداریت سے نکل کر سرمایہ داری دور میں داخل ہو رہا تھا۔ایسٹ انڈیا

کمپنی مقامی خام مال کو طاقت اور لوٹ گھسوٹ سے سستے داموں خرید رہی تھی۔ انھوں نے ہندوستان کے با اثر لوگوں میں زمینیں اور جائیدادیں تقسیم کر کے نہ صرف ذرائع پیداوار پر اپنا قبضہ بحال رکھا بل کہ معاشرے کو مزید پس ماندگی کی راہ دکھائی:۔

> ہندوستان کے مورخوں نے اس موضوع پر تفصیل سے تحقیق کی ہے اور کولونیل دور کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ اس عہد میں ترقی کے بجائے ہندوستان کئی لحاظ سے پسماندہ رہا۔ مثلاً جب انگلستان میں صنعتی انقلاب آیا تھا، تو اس وقت برطانوی حکومت ہندوستان میں یہاں کی صنعتوں کو ختم کر کے سماج کو غیر صنعتی بنا رہی تھی۔ جہاں اپنے ملک میں وہ فیوڈل ازم کو کمزور کر رہے تھے، وہاں ہندوستان میں اس کی سرپرستی کر کے اسے مضبوط ادارہ بنا رہے تھے(۶)

ہندوستان پر قبضے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس بات کو ممکن بنایا کہ مقامی تاجر اور کاری گر اپنا مال صرف کمپنی کو فروخت کریں۔ جس کی قیمت انتہائی کم مقرر کر کے کاری گروں اور مزدوروں کو کمپنی کی ملازمت پر مجبور کیا گیا۔ کمپنی نے موروثی جاگیرداروں کے ایک مخصوص طبقے کو مراعات یافتہ بنا کر ہر طرح کی بغاوت کو کچلا۔ اس نے تحائف، نجی تجارت، رشوت اور ٹیکسوں کی مد میں لوٹ مار سے دولت برطانیہ منتقل کی جس سے وہاں نوابوں کا ایک طبقہ پیدا ہوا جس نے وہاں کی سیاست میں شرکت کر کے ہندوستانی تجارت کی تباہی کے قوانین مزید سخت کیے۔ اسی لیے کپڑے کی مقامی صنعت پر پابندی عائد کر کے برطانوی کپڑے کو ہندوستانی منڈیوں میں متعارف کروایا گیا۔

انگریزوں کے ہندوستان میں معاشی اور معاشرتی اقدامات کا اثر مقامی ادب و فن پر بھی پڑا۔ مقامی آبادی کی شکست و ریخت نے ان کے جذبات و احساسات کو بری طرح متاثر کیا۔ ہر ادیب اور تخلیق کار اپنے سیاسی، سماجی، معاشی اور نفسیاتی رجحانات اور رویوں سے گہرا اثر قبول کرتا ہے کیوں کہ اس کے فکری روّیے اسی عہد سے متاثر ہو کر پروان چڑھتے ہیں۔ غلام عباس کی فکری و ادبی تربیت کا عہد ہندوستان میں بیسویں صدی کے اوائل سے تعلق رکھتا ہے۔ اس عہد میں ایک طرف روایتی ادب تخلیق ہو رہا تھا جس پر مقامی روایت کے گہرے اثرات تھے تو دوسری طرف برطانوی سامراجیت سے درآمد شدہ نئے افکار و خیالات اور رجحانات پروان چڑھ رہے تھے جس کا اثر ادیب اور شاعر قبول کر رہے تھے۔ اردو ادب میں ایک طرف انگریزی سرپرستی کے زیر اثر اردو کے ادبی تسلسل سے مختلف ادب تخلیق ہو رہا تھا تو دوسری طرف غزل کی روایت برطانوی فکری روایت کے خلاف شدید نوعیت اختیار کر رہی تھی۔

لاہور جو نہ صرف پنجاب کا مرکز تھا بل کہ پنجابی زبان کی ترویج میں خصوصی مقام رکھتا تھا وہ ۱۸۵۷ء کے بعد پنجابی شاعری سے الگ ہو کر اپنی پہچان بنانے والے تخلیق کاروں کا مرکز بن گیا۔ غلام عباس کی ادبی سرگرمیاں "پھول" اور "تہذیب نسواں" اسی ادبی و فکری روایت کا لازمی جزو بن کر سامنے آئیں۔ غلام عباس کے فکری رویوں کو ہندوستانی قدیم ادب، تحریکوں، رجحانات اور سرسید کی عقلیت نے بھی متاثر کیا۔ بیسویں صدی کے دو ابتدائی عشروں میں اردو افسانے پر عقلیت کا گہرا اثر رہا۔ عقلیت کی تحریک کا ردعمل رومانویت کی صورت میں ظاہر ہوا اور سجاد حیدر یلدرم نے اسے کمال مہارت سے برتا۔ بیسویں صدی میں انگریزی، روسی، فرانسیسی، ترکی اور دوسری زبانوں کے تراجم شائع ہوئے جن کی بدولت اردو کے افسانہ نگار افسانے کے فن کی نزاکتوں کی جانب متوجہ ہوئے نیز ان کے زیر اثر افسانوں میں حقیقت نگاری کا چلن ہوا۔ اس حقیقت نگاری کا اظہار پریم چند کے ہاتھوں پروان چڑھا گویا:۔

> اس حقیقت سے انکار نہیں کہ پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم دونوں بڑے فنکار تھے۔ انھی دونوں کے ذریعے اردو مختصر افسانوں کے دو اسکول قائم ہوئے۔ پریم چند نے ادب برائے زندگی کی علمبرداری کر کے افسانوں میں حقیقت نگاری کے جلوے بکھیرے اور یلدرم نے رومان پرستی کے ذریعہ افسانوں میں ادبی لذت کی صورت پیدا کی۔ جہاں پریم چند نے زندگی کے مسائل کو موضوع بنایا وہیں یلدرم نے ترش و تلخ زندگی سے ہٹ کر ایک خواب آگیں فضاء سے اپنے افسانوں کو معمور کیا (۷)

اردو افسانے میں حقیقت اور رومان کے دبستانوں سے پورا ایک عہد متاثر ہوا۔ ۱۹۳۲ء میں معاشی اور نفسیاتی الجھنوں کے ساتھ مارکسی نظریات کی جھلک محمد مجیب کے افسانوی مجموعہ "کیمیہ گر" کی بدولت ابھری۔ اس کے بعد ۱۹۳۲ء ہی میں "انگارے" نے افسانوی ادب میں ایک نئی ہلچل پیدا کر دی۔ "ان میں مارکسزم اور فرائڈازم کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں" (۸) مارکسزم کے ذریعے اردو افسانے میں معاشی مسائل کو موضوع بنایا گیا اور فرائڈازم کی بدولت جنس کا نہ صرف ایک نیا دبستان ظاہر ہوا بل کہ معاش اور جنس کی جبریت کے نفسیاتی اثرات بھی تلاش کیے جانے لگے۔ اس طرح افسانہ نگاروں نے دلیری اور بے باکی سے طبقاتی نفسیات کو فن کے سانچے میں ڈالا۔ غلام عباس کی افسانہ نگاری کے پس منظر میں روسی ادب کے تراجم، حقیقت نگاری، انگارے کی اشاعت، مارکسزم اور فرائڈازم کے اثرات، ترقی پسند تحریک کی حقیقت پسندی، رومان پسندی، لاہور کی ادبی فضاء، پھول اور تہذیب نسواں کی سادہ بیانی نے ان کے طبقاتی اور نفسیاتی شعور کو پروان چڑھنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔

غلام عباس کی افسانہ نگاری میں معاصر عہد کی جھلک

غلام عباس اپنے عہد سے گہری مطابقت رکھتے تھے۔ان کے فکری رجحانات اور رویّے اپنے ہی عہد کی فضاء میں پروان چڑھے تھے۔اپنی سماجی اور طبقاتی بصیرت سے انھوں نے اپنے عہد کی ترجمانی کا منفرد حق ادا کیا۔بیسویں صدی کے اوائل کا ہندوستانی معاشرہ نو آبادیاتی استعماری صورت حال میں قدیم و جدید کی آویزش اور قدیم فکری رجحانات کی پس پائی سے گزر رہا تھا۔اسی منظر نامے کا حصہ ہوتے ہوئے غلام عباس اپنی ماں، نانی اور نانی کی بہن سے روایتی کہانیوں کے تناظر میں قدیم روایت سے اپنا تعلق بحال رکھے ہوئے تھے۔"عباس کی نانی کا انتقال بھی ان کے بچپن ہی میں ہوا تھا لیکن نانی کی بہن عباس کو ہمیشہ فارسی قصے اور داستانیں سناتی رہتی تھی"(۹) دوسری طرف خود کہانی بیان کرنے کا منفرد رنگ روسی فکشن سے سیکھا۔ابتدائی دور میں لاہور کی ادبی فضاء نے آسکر وائلڈ اور ٹیگور کی رومانیت کی طرف رغبت دلائی تو دوسری طرف رفتہ رفتہ معاصر سماجی شعور نے حقیقت نگاری کی راہ ہموار کی:۔

> اس زمانے میں ٹیگور ہمارے ذہنوں پر چھائے ہوئے تھے۔ٹیگور اس دور میں بہت اچھے لگتے تھے کیونکہ ان کی تحریروں میں تھوڑی سی رومانیت ہوتی تھی۔۔۔اس کے بعد ہمارے مطالعے میں روسی افسانے کی آمیزش شروع ہوئی (۱۰)

ان کو اپنی افسانہ نگاری میں رومانیت کا انداز زیادہ پسند نہ آیا اور وہ اس طرز سے جلد اکتا گئے۔اس قبیل کے افسانوں میں "مجسمہ" اور "محبت کا گیت" قابل ذکر افسانے ہیں جن میں حسن و عشق اور رومانی انداز نمایاں ہے۔غلام عباس کو اپنے یہ دونوں افسانے زیادہ پسند نہ آئے اسی لیے ان کو کسی مجموعے میں شامل نہیں کیا گیا۔انھوں نے حقیقت نگاری کا سفر ترقی پسند تحریک کے زیر اثر شروع کیا۔لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ بقول ڈاکٹر شفیق انجم انہوں نے عصری حالات اور واقعات سے گہرا اثر قبول کیا۔خصوصاً ترقی پسند تحریک سے۔انھوں نے اپنے ایک انٹرویو میں تسلیم کیا کہ "میں نے اپنے آپ کو ترقی پسند تحریک کا ادیب کہلوانا پسند نہیں کیا لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ اس تحریک نے سب کی افسانہ نگاری پر اثر ڈالا ہے"(۱۱)

غلام عباس کے افسانے اپنے عہد کی تخلیقی روایت سے ابھر کر سامنے آتے ہیں۔اپنے عہد سے گہری وابستگی اور سماجی شعور سے ان کا طبقاتی اور نفسیاتی شعور پروان چڑھا۔ان کے افسانوں میں اس عہد کی سماجی اور طبقاتی زندگی کا منفرد اظہار معاشرتی حقائق کا ٹھوس عکس بن کر سامنے آتا ہے۔ان کی کہانیوں سے یہ حقیقت ابھرتی ہے کہ ان کے ہاں معاصر عہد کے معاشرتی و معاشی مسائل افسانوں کے موضوعات کی صورت بن کر اظہار کی راہ پاتے ہیں۔وہ نظام اقدار کی

کیفیت، طبقاتی تفریق، غربت وافلاس اور ایک نئے نظام کے قیام سے پوری طرح آشنا تھے۔ ناداری وافلاس کے انسانی رویوں، جذبات واحساسات اور اندر کی شکست وریخت میں کارفرما اثرات کی حقیقی تصویریں ان کے ہاں نظر آتی ہیں۔

زندگی کا گہرا شعور رکھنے کی بدولت وہ اپنے عہد سے ٹکراؤ کے بجائے سماجی خارج سے انسانی داخل پر حملے سے گریز کرتے ہوئے ہمیشہ داخل سے خارج کی طرف بڑھتے ہیں۔ ان کی ہمہ گریت، تنوع اور ندرت اس خاص فضاء کی پیداوار ہے جو افسانوں کے خارج میں لاشعوری طور پر تشکیل پا کر افسانے کو وسیع تر سماج کا جزو بنا دیتی ہے۔ غلام عباس اپنے عہد کی معاشی، جنسی، سماجی، سیاسی اور طبقاتی جبریت کی بدولت پیدا ہونے نفسیاتی الجھنوں کو اپنے افسانوں میں کمال مہارت سے بیان کرتے ہیں۔ اس طرح ان کے افسانے ہمارے سماج کی گزشتہ نصف صدی کے ذہنی، جذباتی، معاشرتی، تہذیبی اور فکری رجحانات کا آئینہ ہیں۔ ترقی پسند تحریک کی حقیقت نگاری اور مارکسزم کے اثرات کے زیر اثر غلام عباس کے افسانوں میں معاشی جبریت اور اس کے نفسیاتی اثرات خصوصیت سے محسوس ہوتے ہیں:۔

> نو آبادیاتی نظام کی یلغار اور سرمایہ داری کی مضبوط ہوتی گرفت کے اندر سسکتی انسانیت کا انھوں نے بہت قریب سے مشاہدہ کیا۔ وہ بے شک اپنے آپ کو ترقی پسند نہ کہیں لیکن ان کے افسانوں پر ترقی پسندی کے گہرے اثرات ہیں۔ عام انسانوں کی حالات زار اور حالات کے جبر کا شکار غریب طبقے کی عکاسی جس طرح ان کے افسانوں میں ملتی ہے اس کے پیش نظر ان کا شمار سکہ بند ترقی پسندوں میں کیا جا سکتا ہے (۱۲)

غلام عباس کے اکثر کردار معاشی جبریت کا شکار ہیں اور معاشی الجھنوں میں بری طرح الجھے ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنے عہد کے معاشی احوال کا علامتی اظہار کلرک کے کردار کی صورت میں کیا ہے جس کی بنیادی الجھن معاشی چکر ہے۔ ان کے ہاں معاشی مسائل کے نفسیاتی اثرات کی کرداروں میں تلاش منفرد کام ہے۔ "ایک بے بس یا کم نصیب آدمی کی علامت کے طور پر" کلرک" کا کردار پیش کیا گیا ہے" (۱۳) ان کے افسانوں میں ان کے عہد کی معاشی الجھنیں پوری آب وتاب سے نظر آتی ہیں۔ "آنندی" میں طوائفوں کا اصل مسئلہ معاشی بدحالی ہے۔ اس طرح "کتبہ" کا شریف حسین طبقاتی سماج میں پستا ہوا ایک ایسا کردار ہے جہاں معاشی الجھنیں خوابوں کے ٹوٹنے کا المیہ بن کر ظاہر ہوتی ہیں۔ "اوور کوٹ" میں غربت اور تنگ دستی کو اوور کوٹ سے ڈھانپنے کی ناکام کوشش دراصل پورے عہد میں لاچار اور بے بس زندگی کا استعارہ بن کر ظاہر ہوتی ہے:۔

غلام عباس نے اپنے عہد کی منافقتوں، مجبوریوں اور معاشی ناہمواریوں پر کہانیاں
لکھیں ہیں اور مسلسل ان موضوعات کو متنوع زاویوں کے ساتھ نقش کرتے رہے۔
ان کے افسانوں میں اپنے عہد کا سماجی شعور موجود ہے۔ معاشرے کے کمزور
پہلوؤں کی عکاسی اور عام انسانوں کی معاشی مشکلات ان کا خاص میدان رہا (۱۴)

انھوں نے اپنے معاصر عہد میں عام انسانوں کی اقتصادی محرومیوں، معاشی بدحالیوں و مایوسیوں کو ہی نہ صرف اپنا موضوع بنایا بل کہ ان مسائل کے نچلے، متوسط اور نچلے متوسط طبقات پر مرتب ہونے والے نفسیاتی اثرات کا منفرد اظہار کر کے کرداروں کی طبقاتی نفسیات کی درست سمت کا تعین کیا۔ وہ اپنے عہد میں معاشرتی و معاشی جبریت کا منفرد اور متنوع اظہار کرتے ہیں۔ ان میں غریبوں کا استحصال، دوسرے کے جذبات کا خون، مظلوموں اور زیر دست طبقات کو اپنے مذموم مقاصد کے لئے استعمال کرنا، دوسروں کے حقوق پر قبضہ اور عزت نفس کو مجروح کرنا شامل ہے۔ ان تمام جابرانہ اشکال کی نوعیت خواہ سیاسی، سماجی، جنسی یا معاشی کوئی بھی ہو، ان کے فکر وفن میں معاصر عہد کی ان اشکال کے طبقات پر مرتب ہونے والے نفسیاتی اثرات نظر آتے ہیں۔ سماجی جبریت کے ضمن میں حسن نوشاہی لکھتے ہیں:۔

ان کے اکثر افسانے سماجی جبر کی چکی میں پسنے والے وہ طبقات ہیں جن کے ارمان
سماجی ناہمواریوں کے سمندر میں غرق ہو جاتے ہیں، ظلم کی طوفانی موجیں بپھرتے اور
چنگھاڑتے ہوئے ان کا سب کچھ بہالے جاتی ہیں (۱۵)

"کتبہ" کا شریف حسین، "چکر" کا چیلا رام، "بحران" کا پروفیسر سہیل، "آنندی" کی طوائفیں، "بردہ فروش" کی ریشماں، "سرخ گلاب" کی کاکی، "سیاہ سفید" کی میمونہ اور "کن رس" کا فیاض سماجی جبر کی مختلف صورتیں اور ان کے نفسیاتی اثرات کا اظہار ہیں۔ اس کے علاوہ سماج کے اندھے قوانین، بدنصیبیاں، خاندانی اونچ نیچ کو برقرار رکھنے کی ہوس، خواہشات اور جذبات کی قاتل خود ساختہ پابندیاں، اشراف کی ریاکاری، منافقت، جھوٹے بندھن، توہم پرستی اور سماج کے کھوکھلے احساسات خارجی حاکمیت بن کر کرداروں کی نفسیات کو مرتب کرتے ہیں۔

نچلے اور متوسط نچلے طبقات پر سماجی و معاشی جبریت کی طاقت، خواہشات، ضروریات، جذبات، احساسات اور شدت ان طبقات کے کرداروں کو سسک سسک کر مرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس کی بدولت جنم لینے والی ذہنی اذیت انسانوں کو ہزاروں کے ہجوم میں تنہائی کا تاثر ابھار کر داخلیت کی طرف دھکیلتی ہے جہاں انسان لاشعوری طور پر دوسروں کی خواہشات اور مقاصد کے زیر اثر زندگی بسر کرتا ہے۔

غلام عباس نے اپنے عہد کی عکاسی کے لیے طبقات کے معاشی اور معاشرتی استحصال کے ساتھ ساتھ اس جنسی نا آسودگی کا بھی ذکر کیا ہے جو ان کے عہد کا بالواسطہ نتیجہ تھا۔ ترقی پسند تحریک کی بدولت جنس کو خاص اہمیت دی گی لیکن غلام عباس نے سماجی و معاشی جبریت کے باعث وقوع پذیر ہونے والی جنسی نا آسودگی کے نفسیاتی اثرات کو زیادہ اہمیت دی۔ "اس دور کے افسانوں میں جنس مقبول ترین فیشن تھا۔ اس دور کا کوئی افسانہ نگار جنس نگاری کی وبا سے محفوظ نہ تھا" (۱۶) انھوں نے فنی اور اخلاقی حدود کے اندر جنس کو کبھی جبلی تقاضوں، کبھی معاشی جبریت اور کبھی طبقاتی قوت کے نفسیاتی اثرات سے جگہ دی ہے۔ ان کے افسانوں میں جنس کا موضوع مسائل اور نفسیاتی الجھن کے باوجود جذباتیت سے گریز کی سمت سفر کرتا ہے۔ "غلام عباس نے طوائف کے بارے میں کئی عمدہ افسانے لکھے، لیکن ان میں سے کسی میں بھی جنس کا کھلا تذکرہ نہیں ہے" (۱۷) ان کے ہاں جنس کے حوالے سے عورت کا استحصال مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ انھوں نے طوائف کے موضوع پر "آنندی"، "اس کی بیوی"، "سمجھوتہ"، "بردہ فروش" "ناک کاٹنے والے" "حمام میں" "کن رس" اور "بھنور" جیسے منفرد اور شاہکار افسانے تخلیق کیے۔ اس کے علاوہ "سرخ گلاب" "سایہ" "ہمسائے" "غازی مرد اور "تنکے کا سہارا" میں بھی مرد اور عورت کے فطری تعلق کی نا آسودگی کے نفسیاتی الجھاؤ کو بیان کیا ہے۔ غلام عباس اپنے معاصر ترقی پسند حقیقت نگاروں کی جنسی جذباتیت کے برعکس مرد اور عورت کی فطری کشش اور سماجی و طبقاتی قوانین کی بندشوں کے نفسیاتی اثرات کو نمایاں کر رہے تھے۔

انھوں نے مردانہ کرداروں کی حیوانی خواہشات کی تکمیل کے لیے مذہب اور معاشرتی رسوم و دباؤ کا سہارا لے کر عورت کے محافظ اور نگہبان بنے والے رجحان کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ ان کی عورت ایک مکمل اور طاقت ور مرد کے قرب میں لاشعوری سکون کی متلاشی ہوتی ہے۔ ان کے ہاں جنسی محنت کش عورت (Sex Worker) طبقاتی تشدد اور معاشی الجھنوں کی طاقت کے سامنے مجبور ہوتی ہے لیکن لاشعوری قوت اسے ایک مروجہ شریف گھریلو عورت کی سمت سفر پر اکساتی ہے۔ "بردہ فروش" کی ریشماں اپنے عہد کا استعارہ ہے جو طبقاتی سماج کے عیاش بوڑھوں کے مابین جھولنے سے اپنا جنسی سکون تو کھو دیتی ہے مگر ہر گھر میں عورت بن کر رہنا چاہتی ہے۔ اسی طرح "اس کی بیوی" کی نسرین اور "بھنور" کی دونوں بہنیں گل اور بہار حاجی شفاعت احمد خان کی دہلیز پر مروجہ شریف عورت کی تلاش ہی کا سفر کرتی ہیں۔ طبقاتی سماج میں جائز مقام کے حصول کی ناکامی ان کرداروں کو نفسیاتی الجھاؤ میں مبتلا کرتی ہے۔

غلام عباس کے ہاں عورت کی جنسی اعتبار سے سماجی حیثیت کو تلخ حقائق کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ عورت کڑی پابندیوں اور طبقاتی جبریت کی قوت تلے زندگی بسر کرتی ہے لیکن مرد اپنی جنسی تسکین کے حصول کی خاطر آزاد ہے۔

ان کا افسانہ " سمجھوتہ "اس صورت حال کا عکاس ہے۔اس افسانے میں بیوی گھر سے فرار ہونے کے بعد شوہر کے گھر واپسی پر عورت کے مرتبے سے گر جاتی ہے مگر شوہر ہر طرح کی پابندی سے آزاد ہے۔جنس غلام عباس کے ہاں محبت اور جبلت کے نفسیاتی امتزاج کی صورت اختیار کرتی ہے۔ان کی افسانہ نگاری میں محبت صرف ضرورتوں کے زیر اثر پیدا ہونے والی مجبوری ہے:۔

> ان کے ہاں محبت کوئی چیز نہیں،صرف ایک دوسرے کی باہمی ضروریات ہیں جن کے تحت ایک دوسرے کے ساتھ آدمی رہنے کو مجبور ہے۔۔۔اسی مجبوری کا نام ان کے ہاں محبت ہے۔سمجھوتہ میں نہ صرف مجبوریاں ہیں بلکہ ایک اور تلخ حقیقت کی طرف اشارہ ملتا ہے،یعنی عورت کی جنسی اعتبار سے سماجی حیثیت جہاں قوانین اور پابندیاں عورت کے لیے ہیں اور مرد اس سے کسی حد تک مستثنیٰ ہیں(۱۸)

اپنے عہد میں جنس اور جبلت کی طاقت سماجی قوانین و روایات اور خاندانی وقار کی خاطر جذبات کو دبانے کی لاشعوری الجھن "سایہ "میں ریاض اور وکیل صاحب کی بڑی صاحبزادی کے درمیان مشرقی روایات کے کڑے پردے کی بدولت سامنے آتی ہے جہاں وہ بیماری کے عالم میں اپنے قابو کے باوجود سرسام کی گرفت میں لاشعور میں چھپی خواہشات کو سب کے سامنے لے آتی ہے۔

غلام عباس اپنے عہد میں مضبوط ہوتی جہالت،اندھی تقلید اور ضعیف الاعتقادی کے نفسیاتی تشدد کو بھی بے نقاب کرتے ہیں۔"سرخ گلاب "میں جنس کی وحشت کو مذہبی جنون کے ساتھ ملا کر دکھایا گیا ہے۔" کاکی "مردانہ سماج کی ہوس سے حاملہ ہو کر طبقاتی جبر کا شکار ہوتی ہے۔مولے کے اندر بے قابو ہونے والی جنسی قوت اسے چن شاہ ولی کے مزار پر عرس کی مقدس تقریب اور پاکیزہ محفل میں کاکی سے جسمانی تعلق پر اکساتی ہے۔اس جنسی گھٹن کے سامنے کاکی کی مجذوبیت،چن شاہ ولی کی کرامات اور دربار کی حرمت بھی بے بس محسوس ہوتی ہے۔مردانہ حاکمیت اور اندھی تقلید کی گہری چھاپ کاکی پر دوہری جبریت کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ایک طرف وہ مولے کی ہوس کا نشانہ بنتی ہے تو دوسری طرف اس سے ہم دردی کے بجائے طبقاتی سماج کی ضعیف الاعتقادی نہ صرف اسے گاؤں بدر کر کے مزار کی حرمت برقرار رکھتی ہے بل کہ توہم پرستی کے نفسیاتی اثرات کی بھی عکاسی کرتا ہے۔غلام عباس نے اپنے عہد میں عورت اور طوائف کو ایک استعارے کی صورت میں سامنے لایا ہے۔مرد اور عورت کا فطری تعلق،عورت کی سماجی حیثیت میں مردانہ ذہنیت کی اثر پذیری،سماجی پردے اور پابندیاں،جبلت کی قوت،ضعیف الاعتقادی اور معاشرتی دباؤ جیسے جنسی محرکات کی طبقاتی

ونفسیاتی الجھنوں کومتنوع رنگوں سے منظر عام پر لایا ہے۔

غلام عباس اپنے عہد کی سیاسی جبریت اور کش مکش کے بھی نمائندہ تھے۔تقسیم کے بعد دونئی ریاستوں کے عوام میں تقسیم اور بے وطن ہونے کی نفسیاتی شکست و ریخت "لچک"، "اوتار" اور " دھنک" کا موضوع ہے۔"ان دونوں افسانوں کا موضوع تقسیم کے بعد ہندوستان کو "وطن" کے طور پر قبول کرنے والے مسلمانوں پر ہندوؤں کا ظلم وستم ہے"(۱۹)

غلام عباس کا پہلا افسانوی مجموعہ " آنندی" کا پس منظر دہلی کی زندگی ہے۔"ان میں سے ایک آدھ کو چھوڑ کر باقی افسانوں کا تمدنی اور جغرافیائی پس منظر بھی دہلی ہی ہے"(۲۰)ان افسانوں میں تقسیم سے قبل ہندوستانی معاشرے میں انگریزی استعماریت کی وجہ سے پروان چڑھنے والی معاشی ،سماجی وسیاسی،طبقاتی جبریت کے نفسیاتی مسائل بے نقاب ہوتے ہیں۔اسی طرح دوسرا مجموعہ "جاڑے کی چاندنی" میں قیام پاکستان کے بعد نئے وطن کی نئی زندگی اور نچلے ومتوسط طبقات کی گھٹن کا ذکر ہے۔اس عہد میں غلام عباس کی لندن سے واپسی کے بعد کی معاشی الجھن بھی نمایاں ہے۔"بہرحال لندن واپسی پر غلام عباس کو اقتصادی مسئلے کے باعث شدید پریشانی تھی"(۲۱) جب کہ تیسرا مجموعہ " کن رس" پاکستانی سماج کی ظاہری زندگی میں پوشیدہ تضادات اور طبقاتی ڈھانچے کے نفسیاتی کش مکش کا آئینہ دار ہے:۔

> غلام عباس کے افسانوں کے تیسرے مجموعے " کن رس"(۱۹۶۹) میں پاکستانی سماج کی ظاہری حقیقتوں کے اندر موجود گھناؤنے رخوں سے جس بیدردی سے پردہ اٹھایا گیا ہے،خاص طور سے غلام عباس کا افسانہ "جوار بھاٹا" پاکستان کی افسوسناک سماجی (landscape) کے ادنیٰ سے ادنیٰ فرد سے لے کر اعلیٰ سے اعلیٰ طبقے کے افراد کی اخلاقی زبوں حالی کا نوحہ ہے(۲۲)

غلام عباس کے افسانوں میں طبقات اور نفسیاتی مسائل

سماج کی تشکیل طبقاتی بنت سے ہوتی آئی ہے۔معاشرہ مختلف طبقات کا مجموعہ رہا ہے۔طبقہ عموماً افراد معاشرہ کا ایک گروہ ہوتا ہے جو ایک جیسی معاشی صورت حال کے زیر اثر زندگی بسر کرتا ہے۔اس لیے یہ طبقہ اپنے افکار وتصورات کے ساتھ ساتھ مخصوص نفسیات کا بھی حامل ہوتا ہے لہذا اس حوالے سے کرداروں کا مطالعہ سماج کا مطالعہ وتجزیہ بن جاتا ہے۔غلام عباس نے اپنے کرداروں کی مدد سے معاشرے میں موجود مختلف طبقات کا نہ صرف ذکر کیا بل کہ ان طبقات پر معاش،جنس،جنس ومعاش اور قانون وماحول کی جبریت کے نفسیاتی اثرات کا منفرد اظہار کیا۔ان کے ہاں کرداروں کا

زیادہ تر تعلق نچلے، متوسط اور نچلے متوسط طبقات سے ہے:۔

> ان کا خاص میدان متوسط اور نچلے طبقے کے افراد کے داخلی معاملات کی ترجمانی اوران کے خارجی ماحول کی عکاسی ہے۔ان کے بیشتر کردار ناہموار معاشرے کے ستائے ہوئے لوگ ہیں جو الجھنوں اور پریشانیوں کے درمیان ٹامک ٹوئیاں مارتے ہیں(۲۳)

غلام عباس کو عام انسان کا داستان گو کہا جاتا ہے۔اس کی وجہ ان کے ہاں معاشرے کے عام انسانوں کے مسائل پریشانیاں، زندگی کی چھوٹی چھوٹی الجھنوں اور واقعات کا بیان ہے۔ان کے افسانوں میں نچلے اور نچلے متوسط طبقات کے مسائل، الجھنیں، استحصال، سماجی ومعاشی گھٹن اور عدم مساوات کے نفسیاتی مسائل بیان ہوئے ہیں۔چھوٹی عمر کی ملازمت، گھریلو معاشی الجھن، والدہ کی دکان داری اور ناکافی سہولیات کے ذاتی تجربے نے ان کے طبقاتی اور نفسیاتی شعور کو مستحکم کیا۔بقول سویامانے یاسر "عباس کی والدہ نے ایک عزیز کی مدد سے عباس کو سٹیشن کے مال گودام میں ملازمت میں لگایا"(۲۴)

انھوں نے طبقات کی معاشی بدحالی اور عدم مساوات کے بارے میں جذباتی وعظ کے بجائے اصل انسانی سطح اور نفسیاتی آگہی کے مطابق معاش کے طبقات پر نفسیاتی اثرات کو پیش کیا۔غلام عباس کے عہد میں خوش حال طبقات قدرے متوازن اور سکون کی زندگی بسر کر رہے تھے مگر نچلے طبقات پر نوآبادیاتی استعماریت کی گرفت کی روایت اور سرمایہ دار طبقات کی طاقت صورت حال کو جوں کا توں برقرار رکھنے میں کوشاں تھی۔اس لیے ان کے اکثر افسانے دیگر سماجی حقائق کے علاوہ معاشی جبریت کے تناظر میں انسانی نفسیات بیان کرتے ہیں:۔

> بظاہر وہ معمولی کرداروں کی مصوری کرتے کرتے افسانہ شروع کرتے ہیں لیکن افسانے کے آخری سرے بالعموم معاشی جبر سے جا ملتے ہیں۔ان کے ہاں بالعموم نچلا اور متوسط طبقہ موجود ہے،اور ان کے کردار اور اطوار،ان کی معاشی حیثیت کے مرہون منت ہیں(۲۵)

غلام عباس کے افسانوں میں طبقات پر معاشی جبریت کو کسی خاص تہذیب، علاقے، ملک یا عہد تک متعین نہیں کیا جا سکتا۔ان کے طبقات کا معاشی استحصال اکثر اوقات اپنی حدوں میں سمٹنے کے بجائے عالمی کہانی کی صورت اختیار کر لیتا ہے جہاں ان طبقات کی نفسیاتی الجھن وسعت اختیار کر لیتی ہے۔اس صورت حال کا مشاہدہ "فینسی ہیر کٹنگ

سیلون" میں کیا جا سکتا ہے۔ سیلون کا منشی چاروں مالک حجاموں کی غربت ختم کرنے کا معاشی جھانسہ دے کر نہ صرف دکان پر قابض ہو جاتا ہے بل کہ مستقبل کی معاشی تاریکی کے لاشعوری اثرات حجاموں کو منشی کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ آج کے عالمی معاشرے میں غریب اقوام میں غربت، جہالت اور بے روزگاری کے خاتمے کے پس پردہ ان کے وسائل پر قبضے کی سازش ہوتی ہے جہاں بڑھتی غربت کا داخلی دباؤ قوموں کی اجتماعی نفسیات کو کم زور کر دیتا ہے۔ اقوام کا لاشعوری خوف بیرونی مداخلت کی راہ ہم وار کرتا ہے۔

غلام عباس نے معاشی استحصال اور اس کے نفسیاتی اثرات کو کلرک اور طوائف کے کرداروں میں زیادہ گہرائی سے بیان کیا ہے۔ یہ دونوں طبقات معاش کے مسائل کی بدولت نفسیاتی الجھاؤ میں مبتلا ہوتے ہیں۔ مثلاً ان کے ہاں "ایک بے بس یا کم نصیب آدمی کی علامت کے طور پر" کلرک" کا کردار پیش کیا گیا ہے"(۲۶) طوائف کا کردار جنسی لذت سے زیادہ معاشی چکروں میں پھنسا ہوا ہے۔ ان کے ہاں طوائف جنسی ہوس نا کی و بداخلاقی کا عکس نہیں بل کہ معاشی جبر کا قدرتی نتیجہ ہے۔

معاشی محرکات کے ساتھ ساتھ غلام عباس کی افسانہ نگاری میں معاشرتی جبریت سے ابھرنے والے نفسیاتی مسائل کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ ان میں معاشرتی قوانین، سماجی مجبوریاں، حالات سے سمجھوتہ بازی اور زندگی کی قوت کی تلخیاں شامل ہیں۔ جبر کی کڑی دھوپ میں سختیاں برداشت کرنے والے طبقات اور ظالمانہ روایات و اقدار کی چکی میں پستے نچلے کرداروں کے داخلی مسائل اور ان کی نفسیاتی کش مکش ان کا خاص موضوع ہے۔ طبقات کے مقدر کے ستارے افلاس اور غربت کے علاوہ خارجی غم انگیزیوں سے لاشعوری طور پر نفسیاتی پیچیدگیوں کی سمت سفر کرتے ہیں۔

نچلے طبقات کے علاوہ غلام عباس کے ہاں طبقہ اعلیٰ بھی پوری آب و تاب اور زندگی کی آسائشوں کے ساتھ جلوہ نما ہے۔ سماج کا یہ طبقہ اپنی سماجی و معاشی برتری کی بدولت صاحب حیثیت سمجھا جاتا ہے۔ اس کی طبقاتی نفسیات میں اہم عنصر نچلے طبقات پر اخلاقی، معاشرتی، سیاسی، سماجی اور قانونی جبریت سے اپنی بالادستی قائم رکھنا ہوتا ہے۔ ان کا وجود نچلے طبقات کے متوازی کرداروں میں موجود ہے۔ اس قبیل کے افسانوں میں "یہ پری چہرہ لوگ"، "نواب صاحب کا بنگلہ" اور "مجسمہ" قبل ذکر ہیں۔ "یہ پری چہرہ لوگ" بنیادی طور پر بالائی اور نچلے طبقے کی ذہنیت اور کش مکش کا عکاس ہے۔ نچلا طبقہ اپنی سماجی حیثیت سے نہ صرف ناخوش ہوتا ہے بل کہ اپنے جذبات کا اظہار بھی دلی نفرت کی صورت میں کرتا ہے۔ "نواب صاحب کا بنگلہ" اپنی سماجی حیثیت کو برقرار رکھنے، روایات سے چمٹے رہنے اور ظاہری چمک کے اندر موجود بوسیدہ حالات زندگی کے باوجود نچلے طبقات پر اپنی برتری قائم رکھنے کی نفسیاتی الجھن میں گرفتار ہے۔ "مجسمہ" بادشاہ

کے رعب وجلال اور اعلیٰ طبقے کی جبریت کی نفسیاتی احساس کمتری میں مبتلا ملکہ کی زندگی کے گرد گھومتا ہے۔

طبقاتی جبریت کی متنوع صورتیں

طبقاتی جبریت کی متنوع صورتیں سے مراد وہ جملہ عوامل ہیں جو غلام عباس کے کرداروں پر خارجی اور داخلی حاکمیت کی صورت میں اثر انداز ہو کر ان کی طبقاتی نفسیات کا درست تناظر بیان کرتے ہیں۔ڈاکٹر علمدار بخاری نے فروغ احمد کے حوالے سے افسانوں کی موضوعاتی تقسیم کے ضمن میں ان عوامل پر روشنی ڈالی ہے:۔

> معاش کا موضوع۔کتبہ، چکر، اوورکوٹ، فینسی ہیر کٹنگ سیلون، دو تماشے ایک دردمند دل (جاڑے کی چاندنی) معاش و جنس کا مخلوط کا موضوع۔اندھیرے میں، سیاہ سفید، سمجھوتہ، حمام میں، سایہ، بردہ فروش، تنکے کا سہارا، مکر جی بابو کی ڈائری، غازی مرد۔جنس۔آنندی، اس کی بیوی بھنور، بامبے والا پتلی بائی،۔سماج، قانون اور ماحول کا جبر۔جواری، ہمسائے، ناک کاٹنے والے لیکن ان میں سے بعض افسانوں کے بارے میں یہ موقف بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ " کوئی بھی افسانہ واحد الموضوع نہیں ہے۔ہر افسانہ دو موضوعاتی ہے یعنی ان میں سے ہر افسانے میں عام آدمی کو معاشی تنگ دستی کا شکار بھی دکھایا گیا ہے اور بے کیفی و بے لطفی اور جنسی نا آسودگی بھی (۲۷)

غلام عباس کے افسانوں میں طبقاتی جبریت کی نفسیاتی الجھنیں معاش، جنس، جنس و معاش اور ماحول و قانون کی قوت اور جبریت سے اظہار کی راہ پاتی ہیں۔ان کے تینوں افسانوی مجموعوں میں ان عوامل کی بدولت وقوع پذیر ہونے والے نفسیاتی مسائل متنوع رنگوں سے بکھرے پڑے ہیں۔"جواری" میں سماجی جبر کا اظہار قانون کی اندھی طاقت سے ظاہر ہوتا ہے۔نکو کی بیٹھک پر پولیس کا چھاپہ اور تھانے میں جواریوں کی عزت نفس کا مجروح ہونا اگر قانون کی طاقت ہے تو دوسری طرف اعلیٰ طبقات سے تعلق رکھنے والے جواء خانوں کا قانونی تحفظ قانون کی کم زوری کا عکاس ہے۔اسی سماجی تفریق کی بدولت نکو اور دیگر طبقات احساس کم تری میں مبتلا ہوتے ہیں۔"ہمسائے" میں بچوں کی قبل از بلوغت کے تناظر میں ہلکی ہلکی جنسی کشش کو سماجی اونچ نیچ اور معاشرتی مرتبے کی تقسیم کے نفسیاتی اثرات فرار اور بد دلی کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔" کتبہ " کا شریف حسین معاشی الجھن اور دیگر سماجی مجبوریوں کی وجہ سے بیگانگی اور گریز جیسے نفسیاتی الجھاؤ کا شکار ہو جاتا ہے۔"حمام میں "اور" آنندی" دونوں میں درجہ بدرجہ تشکیل پاتی زندگی خود فریبی کا شکار ہے۔معاشی اور جنسی

محرکات دونوں افسانوں کے کرداروں کی نفسیاتی الجھنوں کی راہ ہم وار کرتے ہیں۔ "چکر" کا منشی طبقاتی سماج میں اپنی ذات کو تلاش کرنے میں کوشاں ہے۔ معاشی استحصال اس کے اندر مایوسی کا بیج بوتا ہے اور وہ اگلے جنم میں گھوڑے کی جون میں پیدا ہونے کا شرف انسانیت سے بہتر سمجھتا ہے۔ "ناک کاٹنے والے" کی ننھی جان طبقاتی سماج میں بالادست طبقات کی طاقت کے سامنے ایک ان جانے سے خوف کی بدولت اندر سے ٹوٹ جاتی ہے۔ افسانے کے پٹھان کردار سماج میں بالادست طبقات کے آلہ کار بن کر خوف کی فضاء پیدا کر کے طبقات میں مایوسی کا ذریعہ بنتے ہیں۔ ننھی جان کے اندر خارجی جبریت کی نفسیاتی الجھن اس گفتگو سے ظاہر ہوتی ہے:۔

> ننھی جان نے کچھ جواب نہ دیا۔ آخر کیا ہوگا؟ رنگ علی نے پوچھا۔ "جانے کیا ہوگا!" ننھی جان نے کہا۔ "تھانہ میں رپٹ نہ لکھوا دیں؟" کچھ فائدہ نہیں الٹی بدنامی ہو گی۔ پھر پولیس والوں کے ناز مفت کے "" کہیں اور نہ چل دیں؟"" کہاں؟" کسی اور شہر!" کچھ فائدہ نہیں۔ "سب جگہ ایسا ہی حال ہے" (۲۸)

"اندھیرے میں" شرابی باپ اور پارسا باریش نوجوان بظاہر انھی دو کرداروں کی کہانی ہے جس میں دیگر کردار انھی کرداروں کی خارجی اور باطنی کیفیتوں کی ماہیت قلبی کا منظر سامنے لاتے ہیں مگر رات کے خنک اندھیرے میں شراب کی بوتل ضائع کرنے والا نوجوان کناٹ پیلس کے رنگین ماحول کی جبریت کے لاشعوری اثرات کی بدولت خود ہی شراب سے اپنا لہو گرمانے کا شوق پورا کرتا ہے۔ نوجوان معاشی الجھن کا بھی شکار ہوتا ہے۔ اس طرح معاش، جنس اور ماحول کا جبر نفسیاتی الجھاؤ کا محرک بنتا ہے۔

"سمجھوتہ" جنس و معاش کی امتزاجی بنت سے پروان چڑھتا ہے۔ سماجی عدم مساوات اور اعلیٰ طبقات کی زندگی میں دل چسپی کی لاشعوری گرفت بیوی کو فرار کی راہ دکھاتی ہے۔ جس کے زیر اثر وہ گھر سے بھاگ جاتی ہے۔ اس کی عدم موجودگی میں خاوند جنسی گھٹن اور سماجی دباؤ کے نفسیاتی اثرات میں مبتلا ہو کر بازاری عورتوں کی آغوش میں پناہ لیتا ہے۔ جنس و معاش کے دائروں میں حرکت کرنے والے افسانے میں اہم موڑ خاوند کے قلاش ہونے سے شروع ہوتا ہے۔ اس کی معاشی تنگی میاں بیوی کے قرب کا ذریعہ بنتی ہے۔

"اوور کوٹ" کا بے نام ہیرو اپنی سماجی حیثیت سے نالاں خود کو اعلیٰ طبقات کے مماثل کرنے کی احساس کم تری میں مبتلا ہے۔ طبقاتی سماج میں عدم مساوات اور معاشی تنگ دستی کے تاریک راستے نوجوان کی اندرونی توڑ پھوڑ اور شکست و ریخت کے ضامن ہیں۔ نوجوان اقتصادی بدحالی کے ساتھ ساتھ جنسی گھٹن کا بھی شکار ہے۔ اسی وجہ سے وہ

نوجوان جوڑے کی باتوں میں زیادہ کھو جاتا ہے۔اسی طرح غلام عباس کے دیگر افسانے بھی جنس، معاش، قانون اور ماحول کی جبریت، طبقاتی سماج اور معاشرتی دباؤ کے نفسیاتی اثرات کے زیر سایہ سفر کرتے ہیں۔

استحصالی طبقے کی طبقاتی نفسیات

غلام عباس طبقاتی استحصال کی متنوع صورتوں کا ذکر کرتے ہیں جہاں غریب اور نچلے متوسط طبقات کے کردار اعلیٰ طبقے کی جابرانہ سوچ کا شکار ہوتے ہیں۔استحصال ان کے ہاں کسی بھی خارجی حاکمیت کا زبردستی نفاذ ہے۔اقتصادی عدم مساوات، سماجی محرومیاں، طبقاتی استحصال سے گریز کا سفر، اجتماعی بے حسی، احساسات بصیرت کا فقدان اور تذلیل انسانیت کی بدولت احساس کمتری کا رجحان جابرانہ سوچ سے سماج میں پروان چڑھتا ہے۔اسی طبقاتی جبریت سے نچلے طبقات کی نفسیات اور نفسیاتی الجھنیں تشکیل پاتی ہیں۔استحصالی سوچ کی بدولت نفسیاتی مسائل کا اظہار کئی افسانوں کی خاص خوبی ہے۔سماج کی ظالمانہ سوچ اور سنگ دل روایات کو "سرخ گلاب" میں کمال مہارت سے بیان کیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر دور کا سماج بالا دست طبقات کی قوت سے لاشعوری طور پر متاثر ہوتا ہے جو اجتماعی بے حسی کی چادر اوڑھ کر تنگ دستوں کی عریانیت پر ہنس تو سکتا ہے لیکن وجود کو ڈھانپنے کے لیے کپڑا مہیا کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ اس طرح "بابے والا" میں سماج کی طبقاتی سوچ کم زوروں پر آوازے تو کس سکتا ہے مگر شرافت کی زندگی جینے کا سامان پیدا نہیں کر سکتا۔

سماج کے استحصالی طبقے کی پابندیاں اور قوانین معاشرے کو جوں کا توں برقرار رکھنے میں شدت اختیار کرتی رہتی ہیں۔"بردہ فروش" میں استحصالی طبقہ اپنی عیاشیوں اور حصول دولت کی خاطر انسانی تجارت اختیار کر کے زیر دست طبقات کو ذلت کے اندھیروں میں تو پھینک سکتا ہے لیکن ان کے زخموں پر مرہم رکھنے سے عاری ہے۔"سیاہ سفید" میں طبقاتی جبریت جوانی کی خواہشات اور آرزوؤں کو دبانے کے اقدامات کی طرف تو مائل تو کر سکتا ہے جہاں لوگ لاچارگی کی دلدل میں ہر پل گھٹ گھٹ کر مر تو سکتے ہیں مگر استحصالی طبقات کے خود ساختہ رسم و رواج انہیں اپنی خواہشات کے مطابق جینے کی توفیق دینے سے گریزاں رہتے ہیں۔

"چکر" میں سیٹھ اپنے ملازم سے کام میں تو کوئی رعایت برتنے سے قاصر ہے اور پوری شدت سے محنت کا خواہش مند ہے لیکن اس کی جائز ضروریات اور کام کے بدلے پورا عوضانہ دینے کا قائل نہیں ہے۔استحصالی طبقاتی جبریت کی سختیوں کے عوض مجبور اور محروم طبقات کے داخلی مسائل اور نفسیاتی اثرات ہی سے غلام عباس اپنے افسانوں کے

بنیادی خدوخال تراشتے ہیں۔

استحصالی طبقات کی جابرانہ سوچ نچلے طبقات میں مایوسی، ناامیدی اور بددلی کے نفسیاتی اثرات اس طرح مرتب کرتی ہے کہ مایوسیاں اور کرب ناکیاں ان کی زندگی کی حکمران بن جاتی ہیں۔ان کا شہرہ آفاق افسانہ " آنندی "استحصالی طبقے کی ریاکاری اور اخلاقی گراوٹ پر ایک گہرا طنز لے کر سامنے آتا ہے۔ان کے ہاں طوائف معاشی الجھنوں میں گھرا ہوا مجبور کردار ہے۔"ان کے ہاں طوائف جنسی ہوسنا کی کا عکس نہیں بلکہ معاشی جبر کی صورت ہے"(۲۹)اس لیے وہ دھیرے دھیرے استحصالی طبقات کے جبر کی آگ میں جھلسنے والی متحرک اور زندہ تصویر بنا کر اس کے اندر پل پل ٹوٹتی عورت کی داخلی شکست وریخت کو بے نقاب کرتے ہیں جہاں وہ دوسروں کی مرضی پر جیتی ہے۔

بالادست طبقات کی جابرانہ سوچ کا شکار " کتبہ " کا شریف حسین اور "بحران" کا پروفیسر سہیل بھی ہیں۔یہ دونوں کردار معاشرے میں صاحب جائیداد اور باعزت مقام کے حصول کی طبقاتی نفسیات میں گرفتار ہیں۔ان کی تشنہ خواہشات اندر ہی اندر گھٹ کر اپنی موت آپ ہی مر جاتی ہیں۔طبقاتی جبریت کی ہلاکت خیزیاں ان کی خواہشات اور امنگوں کو شکست خوردہ کر دیتی ہیں۔

"فینسی ہیر کٹنگ سیلون" کے چار حجام استحصالی طبقے کی جابرانہ سوچ کی طبقاتی نفسیات کے ایک نمائندہ کردار منشی کی عیاری اور حیوانی تسکین کی بھینٹ چڑھتے ہیں۔سیلون کے چار حجاموں کو منشی معاشی جبریت کے شکنجے میں کس کر اپنی اطاعت پر مجبور کرتا ہے۔وہ ان حجاموں کی معاشی مجبوریوں کے پس پردہ لاشعوری الجھنوں کا سراغ لگا کر اپنا مقصد پورا کرتا ہے۔منشی کی ساری چالیں ذرائع پیداوار پر قبضہ کر کے حجاموں کا استحصال کرنا ہوتا ہے۔اس کے لیے وہ جھوٹ کا سہارا لیتا ہے۔غلام عباس اس افسانے میں عالمی منظرنامے کو استعارتی انداز میں سامنے لاتے ہیں کیوں کہ تاریخ عالم میں وسائل پر قبضے کی عالمی سازشوں میں جھوٹ اور ناامیدی ایک موثر ہتھیار کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔"لہذا اس حمایت کو حاصل کرنے کے لیے جھوٹ کی بنیاد پر اپنا مقدمہ تیار کیا جاتا ہے"(۳۰)غلام عباس افسانے میں منشی کی تقریر کا حجاموں پر مرتب ہونے والا بے بسی اور اطاعت کا نفسیاتی الجھاؤ بیان کرتے ہیں:۔

> منشی کی یہ تقریر سن کر چاروں حجام گم صم سے رہ گئے اور کسی نے اس کی بات کا جواب نہ دیا مگر یہ خاموشی بڑی صبر آزما تھی۔انہوں نے بے بسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر گردنیں جھکا لیں(۳۱)

غلام عباس استحصالی طبقے کی عیاری اور منافقانہ طرز عمل کی طبقاتی نفسیات کو معاشرے میں دولت کی غیر مساوی

تقسیم کی لاشعوری گرفت قرار دیتے ہیں۔اس مقصد کے حصول کی خاطر اعلیٰ طبقات نچلے طبقات کا استحصال کرتے ہیں۔ " کن رس" کا فیاض اور اس کا کنبہ بھی استحصالی طبقے کی جابرانہ پالیسیوں کے سامنے اپنی پہچان کھو بیٹھتا ہے۔اس افسانے میں جابر اور استحصالی سوچ کا کردار حیدری خان اور کالکا پرشاد کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ان کا انداز قدرے الگ ہے جہاں سادہ لوح لوگوں کا استحصال ان کے اندر پوشیدہ خواہشات کا سراغ لگا کر ممکن بنایا جاتا ہے۔فیاض اپنے موسیقی کے شوق کو عملی جامہ پہنانے کے لیے حیدری خان پر اندھا اعتماد کر لیتا ہے۔حیدری خان کی منافقت کا اظہار اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے:۔

> لو میاں صاحبزادے، خدا شاہد ہے مجھے تم بیٹوں سے بھی زیادہ عزیز ہو اور اصغری بیٹی تو میری سگیوں سے کم نہیں۔میں نے جو بات سوچی ہے تمہارے ہی بھلے کے لیے سوچی ہے۔میری نہ آل ہے نہ اولاد، جو کچھ ہو تمہیں ہو۔پھر میں تمہارا برا کیوں چاہوں گا(۳۲)

اس ساری ہم دردی کے پس پردہ حیدری خان اور کالکا پرشاد فیاض کی بیٹیوں کو بازارِ حسن کی رونق بنا کر اپنی مستقل آمدنی کا وسیلہ بنانا چاہتے ہیں۔اسی طرح "حمام میں" کی فرخ بھابی اور اس کی پوری منڈلی معاشی تنگ دستی میں طبقاتی سماج اور زبردست طبقات کے سماج کش اقدامات سے الجھتی ہے۔ایک دوسرے کی مشترکہ ضروریات اور سماجی مجبوریاں سب کو ایک چھت تلے رہنے پر مجبور کرتیں ہیں۔بالادست اور طاقت ور کردار میر صاحب کی صورت میں ظاہر ہو کر نہ صرف اپنی دولت اور عیاری سے فرخ پر قبضہ کر لیتا ہے بل کہ پوری ٹولی کو تسلیم و رضا پر مجبور کر دیتا ہے۔نچلے طبقات اپنی سماجی اور معاشی پریشانیوں کے بوجھ تلے دب کر سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔

غلام عباس کے افسانوی کردار بیرونی جبریت کی بدولت ایک خود فریبی میں مبتلا ہو کر زندگی کو بسر کرنے کا انداز اپناتے ہیں۔"ان افسانوں میں کردار یا تو کسی نئے فریب میں مبتلا ہوتے ہیں یا کسی فریب کا پردہ چاک ہوتا ہے"(۳۳) طبقات کے اندر ایک نفسیاتی الجھاؤ ضرور پیدا ہوتا ہے لیکن وہ اگلے ہی لمحے ایک نئے فریب کو اپنا کر زندگی کی طاقت کا اقرار کر لیتے ہیں۔کرداروں کی یہی خود فریبی ان کو جینے پر مجبور کرتی ہے جو خود میں ایک نئی جبریت ہے۔

"جواری" کا ایک کردار نکو تھانے میں بظاہر مطمئن نظر آتا ہے اور اپنی باتوں سے دیگر جواریوں کا حوصلہ بڑھتا نظر آتا ہے مگر وہ اپنی گرتی ساکھ اور معاشی خطرات کی لاشعوری گرفت کی بدولت اندر سے خوف میں مبتلا ہے۔اسے اس بات کا شدید احساس ہے کہ اس کے سارے دعوے جھوٹ پر مبنی ہیں جن کی عمارت کسی بھی وقت گر سکتی ہے۔اس لیے وہ ایک

طرف جواریوں کی نفسیاتی کم زوریوں سے فائدہ اٹھاتا ہے تو دوسری طرف تھانے میں بے بسی اور گرتے رتبے کی نفسیاتی الجھن کے باوجود ایک اور فریب میں مبتلا ہو کر زندگی کو پھر سے جینے کی راہ تلاش کر لیتا ہے۔ جیسے "اس کے بعد تکو نے یکبارگی زور کا قہقہہ لگایا۔ اتنے زور کا کہ وہ ہنستے ہنستے دوہرا ہو گیا" (۳۴) "چکر" کا چیلا رام پوری محنت کے باوجود فرار اور گریز جیسی نفسیاتی کش مکش کا شکار رہتا ہے لیکن اگلے ہی لمحے گھوڑے کی جون میں اپنا اگلا جنم شروع کرنے کی خواہش اسے نہ صرف ایک اور فریب کی راہ دکھاتی ہے بل کہ زندگی کے نئے جبر کی راہ بھی ہم وار کرتی ہے۔ اسی طرح غلام عباس کے ہاں "سمجھوتہ" میں معاشی اور جنسی جبلت کی طاقت میاں بیوی کی قربت کا باعث بنتی ہے جہاں دونوں کا وجود مشترکہ ضروریات کے باعث ایک دوسرے میں زندگی کی امنگ پیدا کرتا ہے۔ "سیاہ سفید" کی میمونہ میں جنسی نا آسودگی کے اثرات کناٹ پیلس میں کھل کر سامنے آتے ہیں۔ نوجوان مرد کی جانب سے محبت کا پیدا شدہ احساس میمونہ کی پچھلی شدید دباؤ میں گزری زندگی کو ایک نئی رونق بخشتا ہے۔ جنس مخالف کی طرف سے محبت کی نظر جنسی نا آسودگی کی شدت کو کم کر دیتی ہے اور اس کی نفسیاتی الجھن بدل جاتی ہے۔ اسی لیے وہ خود کو اپنی طبعی عمر سے چھوٹا خیال کرنے لگتی ہے۔ یوں زندگی کی جبریت نفسیاتی الجھاؤ کے باوجود جینے کا سامان پیدا کر لیتی ہے۔

"اس کی بیوی" کا نوجوان اور نسرین بھی طبقاتی سطح پر ایک جیسے دکھ اور مسائل میں الجھے ہوئے ہیں۔ نسرین کے اندر گھریلو زندگی کی خواہش انگڑائیاں لے رہی ہے تو نوجوان اپنی مرحومہ بیوی کی بے وفائی سے نالاں وفا کا ایک پیکر تلاش کرنے میں مگن ہے۔ دونوں کی نفسیاتی شکست و ریخت کی گرفت، خواہشات اور ضروریات کی لاشعوری کشش دونوں کو قریب لاتی ہے۔ دو راتوں کا قرب زندگی میں نئی امنگ پیدا کرتا ہے۔

"بھنور" کی دو بہنیں گل اور بہار طوائف کی یکسانیت سے بھری زندگی کی بدولت فرار کی نفسیاتی الجھن میں الجھ کر حاجی شفاعت احمد خان کی دہلیز پر دستک دیتی ہیں۔ سماج میں اپنی گرتی ساکھ سے باخبر ہونے کے باوجود زندگی کی قوت ان کو پھر آگے بڑھنے کی سمت دکھاتی ہے۔ غلام عباس دراصل سماج کے نچلے طبقات میں خارجی جبریت کی بدولت نفسیاتی مسائل کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کو ایک نئے فریب میں زندگی بسر کرتا بھی دکھانا چاہتے ہیں۔ ان کے کردار تمام تر طبقاتی و نفسیاتی مسائل کے باوجود زندگی کی طاقت کے سامنے بے بس ہو کر اسے بسر کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی کا فریب فرد کو اگر نفسیاتی مسائل سے دوچار کرتا ہے تو جینے کی راہ بھی ہم وار کرتا ہے:۔

غلام عباس کی دلچسپی اور تحقیق و تفتیش کا مرکز یہ احساس ہے کہ انسان کے دماغ میں دھوکا کھانے کی بڑی صلاحیت ہے، بلکہ فریب خوردگی کے بغیر اس کی زندگی اجیرن بن جاتی ہے، اور وہ ہر قیمت پر کسی نہ کسی طرح کا ذہنی فریب برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے (۳۵)

غلام عباس کے کردار زندگی کی قوت اور طاقت کے سامنے لاچار ہیں اور زندگی کو اپنی مرضی کے برعکس جینے پر الجھاؤ کا شکار ہوتے ہیں۔ ایک الجھن سے خلاصی اگلے الجھاؤ کی راہ ہموار کرتی ہے۔ نچلے طبقات کی طبقاتی نفسیات کا ایک اہم محرک زندگی سے وابستگی اور اس کی جبریت کی قبولیت کا اظہار ہے۔ فریب خوردگی کرداروں کو ناساز حالات میں زندہ رکھتی ہے:۔

غلام عباس کے کرداروں کی یہی تو خوبی ہے کہ ساری شکست وریخت، فریب خوردگی اور اضمحال کے باوجود ان کے بطون ذات میں وہ قوت کہیں نہ کہیں بچی رہتی ہے جو ایک بار پھر انھیں مجتمع کرتی اور کھڑا کرتی ہے۔ یہ قوت انھیں مسلسل جیے جانے پر آمادہ کرتی ہے۔ موت نے زندگی کا راستہ کاٹ دیا تو الگ بات ہے۔ (۳۶)

کرداروں کی طبقاتی نفسیات

غلام عباس کے افسانوں میں کسی فلسفہ طرازی یا انقلابی فکر اور سماجی احتجاج کے بغیر زندگی کے عمومی دھارے میں بہتے ہوئے آدمیوں کے ایک جیسے مسائل اور مشترک درد، تکلیفوں اور نامرادیوں میں کسی فرد کی عیاری و چالاکی، خودغرضی اور ذہانت سے پیدا ہونے والی استحصالی فطرت ملتی ہے۔ اس میں سماج کے ایسے کردار بھی ہیں جو اپنے مفاد میں دوسروں کی قربانی اس بے دردی سے دیتے ہیں کہ شکوے کا انسانی حوصلہ بھی دم توڑ دیتا ہے۔ انسان کی ان جبلتی کم زوریوں کے نفسیاتی محرکات ان کا خاصا ہے۔ انسان کی معاشی اور سماجی مجبوریاں، ماحول کی طبقاتی روایات اور زندگی کی طاقت کے سامنے بے بسی اور لاچاری طبقات کی نفسیات کو متاثر کرتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ غلام عباس فرد کی عمومی نفسیات سے گہری آگہی کی بدولت خارجی محرکات سے طبقات کی نفسیات کا تعین کرتے ہیں۔ ان کا کمال کرداروں کی عمومی نفسیات سے طبقاتی نفسیات کا سراغ ہے۔ ان کے افسانے فرد کی عمومی نفسیات کے علاوہ فرد کی اجتماعی زندگی اور بصیرت کے چند لمحوں، اجتماعی نفسیات کے ریزوں اور فرد کی سماجی ضرورتوں کے درمیان فریضہ آدمیت کا ایک ایسا راستہ تلاش کرتے

ہیں جہاں فرد اپنی زندگی کی جمالیاتی آسودگی اور اپنی حسرتوں کی نا تمام کش مکش کو اپنی روح میں جذب کرتا ہے۔ان کی اکثر کہانیاں ایک سوز کی کیفیت تو ضرور رکھتی ہیں مگر زندگی سے مایوسی اور نا امیدی کو پیدا نہیں ہونے دیتیں۔ان کے ہاں ایک اجتماعی بصیرت کارجحان پایا جاتا ہے۔سماج کی اجتماعی نفسیات معاشرتی تقاضوں کی لاشعوری گرفت کی بدولت زندگی کو جاری وساری رکھنے پر مجبور ہے۔اسی لیے ان کے نزدیک زندگی اپنی تمام تر مشکلات اور مصائب کے باوجود ایک نئے فریب کا راستہ ہموار کرتی ہے جس کے باعث معاشرہ اپنی تشکیل جاری رکھتا ہے۔اجتماعی بصیرت ان کے افسانوں کے اکثر کرداروں کو سخت اور نامساعد حالات میں جینے کی راہ پر گامزن رکھتی ہے۔ان کے افسانوں میں "سایہ"، "آنندی" ،"اوورکوٹ" اور "اس حمام میں" زندگی کی اجتماعی بصیرت اور اس کے باطنی عمل کو بے نقاب کرنے کا اظہار ہیں۔ان میں سماج کی تشکیل کا عمل جاری رہتا ہے۔انفرادی جذبوں کی پامالی اور نفسیاتی الجھنوں کے باوجود زندگی آگے بڑھتی ہے۔ غلام عباس انفرادی اور اجتماعی صداقتوں کو نفسیاتی تناظر میں پیش کرتے ہیں:۔

> غلام عباس انفرادی اور اجتماعی صداقتوں کو اس کے نفسیاتی تانے بانے کے ساتھ جس طرح پیش کرتے ہیں اس میں ان کی سماجی بصیرت اور زندگی کے بنیادی شعور کا عمل انہیں ان تمام افسانہ نگاروں سے الگ رکھتا ہے جو نفسیات کے مطالعہ کی بنیاد پر کہانیاں لکھتے ہیں (۳۷)

غلام عباس کے ہاں زندگی کی بصیرت اور نفسیاتی شعور ان کی طبقاتی اور نفسیاتی گرفت کا غماز ہے۔ان کی کہانیاں زندگی کے احترام اور انسانی اقدار کی مسلمہ حیثیت کے لاشعوری اثرات کو بھی بیان کرتی ہیں۔وہ اپنی کہانی کا آغاز زندگی کے کسی عمومی واقعہ سے کرتے ہیں اور اس کی باطنی صداقت کو نفسیاتی الجھاؤ کی تفہیم کا ذریعہ بناتے ہیں۔ان کا افسانہ "اوورکوٹ" زندگی کے معمولی عوامل سے تشکیل پاتا ہے۔طبقاتی نفسیات کے حوالے سے وہ اس طبقاتی ناہمواری کو بیان کرتے ہیں کہ انسان کے جذبات،نوجوانی کی خواہشات اور جنس کی لطف اندوزی پر تمام طبقات کا یکساں حق ہے۔سماج کی طبقاتی بنت نچلے طبقات میں احساس کم تری کو فروغ دیتی ہے اور وہ اعلیٰ اور بالا دست طبقات کی زندگی میں دل چسپی لیتے ہیں۔افسانے میں بظاہر زندگی کے سادہ اور عام مسائل کا ذکر ہے جس کی بدولت ایک نوجوان زندگی کے معاشی مسائل میں الجھا ہوا ہے مگر ان عمومی واقعات کی تہہ میں جنسی ناآسودگی،احساس کم تری،زندگی سے فرار کی کیفیت اور سماج کی طبقاتی تشکیل کے لاشعوری اثرات کا گہرا مطالعہ موجود ہے۔طبقاتی معاشرے کی معاشی الجھن اور جنسی ناآسودگی کے باعث لذت کوشی لاشعوری الجھن بن کر سامنے آتی ہے:۔

نوجوان نے شام سے اب تک اپنی مٹرگشت کے دوران میں جتنی انسانی شکلیں دیکھی تھیں ان میں سے کسی نے بھی اس کی توجہ کو اپنی طرف منعطف نہیں کیا تھا۔ان میں کوئی جاذبیت تھی ہی نہیں۔یا پھر وہ اپنے حال میں ایسا مست تھا کہ کسی دوسرے سے اسے سروکار ہی نہ تھا۔مگر اس دلچسپ جوڑے نے جس میں کسی افسانے کے کرداروں جیسی ادا تھی، جیسے یکبارگی اس کے دل کو موہ لیا تھا اور اسے حد درجہ مشتاق بنا دیا کہ وہ ان کی اور بھی باتیں سنے اور ہو سکے تو قریب سے ان کی شکلیں بھی دیکھ لے(۳۸)

نوجوان جوڑے میں دل چسپی کی لاشعوری وجہ معاشی بدحالی کے باعث جنس مخالف کی عدم دستیابی اور اس کے بارے میں تخیلاتی فضاء کی تعمیر ہے۔یہ الجھن انفرادیت سے اجتماعیت کا سفر کر کے انفرادی نفسیات کا اطلاق پورے سماج پر کرتی ہے۔اس کے علاوہ غلام عباس جذبے کی حدت اور معصومیت کے جذبات کو طبقاتی سماج کی جبریت سے متاثر ہونے والے داخلی اثرات کو بیان کرتے ہیں۔

"ہمسائے" بظاہر بچوں کی نفسیات پر مبنی افسانہ ہے جس میں معاشرتی تفریق، سماجی مرتبے اور اونچ نیچ کی نفسیاتی الجھن بچوں میں بیدار ہونے والے جبلی جذبے کی راہ میں رکاوٹ بن کر بے چینی اور اکتاہٹ کا باعث بنتی ہے۔افسانے کا کردار اکبر پورا دن بیری کے خفا ہونے پر نہ صرف پورے منظر اور فطرت کی دل کشی سے اکتا جاتا ہے بل کہ کام سے اکتاہٹ اور ساتھیوں سے جھوٹ بول کر جان چھڑانا چاہتا ہے:۔

"اکبر" ان میں سے ایک نے کہا۔"یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو، چلو ہمارے ساتھ، فٹ بال کھیلنے!" تم جاؤ مجھے کام ہے بھئی" اکبر نے کہا۔"یہ خوب کہی" دوسرے لڑکے نے کہا۔" نہیں تمھیں چلنا ہوگا۔دیکھو ہم نے آج ہی یہ نیا فٹ بال خریدا ہے۔" نہیں میں آج نہیں جاؤں گا"" آخر کیوں؟" مجھے کام جو کرنا ہے بھئی" کیسا کام؟" کیسا کام ---- وہ اسکول کا کام جو دیا تھا ماسٹر صاحب نے!"(۳۹)

داخلی وجود پر طبقاتی و نفسیاتی اثرات

غلام عباس کے افسانوں میں فطرت کی بوقلمونیوں کا مشاہدہ، انسانی نفسیات کا گہرا شعور اور طبقاتی نفسیات کے انسانی جسم پر اثرات کا شعور بھی موجود ہے جو ان کے طبقاتی اور نفسیاتی شعور کا بین ثبوت بھی ہے۔ان کے افسانوی کردار

ادھورے پن اور دھندلکوں کے بجائے اجالوں کا سفر کرتے ہیں۔ وہ اپنے کرداروں کی تخلیق میں جسمانی خدوخال کے ساتھ ساتھ اندورنی ٹوٹ پھوٹ پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ وہ اپنے عہد کی ناہموار اقدار کی تصویر کشی اور سماج کے پسے کرداروں کے ظاہری بیان میں داخلی الجھن پر دھیان ضرور رکھتے ہیں۔ "غلام عباس کے نزدیک ہر کردار ایک بڑے گلیشیئر کی طرح ہے جس کا تین بٹا چار حصہ سطح آب کے نیچے چھپا ہوا ہے اور صرف ایک چوتھائی حصہ سطح آب کے اوپر دکھائی دیتا ہے" (۴۰) ان کی افسانہ نگاری میں ایک باکمال خوبی جزئیات نگاری ہے۔ اپنے کرداروں کی جزئیات نگاری میں وہ کردار کی ظاہری شکل وصورت، اس کے چہرے کے نقش ونگار، لباس، زبان اور انداز نشست و برخاست بڑی مہارت سے بیان کرتے ہیں لیکن ان کی اصل نگاہ ظاہر سے زیادہ ان کے باطن پر ہوتی ہے جس سے وہ اس کے اندر کی نفسیاتی الجھن اور اس الجھن کے لاشعوری اثرات تک پہنچتے ہیں۔ غلام عباس پہلے اپنے کردار کا طبقہ، سماجی حیثیت اور اقتصادی صورتحال کو منظر عام پر لاتے ہیں۔ کردار سے قاری کے تعارف اور اس کے معمولات زندگی پر وہ خارجی جبریت کا عکس دکھا کر اس کی طبقاتی نفسیات اس طرح بیان کرتے ہیں کہ کہانی پن اپنی جگہ جاری رہتا ہے۔ غلام عباس کا انداز تبدیل ہوتا رہتا ہے اور طبقاتی نفسیات کے اثرات کا ذکر کئی بار افسانے کے آغاز میں ہی جبریت کے اظہار کے بعد سامنے آنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس قبیل کا ایک کردار "سیاہ سفید" کی میمونہ ہے۔ اس کا تعارف اور طبقہ شروع ہی میں سامنے آتا "پچھلے کئی برس میں اپنی قلیل تنخواہ میں سے دو دو تین تین روپے بچا کر جو سو روپیہ جمع کر لیا تھا" (۴۱) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملازم ہے اور کم تنخواہ سے زندگی کی گاڑی چلتی ہے۔ معاشی مسائل میں زیادہ شدت کا عنصر شامل نہیں ہے لیکن زندگی میں پیسے کی ریل پیل بھی نہیں ہے۔ وہ اپنے بالوں میں کنگھی کر رہی ہے اور افسانہ نگار اسی منظر سے اس کی طبقاتی نفسیات کو بڑھتی عمر کی الجھن سے سامنے لاتا ہے:۔

> اس نے جلد ہی آئینے کی مدد سے اس بال کو لٹ سے الگ کیا اور کھینچ کر نکال ڈالا۔
> اسے یاد نہیں رہا تھا کہ اب تک وہ ایسے کتنے بالوں کو یوں ہی کھینچ کھینچ کر نکال چکی تھی،
> البتہ اس احساس نے کہ وہ روز بروز بوڑھی ہوتی جا رہی ہے پہلے سے زیادہ شدت
> سے اس کی روح کو جھنجوڑ دیا (۴۲)

غلام عباس کو طبقاتی نفسیات کے بیان میں عورتوں کی نفسیات سے بھی خاص دل چسپی تھی۔ انھوں نے عورتوں کی نفسیات کے ضمن میں طوائف کے علاوہ کئی نسوانی کردار نہ صرف تراشے بل کہ ان کے اندر جھانک کر نفسیاتی المیوں کو بھی گرفت میں لیا۔ عورت پر خارجی جبریت کے حوالے سے ان کے ہاں "سیاہ سفید"، "سرخ گلاب"، بردہ فروش"،

"اس کی بیوی"، "غازی مرد"، "بھنور"، "تنکے کا سہارا"، "آنندی" اور "سمجھوتہ" قابل ذکر ہیں۔ان افسانوں میں نسوانی کردار خارجی جبریت سے نفسیاتی مسائل کا شکار ہوتے ہیں۔عورت کی لاشعوری الجھن میں خواہش تحفظ، آشیانہ سازی، نرگسیت، اپنی عزت و ناموس، اولاد کے معاشی اور معاشرتی تحفظ کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ان کے ایک افسانے" اس حمام میں" کا کردار فرخ ایک ایسا ہی نسوانی کردار ہے جو اپنے عورت پن کی وجہ سے کم زور مردوں کے برعکس ایک طاقت ور اور صاحب حیثیت مرد "میر صاحب" کا انتخاب کرتی ہے۔بقول ڈاکٹر فاروق عثمان:۔

> وہ اپنے پرانے دوستوں کی خواہشات کے برعکس میر صاحب سے میل جول بڑھاتی ہے، یہ فیصلہ یہ انتخاب کسی معاشی جبر کا شاخسانہ نہیں اس کے عورت پنے کا تقاضا ہے جو ایک مکمل مرد کے قرب میں تحفظ کا احساس چاہتا ہے (۴۳)

اسی طرح میمونہ کے اندر ایک گھریلو عورت کی خواہش اور جنسی جذبے کی تسکین کی لاشعوری الجھن اسے نئی دہلی کی راہ دکھاتی ہے۔غلام عباس اس کی لاشعوری وجہ بیان کرتے ہیں کہ عورت کا جنسی رویہ مرد کے مقابلے میں زیادہ تعمیری ہوتا ہے جب کہ مرد کے عزائم زیادہ تر استحصالی نوعیت کے ہوتے ہیں۔اسی طرح ریشماں بدلتے گھروں اور ایک جسم سے دوسرے کا سفر کرتے تھک جاتی ہے اور اس کے اندر کی عورت اسے ایک مروجہ شریف عورت کے طور پر آشیانہ سازی کے لیے اکساتی ہے۔"چوہدری گلاب کے گھر بس کر اسے پہلی مرتبہ زندگی کی قدر و قیمت معلوم ہوئی" (۴۴) اسی طرح عورت کے اندر آشیانہ سازی اور احساس تحفظ کی نفسیاتی الجھن "بھنور" اور "اس کی بیوی" میں بھی سامنے آتی ہے۔نسرین نو جوان کی بیوی کے ذکر اور اپنے ساتھ نو جوان کے برتاؤ سے لاشعوری طور پر متاثر ہو کر اندرونی کش مکش میں الجھ جاتی ہے۔بہار اور گل بھی اسی نفسیاتی مسئلے سے دوچار ہو کر حاجی صاحب کے دینی وعظ کو تسلیم کر کے شریفانہ زندگی پر راضی ہو جاتی ہیں۔ "غازی مرد" کی اندھی چراغ بی بی اپنے جسمانی نقص کی بدولت لاشعوری طور پر اندر سے خائف ہے۔اس کے اندر کا احساس تحفظ اسے بے چین کیے ہوئے ہے۔وہ اپنا سہاگ مناجات سے بچانے میں کوشاں ہے۔وہ اپنے خاوند کی جنسی الجھن سے آگاہ ہے۔اسی لیے وہ رات کو اٹھ کر تسلی کرتی ہے کہ اس کا خاوند کہیں گھر سے باہر اپنی عیاشی اور تسکین کا سامان تو پیدا نہیں کرتا:۔

> دو گھنٹے بعد وہ اپنی کوٹھڑی سے پھر نکلی اور اس کی چارپائی کے پاس پہنچ کر اس کے پیروں کو ٹٹولنے لگی اور یہ اطمینان کر کے وہ چارپائی پر بدستور چادر تانے سو رہا ہے وہ پھر اپنی کوٹھڑی میں چلی گئی (۴۵)

یوں غلام عباس کرداروں کے ظاہری خدوخال تراشتے وقت ان کے اندر اٹھتے نفسیاتی طوفان پر گہری نظر رکھتے تھے۔ کرداروں کے لہجے، ماحول، طبقات اور مرد و زن کے جبلی اور نفسیاتی تقاضوں کا درست فہم ان کے طبقاتی اور نفسیاتی شعور کا عکاس ہے۔

کردار نگاری اور نفسیاتی توازن

کرداروں کی طبقاتی نفسیات کے بیان میں غلام عباس ایک توازن کی فضاء قائم رکھتے ہیں۔ اس خارجی اور داخلی توازن کی بدولت زندگی میں تصادم اور ٹکراؤ کے بجائے زندگی اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔ زندگی کی یہی امنگ اور ہلچل نچلے طبقات میں سمجھوتہ بازی کو فروغ دیتی ہے۔ ان کے افسانوں کا کردار جس طبقے سے ہوتا ہے اس طبقے کا غلام عباس پوری گہرائی سے مطالعہ کرتے ہیں۔ اس طبقے کے حالات و واقعات اور نفسیاتی الجھاؤ کے بیان میں ایک رمزیت کا انداز پایا جاتا ہے۔ غلام عباس افسانوں میں نفسیاتی کش مکش کو بیان کرنے میں تفصیل کے ساتھ ساتھ باریک پہلوؤں کو رمزیت سے سامنے لاتے ہیں۔ "وہ ان تمام باتوں کو تفصیل سے بیان نہیں کرتے۔ ان کے اندر بھی رمزیت ہے اور یہ رمزیت ان کے افسانوں میں گہرائی اور گیرائی پیدا کر دیتی ہے" (۴۶) ان کے ہاں طبقاتی نفسیات کا توازن فرد کے بطون ذات کا احاطہ کرتا ہے۔ افسانہ "بندر والا" میں مسٹر شاہ کے بطون ذات سے دولت، عہدہ اور ظاہری شان شوکت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ ان کے اندر نچلے طبقات سے الگ پہچان کی طبقاتی نفسیات آسودہ زندگی کے بطون سے اظہار کی راہ پاتی ہے۔ کردار داخلی الجھاؤ کے باوجود خارجی معمولات میں زندگی کو رواں دواں رکھتے ہیں جب تک جبریت اپنی انتہائی حالت کو نہیں پہنچ جاتی۔ افسانہ "دو تماشے" میں مرزا برجیس ایک بڑھیا اور پوتے کو بھیک مانگتے دیکھ کر اس کی لاشعوری گرفت میں گرفتار ہو جاتے ہیں لیکن فوری ردعمل کے بجائے ان کے رونے کا عمل قدرے دیر سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سلیم شاہی جوتا خریدنے کے دوران بھیک کے اصلی مناظر کی لاشعوری الجھن بھی اس منظر کے ساتھ گھل مل جاتی ہے جب کہ یہ مناظر کئی دن پہلے کے دیکھے ہوتے ہیں:۔

> جب تک تماشہ ہوتا رہا، میں نے مرزا کو سخت بے چین دیکھا۔ وہ بار بار کرسی پر پہلو بدلتا رہا اور ہاتھ چہرے تک لے جاتا۔ خدا خدا کر کے فلم ختم ہوئی تو میں نے دیکھا کہ وہ جلدی جلدی اپنی آنکھیں پونچھ رہا تھا (۴۷)

غلام عباس کا فن نفسیاتی شعور کے ساتھ ساتھ طبقاتی شعور کی بھی معراج کو پہنچا ہوا ہے۔ کرداروں کی معاشی اور معاشرتی حیثیت، ان کا سماجی مقام، پیشہ، گفت گو، طعام و قیام، ظاہری آرائش اور مشاغل اسی طبقے کا خاصا ہوتے ہیں۔ کردار سے اس طبقے کی طبقاتی نفسیات کا سراغ اس کے لہجے اور معمولات سے اظہار کی راہ پاتا ہے۔ طوائف سے متعلق افسانوں میں اس کی گفتگو کی شوخی، گاہک کی باتوں کا محبت بھرا جواب، اپنائیت کا احساس دلانا، بناؤ سنگھار، دل کش ادائیں اور دیدہ زیب ملبوسات نہ صرف اس طبقے کے لیے خاص ہیں بل کہ نفسیاتی مسائل کی عقدہ کشائی میں بھی معاون ثابت ہوتے ہیں۔ "یہ پری چہرہ لوگ" دو طبقات کی نمائندگی کرتا ہے۔ بیگم تراب علی کی شکل وصورت، ظاہری شان اور رکھ رکھاؤ اگر ایک طرف بالادست طبقات کا اظہار ہے تو نچلے طبقات کا استحصال بھی ان ہی کے طبقے کی نفسیات ہے۔ اسی طرح بیگم تراب علی کے ساتھ مہترانی کی بات چیت نچلے طبقے کی نمائندگی کرتی ہے جس سے اعلی طبقات کے استحصال کی لاشعوری گرفت نفرت بن کر منظر عام پر آتی ہے۔ " کیوں ری مردار تو نے میرا بھی تو کوئی نہ کوئی نام ضرور رکھا ہوگا۔ بتا کیا نام رکھا ہے؟ سچ مچ بتائیو، نہیں تو مارتے مارتے بھرکس نکال دوں گی" (۴۸)

افسانے کی یہ گفتگو طاقت ور طبقات کی استحصالی سوچ اور طبقاتی نفسیات کے عین مطابق ہے۔ اسی طرح آخری کلمات اگر نچلے طبقات کی گفتگو کے مطابق ہیں تو استحصال کا لاشعوری ردعمل بھی ہیں۔ "سن جگو کے باوا۔ جب سڑک جھاڑ چکیو تو ڈھڈو کے بنگلے پر چلے جائیو" (۴۹)

ان کے ایک اور افسانے "جواری" کا مرکزی کردار نکو اور اس کی بات چیت، ظاہری حلیہ اور انداز و اطوار اس پیشے سے وابستہ افراد کے عین مطابق ہیں۔ اس کی بیٹھک کی پوری فضاء نچلے طبقات میں پوشیدہ عیاشی کے رجحانات کے گرد گھومتی ہے۔ انسان کے اندر کی بے چینی، سماجی مرتبے کے گرنے کا خوف اور سزا کا ڈر جواریوں کے طبقے کی طبقاتی نفسیات کو سامنے لاتا ہے۔ افسانے میں ٹھیکہ دار، سرکاری اکاؤنٹنٹ، مہاجن کا بیٹا اور شیخ صاحب کا انداز گفتگو نہ صرف اپنے طبقہ کے عین مطابق ہے بل کہ ان کے اندر کی نفسیاتی الجھنیں بھی اپنی اپنی سماجی حیثیت کے مطابق ہے۔ سرکاری اکاؤنٹنٹ کو اپنی ملازمت کے جانے کی نفسیاتی الجھن بیوی بچوں کی موت بن کر پریشان کرتی ہے۔ "ارے بھائی میں لٹ گیا۔ میں سرکاری آدمی، میری عزت دو کوڑی کی ہوگی۔ ہائے ہائے میرے بیوی بچے، نکو نے مجھے برباد کر دیا۔ ہائے" (۵۰)

اسی طرح ان کے دیگر افسانے بھی اپنے طبقے کے نمائندہ ہیں۔ خصوصاً نچلے طبقات کا انداز رہن سہن، رجحانات، دلچسپیاں نہ صرف اپنے طبقے سے تعلق رکھتی ہیں بل کہ ان پر طبقاتی تفریق، غربت و استحصال، بھوک افلاس، سماجی پستی اور اعلیٰ طبقات کے خلاف نفرت جیسے عوامل کی بدولت احساس کم تری، نا آسودگی، بے زاری، فرار، گریز، احساس محرومی،

جذباتیت، گریہ زاری، نرگسیت، حسد و رقابت اور بدگمانی جیسے نفسیاتی مسائل کی دریافت غلام عباس خارج سے داخل کا سفر کر کے بے نقاب کرتے ہیں۔

جبلتوں کے حامل نفسیاتی المیوں پر گرفت

غلام عباس معاشی و معاشرتی استحصال، بھوک و افلاس، سماجی عدم مساوات، جنسی گھٹن اور قانون و ماحول کے علاوہ جبلتوں کی شدت اور ان کے نفسیاتی اثرات سے پورے طرح آگاہ تھے۔ان کا افسانہ "آنندی" جبلتوں کی طاقت کا آئینہ دار ہے۔اس افسانے میں وہ یہ حقیقت بیان کرتے ہیں کہ انسان کی جبلی قوت کے سامنے سماج کے بنائے ہوئے قوانین اور ضابطے بے اثر ہو جاتے ہیں۔انسان کے جبلی تقاضے جنس کی شدت کے باعث اپنی تسکین کا سامان پیدا کر لیتے ہیں:۔

> ہزاروں برس کی تمام تر اخلاقی ترقی اور تہذیبی ارتقاء کے باوجود انسان کے جبلی تقاضے آج بھی اس قدر منہ زور ہیں کہ ان کے آگے قانون، سماج، تہذیب حتیٰ کہ مذہب بھی کوئی بند باندھنے سے قاصر ہے(۵۱)

غلام عباس کے ہاں غور و فکر کی بنیادی چیز زندگی ہے اور وہ انسان میں جینے کی خواہش کو ایک طاقت ور جبلی تقاضے کے طور پر سامنے لاتے ہیں۔آنندی میں طوائفیں اور ان کے گرد پھیلا ہوا بازار ہر نئے مقام پر زندگی کا سامان پیدا کر لیتا ہے۔زندگی جینے کی یہ جبلت ایک مقناطیسی کشش کی طرح سامنے آتی ہے جس کے آگے سماجی اصول بے بس ہو جاتے ہیں۔جبلت اپنی تسکین کی راہ میں رکاوٹ پا کر بے چینی اور بے کیفی کی الجھن میں فرد کو مبتلا کر دیتی ہے۔"آنندی" میں غلام عباس انسانی جبلت کی طاقت کا نقش دھیرے دھیرے قائم کرتے ہیں۔اس افسانے میں سادہ اور خارجی زندگی کے حامل کردار، داخلی کش مکش اور جبلتوں کی اندھی قوت کے نفسیاتی مسائل کی بدولت اپنی تسکین کا سامان پیدا کر لیتے ہیں۔ایک طرف وہ اپنی خواہشات کے برعکس زندگی کی جبلت کے زیر اثر جینے پر مجبور ہیں تو دوسروں کی خواہشات کی عدم تکمیلیت نفسیاتی الجھنوں کی راہ ہموار کرتی ہے۔آنندی کی طوائفیں سماج میں مروجہ شریف زندگی بسر کرنے کا رجحان رکھتی ہیں لیکن سماجی رویے اس کے الٹ اپنی عیاشیوں کا سامان چاہتے ہیں۔اسی طرح ان کے طوائف سے متعلق اکثر افسانے اپنی پسند و ناپسند کے الٹ دوسروں کے لیے جیتے ہیں اور اسی کش مکش سے احساس کم تری میں مبتلا ہو کر بس زندگی کو امنگوں اور جوش و ولولے کے بغیر لگے بندھے ضابطوں کے تحت بسر کرتے ہیں۔ان کے نزدیک دوسروں کی جبریت اور طاقت

کے تحت بے رنگ اور بے کیف زندگی گزارنا نچلے طبقات کے نفسیاتی مسائل کا طاقت ور محرک ہے۔اسی طبقاتی اور نفسیاتی شکست وریخت میں ان کے نچلے اور متوسط طبقے کے کردار زندگی کے شب وروز بسر کرتے ہیں۔

جبلتوں کے حامل نفسیاتی المیوں کو گرفت میں لینے کا منفرد اور انوکھا انداز غلام عباس کے طبقاتی اور نفسیاتی شعور کو تقویت بخشتا ہے۔انھوں نے معاشرتی اور نفسیاتی حقیقت نگاری سے اپنے افسانوں کی دنیا سجائی ہے۔سماجی حقیقت نگاری میں ان کے اندر کسی طوفان یا بغاوت کا انداز عنقا ہے۔اپنی ملازمت اور اس کے لاشعوری اثرات ان کے فن پر عمر بھر ایک غلاف کی مانند لپٹے رہے۔ان کے اندر ایک خوف وڈر کی کیفیت کے علاوہ اعلیٰ طبقات کی سرپرستی اور تعلقات کا غالب رجحان رہا۔اسی نفسیات کا ایک عملی مظاہرہ فیلڈ مارشل ایوب خان کی انگریزی خودنوشت کا ترجمہ "جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی" ہے۔اسی طرح ان کا ناولٹ "دھنک" بھی ان کے اندر سماج کے خوف کا عکاس ہے۔غلام عباس معاشرتی خوف کی بدولت اسے تخلیق کے دوسال بعد منظر عام پر لائے۔"دھنک 1963ء سے لے کر 1965ء کے درمیان لکھا گیا اور یہ ناولٹ 1967ء سے 1968ء کے درمیان حلقہ ارباب ذوق میں پڑھا گیا"(۵۲) یوں ان کے افسانوں میں عریاں حقیقت نگاری کی تلاش بے سود ہے۔وہ سماجی حقیقت کو رنگین پردوں کی تہوں میں سمیٹ کر سامنے لاتے ہیں۔اس کے باوجود سماجی حقیقت نگاری ان کے ہاں نظر آتی ہے۔" کتبہ "میں معاشرتی حقیقت نچلے طبقات کی معاشی محرومیوں کی صورت میں سامنے آتی ہے جہاں اپنی خواہشات میں رکاوٹ احساس محرومی، اکتاہٹ اور بے زاری کا ذریعہ بنتی ہے۔شریف حسین کے اندر اپنی خودنمائی کی نفسیات کو غلام عباس نے عمدگی سے بیان کیا ہے:۔

> اس سنگ مرمر کے ٹکڑے پر اپنا نام کھدا ہوا دیکھ کر اسے ایک عجیب سی خوشی ہوئی۔ زندگی میں شاید یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اپنا نام اس قدر جلی حروف میں لکھا ہوا دیکھا ہو۔سنگ تراش کی دکان سے روانہ ہوا تو بازار میں کئی مرتبہ اس کا جی چاہا کہ کتبہ پر سے اس اخبار کو اتار ڈالے جس میں سنگ تراش نے اسے لپیٹ دیا تھا اور اس پر ایک اور نظر ڈال لے مگر ہر بار ایک نامعلوم حجاب جیسے اس کے ہاتھ کو پکڑ لیتا۔ شاید وہ راہ چلتوں کی نگاہوں سے ڈرتا کہ کہیں وہ اس کتبہ کو دیکھ کر اس کے ان خیالات کو نہ بھانپ جائیں جو پچھلے کئی دنوں سے دماغ پر مسلط تھے(۵۳)

"چکر" کے چیلا رام کی کام سے اکتاہٹ، بے زاری، بے لطف شام وسحر اور خود کو جانور سے بدتر خیال کرنے کا لاشعوری احساس بھی حقیقت نگاری کا مظاہرہ ہے۔میمونہ بھی خود ایک بڑی معاشرتی حقیقت بن کر سامنے آتی ہے۔رسم

ورواج کی کڑی سختیاں شادی کے انتظار میں بیٹھی لڑکیوں کے بالوں میں سفیدی پیدا کر کے زندگی کو تاریکیوں کی وادی میں دھکیل دیتی ہیں۔ بے رونق زندگی کی لاشعوری اکتاہٹ ایک مسکراہٹ سے رنگین بن جاتی ہے:۔

> اس رات اس نے خوشی خوشی سب کے ساتھ مل کر کھانا کھایا۔ وہ دیر تک بچوں سے باتیں کرتی رہی۔ آج بچے اسے یکا یک دلچسپ معلوم ہونے لگے تھے۔ اس نے چھوٹی بچی کو گود میں لیا، پھر آہستہ آہستہ اسے ہوا میں اچھالنے لگی۔ کمرا قلقاریوں سے گونج اٹھا (۵۴)

غلام عباس کو اصل میں تلخ معاشرتی حقائق کی نفسیاتی الجھنوں کے بیان کا گہرا شعور تھا۔ ان کے کردار سماجی حقیقت نگاری اور اس کے نفسیاتی الجھاؤ کا باکمال اور عمدہ اظہار ہیں۔

طبقاتی نفسیات اور کرداروں کی سمجھوتے بازی

سماج کے زیردست طبقات زندگی کی جبریت کے سامنے بے بس اور مجبور ہو کر نفسیاتی خوف میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ لیکن وہ اپنی تمام تر ناکامیوں، استحصال، گھٹن اور ناآسودگی کے باوجود زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ غلام عباس کے کردار سماج کے خوف سے اپنی خواہشات کو اپنے اندر دبانے میں کوشاں رہتے ہیں۔ ان کے ہاں زندگی کا ایک مثبت تصور ہے کہ ان کے کردار جینے کی آرزو رکھتے ہیں اور اپنی اسی خواہش کی تکمیل کے لیے وہ زندگی سے سمجھوتہ بازی کی راہ نکالتے ہیں۔ ان کی سمجھوتہ بازی کے پس پردہ جینے کی لاشعوری خواہش موجود ہوتی ہے۔ ان کے کردار اس حقیقت کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ انسان زندگی کے ساتھ جگہ جگہ سمجھوتے کرنے پر مجبور ہے۔ انسان کے معاشرتی، معاشی، جذباتی اور نفسیاتی تقاضے اسے سمجھوتوں پر مجبور کرتے ہیں۔ ان کے اکثر کرداروں کے آگے زندگی طاقت ور نظر آتی ہے۔

اس سمجھوتہ بازی کا اظہار ان کے اکثر افسانوں میں موجود ہے۔ کتبہ کا شریف حسین مایوسی، محرومی اور خواہشات کی راہ میں پیدا ہونے والی رکاوٹ کے زیر اثر اگر ایک طرف احساس محرومی اور بیگانگی کا شکار ہوتا ہے تو اس کے خاندان کی کفالت، جینے کی جبلت اور بہتری کی امید اسے سمجھوتے کی طرف دھکیلتی ہے۔ وہ ایک کلرک کی زندگی سے سمجھوتہ کر لیتا ہے۔ انسانی ذہن میں دھوکہ کھانے کی فطرت اسے بہتر مستقبل کی آس کے سہارے زندہ رکھتی ہے۔ اسی طرح میمونہ بھی اپنا گھر بسانے کی فطری خواہش کی بدولت شدید کرب میں مبتلا رہتی ہے۔ اس کو اپنی خواہشات کی تکمیل کی ہلکی سے کرن نظر آتی ہے مگر نوجوان کی اصلیت جاننے کے بعد اگلی صبح وہ پھر گاڑی میں سوار کر اپنے آبائی علاقے کی جوش سے خالی،

لگے بندھے اصولوں کے تحت دم لیتی بے کیف، خواہشات کی قاتل اور کولہو کے بیل کی مانند بسر ہونے والی مدرس کی زندگی سے سمجھوتہ کرنے پر راضی ہو جاتی ہے۔ ریشماں مائی جمی کے لیے ایک بازاری جنس کی طرح ہے۔ وہ اسے بوڑھوں کی دولت سمیٹنے کے لیے استعمال کرتی ہے۔ ریشماں کے اندر اپنی خواہشات کے برعکس ہر گھر میں جینے کی آرزو معاشرتی سمجھوتے کی عملی تصویر ہے۔ "چکر" کا چیلا رام طبقاتی سماج میں عدم مساوات کے باعث اگر زندگی سے ناخوش ہے تو نہ صرف جیتا ہے بل کہ اگلے جنم میں بھی جینے کا خواہش مند ہے۔ اس کے اندر حالات سے سمجھوتے کا عمل ہر قدم پر جاری رہتا ہے:۔

> "جواری" کے کردار تھانے سے ذلت اٹھا کر نکلتے ہیں اور کس طرح چند لمحوں ہی میں انھوں نے ذلت کے احساس سے نجات پالی۔ اسی طرح "حمام میں" کی فرخ بھابی کے پاس جمنے والی منڈی کی سمجھوتہ پالیسی پر غور کیجیے۔ اچھا یہ تو خیر چلیے ایک عمومی نوعیت کے سمجھوتے ہیں، ذرا "سمجھوتہ" والے شوہر کی مصلحت پسندی پر غور کیجیے اور دیکھیے کہ وہ خود کو قائل کرنے کے لیے کس دلیل سے کام لے رہا ہے اور بیوی کو قابل قبول بنانے کے لیے طوائفوں سے کس سطح کا موازنہ کر رہا ہے (۵۵)

کرداروں کی یہ مفاہمتیں طبقاتی دباؤ کے زیر اثر زندگی کی جبریت کا احساس دلاتی ہیں۔ زندگی طاقت ور ہے اور انسان جبلت حیات کے ہاتھوں زندہ رہنے پر مجبور ہے اسی لیے مفاہمتیں اور سمجھوتہ بازی ناگزیر ہے۔ غلام عباس کے کردار ہر طرح کی خارجی جبریت کے داخلی اثرات کے باوجود زندگی سے سمجھوتے بازی کی نفسیات اپنانے پر مجبور ہیں۔ ان کے کردار تصادم اور ٹکراؤ کی صورت میں ایک بے نام سی لچک پیدا کر کے زندگی کے دھارے کو پھر متوازن انداز سے روانی کی کیفیت سے لبریز کر لیتے ہیں۔ "کن رس" کا فیاض اپنے خاندان سمیت بازار حسن کی رونق تو بن جاتا ہے لیکن زندگی تصادم کے بجائے اس کی بیوی کو فیاض کے ساتھ کھڑا کر کے آگے بڑھنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ گلستان کالونی میں بامبے والا انقلاب سے خائف بوڑھوں کے تشدد کا شکار ہو کر ٹکراؤ کے بجائے سائیکل پر سوار ہو کر کے سمجھوتہ بازی کی طبقاتی نفسیات کے تحت حالات سے سمجھوتہ کر لیتا ہے۔ غلام عباس زندگی کی حقیقت اور اس کی معروضی صداقت کو اپنے احاطہ فن میں لانے کے لیے کرداروں کے بطون میں اترتے ہیں اور ان کی سیرت کے پوشیدہ گوشوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ اس طرح غلام عباس کی افسانہ نگاری میں طبقات کا وجود اور ان کی طبقاتی نفسیات کا گہرا شعور موجود ہے۔ انھوں نے کرداروں میں خارجی حاکمیت کے داخلی اثرات کو نمایاں کیا ہے۔ ان کے ہاں طبقاتی جبریت اور اس کی اندرونی

شکست وریخت کے علاوہ طبقاتی نفسیاتی کو مرتب اور متاثر کرنے والے عوامل کا شعور ان کے طبقاتی اور نفسیاتی شعور کا غماز اور آئینہ دار ہے۔

غلام عباس کے افسانوی کرداروں میں ایک طبقاتی و نفسیاتی شعور موجود ہے۔ ان کے ہاں معاشرے میں طبقات کے وجود کی تلاش کے علاوہ ان عوامل کی کھوج کا منفرد رجحان پایا جاتا ہے جو نہ صرف طبقات بل کہ ان کی طبقاتی نفسیات مرتب کرتے ہیں۔ ان کی انسانی نفسیات میں کمال مہارت کی تہوں میں ذاتی زندگی کے تجربات، حقیقت پسند ادب اور معاشرے کا بالغ نظری سے مطالعہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوی کرداروں کے ذریعے معاشرہ انسانی کی طبقاتی صورت پذیری کے انسانی نفسیات پر مرتب ہونے والے اثرات بے نقاب کیے۔ طبقاتی معاشرے کی خارجی جبریت سے اپنے خدوخال تراشنے والی نفسیات ان کے ہاں طبقاتی نفسیات بن کر ابھرتی ہے۔ ان کے ہاں خارجی محرکات میں جنس، معاش، قانون کی طاقت اور بیرونی مداخلت کرداروں کی داخلی ارتعاش کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ ان کے ہاں خارجی اثرات کی جبریت داخلی رازوں سے پردہ اٹھاتی ہے جہاں کرداروں کی نفسیاتی شکست وریخت کا مطالعہ، طبقاتی حیثیت کا تعین، وضع قطع اور انداز زیست سمیت کردار نگاری کے جملہ تقاضے فنی چابک دستی اور عروج فن کی صورت میں عیاں ہوتے ہیں۔

حوالہ جات

(۱) علی عباس جلالپوری، تاریخ کا نیا موڑ، تخلیقات، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۲۵

(۲) مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ کیا کہتی ہے، فکشن ہاؤس، کراچی، ۱۹۹۸ء، ص ۵۹

(۳) علمدار حسین بخاری، سید، اردو افسانے کی روایت میں غلام عباس کا مقام، مقالہ، پی ایچ ڈی، بہاءالدین زکریا یونی ورسٹی، ملتان، ۲۰۰۰ء، ص ۹۵

(۴) سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو میں تنقید کا نفسیاتی دبستان، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور، ۱۹۷۶ء، ص ۹۴

(۵) مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ کیا کہتی ہے، ص ۱۰

(۶) مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ کی آگہی، تاریخ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۳۵

(۷) احمد صغیر، ڈاکٹر، اردو افسانے کا تنقیدی جائزہ، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۹ء، ص ۳۰

(۸) ایضاً، ص ۳۲

(۹) سویا مانے یاسر، غلام عباس سوانح و فن کا تحقیقی جائزہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء ص ۲۱

(۱۰) ایضاً، ص ۳۷

(۱۱) شہزاد منظر، غلام عباس کے ۱۰ بہترین افسانے، تخلیقات، لاہور، ۲۰۰۰ء ص ۶

(۱۲) شفیق انجم، ڈاکٹر، اردو افسانہ (بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں)، پورب اکادی، اسلام آباد، ص ۱۱۱

(۱۳) سویا مانے یاسر، غلام عباس سوانح و فن کا تحقیقی جائزہ، ص ۲۱۴

(۱۴) شفیق انجم، ڈاکٹر، مضمون، غلام عباس کی افسانہ نگاری، مشمولہ، غلام عباس فکر و فن، مرتب، ایم خالد فیاض، نقش گر پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۲ء، ص ۲۴۲

(۱۵) حسن نوشاہی، مضمون، غلام عباس کے افسانے، مشمولہ، غلام عباس فکر و فن، ص ۲۴۷

(۱۶) شہزاد منظر، غلام عباس کے ۱۰ بہترین افسانے، ص ۶

(۱۷)۔ ایضاً، ص ۶

(۱۸) فردوس انور قاضی، ڈاکٹر، مضمون، غلام عباس رومانیت اور حقیقت کا امتزاج، مشمولہ غلام عباس فکر وفن، ص ۱۵۷

(۱۹) قاضی عابد، ڈاکٹر، مضمون، ہندی اساطیر اور غلام عباس، مشمولہ، غلام عباس فکر وفن، ص ۱۵۸

(۲۰) سویا مانے یاسر، غلام عباس سوانح وفن کا تحقیقی جائزہ، ص ۴۶

(۲۱) ایضاً، ص ۸۱

(۲۲) محمد علی صدیقی، ڈاکٹر، مضمون، غلام عباس کی افسانہ نگاری، مشمولہ، غلام عباس فکر وفن، ص ۲۰۸

(۲۳) عبادت بریلوی، ڈاکٹر، مضمون، غلام عباس کی افسانہ نگاری، مشمولہ، غلام عباس فکر وفن، ص ۵۶

(۲۴) سویا مانے یاسر، غلام عباس سوانح وفن کا تحقیقی جائزہ، ص ۲۳

(۲۵) فردوس انور، قاضی، مضمون، مذکور، ص ۱۵۴

(۲۶) سویا مانے یاسر، غلام عباس سوانح وفن کا تحقیقی جائزہ، ص ۲۱۴

(۲۷) علمدار حسین بخاری، ڈاکٹر، اردو افسانے کی روایت میں غلام عباس کا مقام، مقالہ، ص ۱۹۴، ۱۹۵

(۲۸) غلام عباس کے بے مثال افسانے، ترتیب وانتخاب، طاہر منصور، فاروقی، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء ص ۱۸۲، ۱۸۳

(۲۹) شفیق انجم ڈاکٹر، مضمون، غلام عباس کی افسانہ نگاری، مشمولہ، غلام عباس فکر وفن، ص ۲۳۹

(۳۰) مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ کی آگہی، ص ۷۷

(۳۱) اردو کے 13 بہترین افسانے، انتخاب، شبیر کاظمی، فیض الاسلام، راولپنڈی، ۲۰۰۹ء، ص ۹۲

(۳۲) شہزاد منظر، غلام عباس کے ۱۰ بہترین افسانے، ص ۱۳۷

(۳۳) حسن عسکری، مضمون، غلام عباس کے افسانے، مشمولہ، غلام عباس فکر وفن، ص ۳۱

(۳۴) شہزاد منظر، غلام عباس کے ۱۰ بہترین افسانے، ص ۱۱۶

(۳۵) حسن عسکری، مضمون، مذکورہ، ص ۳۱

(۳۶) مبین مرزا، مضمون، زندگی کے بہاؤ میں، مشمولہ، غلام عباس فکر وفن، ص ۲۱۳

(۳۷) شمیم احمد، مضمون، غلام عباس کے افسانے، مشمولہ، غلام عباس فکر وفن، ص ۶۴

(۳۸) شہزاد منظر، غلام عباس کے ۱۰ بہترین افسانے، ص ۶۴

(۳۹) غلام عباس کے بے مثال افسانے، ترتیب وانتخاب، طاہر منصور، فاروقی، ص ۱۶۷

(۴۰) انور سدید، ڈاکٹر، مضمون، غلام عباس معاشرتی حقیقت کا نمائندہ، مشمولہ، غلام عباس فکر وفن، ص ۱۱۱

(۴۱) غلام عباس کے بے مثال افسانے، ترتیب وانتخاب، طاہر منصور، فاروقی، ص ۲۱۶

(۴۲) ایضاً، ص ۲۱۶

(۴۳) فاروق عثمان، ڈاکٹر، مضمون، غلام عباس کا افسانہ حمام میں، مشمولہ، غلام عباس فکر وفن، ص ۱۶۵

(۴۴) غلام عباس کے بے مثال افسانے، ص ۲۵۴

(۴۵) ایضاً، ص ۳۰۸

(۴۶) عبادت بریلوی، ڈاکٹر، مضمون مذکور، ص ۵۰

(۴۷) غلام عباس کے بے مثال افسانے، ص ۳۰۱

(۴۸) ایضاً، ص ۳۲۳

(۴۹) ایضاً، ص ۳۲۵

(۵۰) ایضاً، ص ۱۱۳

(۵۱) مبین مرزا، مضمون مذکور، ص ۲۱۰

(۵۲) سویامانے یاسر، غلام عباس سوانح وفن کا تحقیقی جائزہ، ص ۱۲۰

(۵۳) شہزاد منظر، غلام عباس کے ۱۰ بہترین افسانے، ص ۸۵

(۵۴) غلام عباس کے بے مثال افسانے، ص ۲۲۴

(۵۵) مبین مرزا، مضمون، زندگی کے بہاؤ میں، مشمولہ، غلام عباس فکر وفن، ص ۲۱۵

باب نمبر۳

متوسط طبقہ اور غلام عباس کے افسانے

ہندوستان میں متوسط طبقے کے ظہور اور طبقاتی سماج میں نمو پانے والے غلام ذہنوں کی نفسیاتی، معاشرتی اور طبقاتی الجھنوں کے درست فہم کی خاطر برطانوی استعماریت اور ہندوستانی سماج کا تجزیہ ناگریز ہے۔تجارتی مقاصد کی خاطر ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد برطانوی استعماریت کا نقطہ آغاز تھا۔۱۶۰۰ء میں کمپنی بیرونی تاجروں کے ایک ادارے کی حیثیت سے ہندوستان میں داخل ہوئی اور آئندہ کے تجارتی مقاصد ومفادات کے تحفظ کی خاطر سیاسی اقتدار حاصل کرلیا۔نوآبادیاتی استعماریت پسندوں نے اپنے مقبوضات میں سیاسی، سماجی، معاشی اور علمی نوعیت کی متعدد پالیسیاں نافذ کر کے اپنے مقاصد کے حصول کی راہ ہموار کی۔

انگریزوں نے ہندوستان کے سماج کا گہرائی سے مشاہدہ کیا اور طبقات کی چکی میں پستی ہندوستان کی شکست خوردہ قوم کو یہ یقین دلایا کہ ان کے زوال اور شکست وریخت کی جڑیں خود ان کے اپنے نظام زندگی اور اقدار وروایات میں ہیں جو ان کی سماجی پستی کی ذمہ دار ہیں۔انگریز ہندوستان میں محض اپنے تجارتی فوائد سے مطمئن نہ تھے بل کہ ملک گیری کی ہوس میں اپنا استحکام اور مقبوضات کی وسعت کے قائل تھے۔انھوں نے ہندوستان کے طبقاتی سماج میں بہتر استحصال کی خاطر مقامی آبادی میں محدود پیمانے پر خوش حالی اور ترقی کے منصوبہ جات شروع کیے تاکہ اس زرخیز ملک سے سمیٹی ہوئی دولت برطانوی تمدن کی نمو کے لیے کھاد کے طور پر استعمال ہو سکے۔مقامی آبادی کو معاشی مساوات اور زندگی کی بنیادی سہولیات کی فراہمی میں قدرے چین کا احساس ہوا جس سے انگریز سامراج کے بارے میں وفاداری کے جذبات پروان چڑھے۔مقامی آبادی اوپر سے عائد کردہ امن اور اطاعت کے بدلے پیٹ بھر کر روٹی پر قناعت نہ کر پائی تو اس نے ملکی معاملات میں ہلکی ہلکی دل چسپی لینا شروع کی۔برطانوی سامراج نے اپنے مقاصد کے حصول کی غرض سے جو حکمت عملیاں نافذ کیں، ان میں اس ملک کی صدیوں پر محیط روایات واقدار کو پس پشت ڈال کر اپنے وطن برطانیہ کے فکرے دھاروں کو مشعل راہ بنایا۔

انگریزوں کے اندر بھی عقلیت پسندی اور مسیحی اخلاقیات کے دو متضاد مکاتب فکر اپنے اپنے انداز سے مصروف عمل تھے۔ان کے اثرات ہندوستان کے معاشرے پر بھی پڑ رہے تھے۔ایک طرف عقلیت پسند اہل ہند کے مذہبی جنون

اور روحانیت پرستی کے خلاف تھے تو دوسری طرف مسیحی مبلغین ان کی بت پرستی کو قابل نفرت خیال کرتے تھے مگر مقامی استحصال میں دونوں کے مفادات اور تحفظات یکساں نوعیت کے تھے۔ مقامی آبادی پر اپنی علمیت، تہذیبی ترقی، اقدار و اخلاقیات کی بہتری، ایجادات اور سماجی مساوات کا رعب ڈال کر اس جواز کو بنیاد فراہم کی کہ ہندوستانی ثقافت اور سماجی و معاشی ترقی جمود کا شکار ہے اور اس کے پس پردہ یہاں کے حکمرانوں کا فرسودہ انداز حکمرانی اور قوم کا سست اور کاہل پن ہے:۔

> اس مفروضہ کی بنیاد پر یورپی اقوام نسلی طور پر ان سے برتر اور باصلاحیت قرار پائیں۔ ترقی یافتہ، مہذب اور متمدن اقوام کی حیثیت سے ان کی یہ ذمہ داری ٹھہری کہ سست اور کاہل مقامی باشندوں پر حکومت کریں۔ ان ملکوں کے ذرائع کو استعمال کریں اور ان سست و کاہل باشندوں سے جبر و تشدد کے ذریعہ کام لیں۔ اس طرح یورپی اقوام کو مقامی باشندوں کا استحصال کرنے کا جواز مل گیا کہ وہ سختی کے ساتھ انھیں اپنے دائرہ اقتدار میں رکھیں۔(۱)

بہرحال انگریزی استعماریت کے نمائندے اپنے آپ کو ہندوستان کی معاشی و معاشرتی ترقی کا ذمہ دار سمجھنے لگے تو ان میں بھی سوچ کے کئی دھارے اور انداز سامنے آئے۔ ایک گروہ اس اصول پر قائم رہا کہ یہ سماج ناقابل تغیر اور ناقابل اصلاح ہے جب کہ ایک گروہ کا اصرار تھا کہ وسیع تر مقاصد انسانیت کی خاطر اصلاحی اقدامات کا عمل جاری و ساری رہنا چاہیے۔ "اس طرح اصلاح کی ذمہ داری کو خوش دلی کے بجائے ایک بوجھ سمجھ کر محض ادائیگی فرض کے لیے اٹھایا گیا"(۲) مقامی آبادی کی طرف سے ملکی معاملات میں دل چسپی کا عمل سست اور دھیمی رفتار سے جاری تھا جس سے سامراج پوری طرح آگاہ تھا۔ لیکن وہ اس بات کے قائل تھے کہ محض کتابوں کا علم سیاست نہ صرف ناکافی ہے بل کہ اس کے لیے آزاد اداروں کا قیام بھی ضروری اور ناگزیر ہے۔ ہندوستان میں انگریزی شعور کی بدولت اہل ہند سیاست اور علم کے نئے نئے طریقوں اور رویوں سے آگاہ ہوئے اور ان کے اندر ایک نظریاتی پل بہرکیف تعمیر ہوا جس سے دوطرفہ ذہنی تعامل شروع ہوا۔ وقت کے ساتھ ساتھ انگریزوں کا تہذیبی مشن پوری شدت سے ہندوستان کو مغربی اقدار کے مطابق ڈھالنے کی کوششوں میں جٹا رہا۔ برطانوی استعماریت کی بدولت مقامی آبادی کا معاشی استحصال ضرور ہوا اور ہندوستان کی صنعت زوال پذیر ہوئی۔ جس سے برطانوی تمدن کو عروج اور استحکام ملا۔ لیکن اس کے ساتھ اقتصادی ضروریات کے پیش نظر جدید سہولیات کی فراہمی، سکولوں اور شفاخانوں کا قیام، محدود پیمانے کی آزادی اور ملازمتوں کا حصول بھی ممکن ہوا۔ برطانوی تہذیب کی

ظاہری چمک اور متمدن زندگی سے ہندوستان کے لوگوں پر گہرا اثر ہوا۔علوم وفنون کی نئی لہر نمودار ہوئی۔ اس طرح ہندوستان میں انگریز کی آمد کے مثبت اور منفی دونوں طرح کے اثرات نے مقامی آبادی کو متاثر کیا۔

ہندوستان میں نوآبادیاتی اثرات کا حامل متوسط طبقہ

انیسویں صدی کے دوران برطانوی سامراجیت نے اپنی سیاسی، سماجی اور اقتصادی حکمت عملیوں کے ذریعے ہندوستان میں ایک ایسا نیا متوسط طبقہ پیدا کیا جس کی اس سے قبل کوئی الگ یا منفرد پہچان نہیں تھی۔اس طبقے کی اگر الگ کوئی نوعیت تھی بھی تو اس پر زبان، معاشرتی عدم مساوات، ذات پات اور طبقاتی ڈھانچے کی گہری گرد پڑی ہوئی تھی۔ اپنی انفرادیت سے ناآشنائی کی بدولت ہندوستان کا متوسط طبقہ اشرافیہ کے زیرسایہ اپنی گم نام زندگی بسر کررہا تھا۔

۱۷۹۳ء میں کمپنی کی حکومت نے ہندوستان کے لیے اعلیٰ ملازمتوں پر پابندی عائد کر کے ان کے لیے نچلے درجے کی ملازمتوں کو رواج دیا۔ ہندوستان میں کمپنی کے استحکام اور اقتدار کی وجہ سے اس پالیسی پر عمل درآمد شدت سے جاری رہا۔اشرافیہ غیرملکی زبان پر قدرت نہ ہونے اور اپنے وقار کو بحال رکھنے کی ناکام کوششوں سے زوال کا شکار ہوا۔ ہندوستان میں صدیوں سے قائم زمینداری نظام میں نام نہاد اصلاحات نے زمینداری اشرافیہ کی گرتی ہوئی ساکھ اور مرتبے میں کلیدی کردار ادا کر کے شہری بنیوں کے سودخور طبقے کو زرعی ارضی کا مالک ومختار بنانا شروع کر دیا۔زمیندار طبقے کی بربادی اور شکست وریخت نے انگریز وفاداری کا حامل نیا متوسط طبقہ پیدا کیا۔"زمیندار طبقہ اشرافیہ بھی اپنی بربادی کے ذمہ دار نظام سے مفاہمت نہیں کر پایا اور اس طرح انگریزوں کی تابع فرمانی پر ہر دم تیار یہ نیا متوسط طبقہ وجود پذیر ہوا"(۳)

یوں ہندوستان میں انگریزی استعمار قدیم طبقہ اشرافیہ کی بیکاری، شہری انفراسٹرکچر اور زرعی اصلاحات کی بدولت نئے متوسط طبقے میں بدل کر اپنے اقتدار کو طول دیا۔اس طبقے کے توسط سے انگریز اقتدار کے مراکز میں موجود تاجروں اور ساہوکاروں نے زمینوں کی خریداری کے علاوہ تجارتی قواعد میں ردوبدل سے بے پناہ استفادہ کیا۔انگریزی زبان جب دفتری زبان کے طور پر ہندوستان میں رائج ہوئی تو نچلے طبقات کے لوگ نچلی سرکاری ملازمتوں کا حصہ بنے جس سے ان کا انداز زیست بدلا۔نئی درس گاہوں کے قیام اور بدیسی زبان سے واقفیت نے ایک نئی نسل کو پروان چڑھنے کی بنیاد اور جواز فراہم کیا۔اس کی بدولت انگریزی تہذیب سے گہری عقیدت کا رجحان تیزی سے پیدا ہوا۔اس سے نئی و پرانی سوچوں اور رویوں میں ٹکراؤ کی ہلکی ہلکی لہریں نچلی سطح پر نمودار ہونا شروع ہوئیں۔انگریزی سامراج نے ہندوستانی سماج میں بڑھتی ہوئی مغربی تہذیب کی مقبولیت کے پیش نظر ہندوستانیوں کے لیے ۱۸۵۳ء میں اعلیٰ ملازمتوں میں شمولیت کی نہ صرف

اجازت فراہم کی بل کہ نئے پیشوں اور روزگار کے متعدد نئے مواقع پیدا کر کے متوسط طبقے کو استحکام مہیا کیا۔ سیاست اور معشیت کی متنوع تبدیلیوں نے مقامی متوسط طبقے کو نئی پہچان فراہم کی۔ اس کے علاوہ ذرائع آمد و رفت کی بہتر سہولیات، ذرائع ابلاغ میں جدت اور علم و ہنر کی آگہی نے متوسط طبقے کے مابین فکری اشتراک کو فروغ دیا۔ اس نئے سماجی ڈھانچے اور متنوع ایجادات و سہولیات کی بدولت اپنی اقلیت کے باوجود متوسط طبقے نے اپنا سفر شروع کیا۔ اس طبقے کے ذریعے ادب و فن قدیم پابندیوں سے آزاد ہو کر مقامی روایات و اقدار، جمالیات اور عام انسان کے معاشرتی مسائل کے قریب آ گیا۔ اسی نئی روشنی کے زیر اثر اس طبقے نے قدامت پسندوں کے خلاف اپنی جدوجہد کا آغاز بھی کیا۔

برطانوی وفاداری کا حامل مقامی متوسط طبقہ انیسویں صدی تک ایک الگ اور منفرد پہچان قائم کر چکا تھا۔ اس طبقے کو سامراج نے اپنی ضروریات اور مقاصد کے لیے پیدا کیا۔ اس کو مستحکم اور مضبوط کرنے کے لیے بنیادی سہولیات اور محدود پیمانے کی آزادی کو ممکن بنایا۔ اس طبقے کے استحکام میں ہندوستان کے جاگیردار اور بااثر طبقے کا زوال پوشیدہ تھا۔ ان سہولیات کی بدولت ہندوستان کا قدیم ڈھانچہ شکست و ریخت کا شکار ہوا۔ "اہل برطانیہ اپنے ساتھ جو جمہوری روایات لے کر آئے تھے اور جو نئے ادارے انہوں نے یہاں قائم کیے تھے اس کے نتیجہ میں ہندوستان کا فرسودہ سماجی ڈھانچہ کمزور ہوا" (۴) تعلیمی اداروں میں تمام طبقات کے بچے حصول تعلیم کی خاطر داخل ہونا شروع ہوئے۔ سرکاری دفاتر، شفا خانے، ڈاک خانے، ریلوے اسٹیشن، بس اڈے اور تجارتی مراکز تمام طبقات معاشرہ کے لیے دستیاب تھے۔ اپنی الگ شناخت قائم کرنے کے بعد متوسط طبقات نے حکمرانی کے خواب اپنی آنکھوں میں سجا لیے اور اپنے سے نچلے اور کم زور طبقات کا استحصال شدومد سے جاری رکھا۔ اس طرح برطانوی استعماریت نے غلام ذہنوں کا حامل متوسط طبقہ پیدا کر کے نہ صرف طبقہ اشرافیہ کو زوال کی طرف دھکیلا بل کہ نچلے طبقات کی بغاوت کو بھی متعدد مرتبہ ناکامی کی سمت دکھائی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کا نیا متوسط طبقہ مشترک مقاصد کی خاطر ایک باہمی قربت پیدا کرنے میں کام یاب ہوا کہ آئندہ کے ہندوستانی معاشرے میں اس کی اہمیت، وقار اور منفرد شناخت وقت کی ضرورت بن گئی۔ اس متوسط طبقے نے بتدریج اپنی حیثیت اور سماجی و معاشی حالت میں تبدیلی پیدا کی اور جمالیاتی و سماجی تقاضوں کے زیر اثر ادب و فن کو قدیم جکڑ بندیوں سے آزاد کر کے نئی فکری رویوں اور بدلتے منظرنامے کے تحت پروان چڑھایا۔

مغربی طرز زندگی کی مقبولیت

ہندوستان کا نیا متوسط طبقہ مغربی طرز کی تعلیم کی وجہ سے مغربی تہذیب و تمدن کی طرف راغب ہوا۔ سرسید تحریک

میں یہی طبقہ پوری شدت اور جوش سے مغربی تہذیب سے آگہی اور انگریزی زبان پر عبور کے علاوہ مغربی علوم وفنون سیکھنے میں ہراول دستے کے طور پر آگے بڑھا۔ جدید علوم سے واقفیت اور اپنی روایات سے گہری وابستگی کی بدولت نیا متوسط طبقہ تین اطراف میں بٹ گیا۔ ایک طرف وہ لوگ تھے جو اپنی قدیم روایات واخلاقیات اور تہذیب سے گہری عقیدت کی وجہ سے نئے رویوں کے خلاف تھے اور اپنے ماضی کے سہارے زندہ رہنا چاہتے تھے۔ ان میں ایک گروہ اپنے مذہب اور عقیدے کے ساتھ نئی تبدیلی کو قبول کرنے پر آمادہ تھا۔ ایک گروہ ان سب تقاضوں سے بالاتر ہو کر مغربی تہذیب واقدار کے ساتھ ساتھ نئے علوم وفنون کا خواہش مند تھا۔ نچلے متوسط طبقے کے اندر اس طرز کی گروہ بندیوں میں پہلا گروہ قدرے بے اثر اور محدود نوعیت کا ہے۔ اس کے برعکس دو گروہ باہم مل کر اصلاحی اور سماجی تحریکوں میں سرگرم تھے۔ ہندوستانی ادب میں حقیقت نگاری اور قوم پرستی کے ساتھ سماجی زندگی کے مسائل کی عکاسی ان طبقات کی وساطت سے اگلی منزلوں کی طرف گامزن ہوئی۔

ہندوستان میں ابھرنے والا نیا متوسط طبقہ مغربی متوسط طبقے سے بالکل الگ ضروریات اور حالات میں ظہور پذیر ہوا تھا۔ یورپی متوسط طبقہ صنعتی انقلاب اور استعماریت کے پھیلاؤ کا نتیجہ تھا جس کے اندر سرمائے اور انسانی محنت کی تنظیم و ترتیب کی طاقت موجود تھی۔ اس کے برعکس ہندوستان کا متوسط طبقہ صرف غلاموں کی ایک نئی نسل پر مشتمل تھا جس کے اندر انگریزی وفاداری کا بیج پوری مہارت اور طے شدہ منصوبے کے تحت بویا گیا تھا۔ "ہندوستان میں یہ وفادار اور مرعوب غلاموں کی ایک کھیپ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ اس لیے ان دونوں کی بنیادی اخلاقیات اور سوچ بھی مختلف ومتضاد تھی"(۵)

مغربی طرز زندگی نے ہندوستان کے سماجی ڈھانچے میں ایک ہلچل کی فضاء پیدا کی۔ ایک طویل مدت تک جاری رہنے والی رنگ ونسل اور ذات پات کی کڑی پابندیوں میں سسکتی زندگی کے اندر نئی آسائشوں کا حصول اور محدود درجے کی سماجی ومعاشی مساوات نے بدیسی آقاؤں کو ایک نعمت کے طور پر شرف قبولیت بخشا۔ اس تبدیلی کے لاشعوری اثرات کی بدولت مغربی انداز زیست کو اپنانے کا شعور پروان چڑھا۔ انگریزی مدارس میں داخلے، مغربی طرز کے لباس، پکوان، انداز نشست وبرخاست، عادات واطوار، اخلاقیات، انداز گفت گو، مشروبات، رسم و رواج کی نقالی، انگریزی زبان کا استعمال، موسیقی وفیشن اور دیگر معاشرتی تبدیلیاں نہ صرف ظاہری طور پر نمودار ہوئیں بل کہ فکری دھارے بھی ان سے متاثر ہوئے۔ اس طرح ہندوستانی سرزمین پر زندگی بسر کرنے والے متوسط طبقات کے باشندے اس ملک میں رہتے ہوئے مغربی دماغوں سے سوچنے لگے۔

اس طرح مغربی طرز زندگی کی مقبولیت دراصل غلام معاشروں کے اندر کی اس احساس کم تری کی عکاسی ہے جہاں ہمیشہ مغلوب اقوام حاکموں کا انداز زیست اپنا کر ایک ان جان سا اطمینان محسوس کرتی ہیں۔اسی اجتماعی نفسیات سے ہندوستان کا سماج مغربی اطوار سے متاثر ہوا۔برطانوی استعماریت نے ہندوستان کے متوسط طبقے کی اس اجتماعی نفسیات کو بیدار کرنے میں مغربی علوم کو مقامی درس گاہوں میں متعارف کروایا۔

> اس کا اندازہ لارڈ میکالے کی تحریروں سے ہوتا ہے کہ جس نے کہا کہ یہ رنگ و نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں گے،مگر ذہنی طور پر یورپی ہو جائیں گے۔ان لوگوں کی مدد سے ہندوستان پر حکومت کرنا آسان ہوگا فوجی طاقت کے ساتھ ذہنی تبدیلیوں نے انگریزی کلچر اور ان کے تسلط کو لوگوں کے دلوں میں بٹھا دیا(۶)

نچلے متوسط طبقے کا ہندوستانی سماج اور اس طبقے کے نفسیاتی،اقتصادی اور معاشرتی مسائل کا ذکر غلام عباس کی افسانہ نگاری میں پوری آب و تاب سے اپنا رنگ دکھاتا ہے۔تقسیم سے قبل اور جنگ عظیم دوم کے بعد کا ہندوستانی سماج غربت،بدحالی،مایوسی،معاشرتی و معاشی الجھنوں کے علاوہ سیاسی عدم استحکام کا شکار تھا۔سماج کی معاشی بدحالی کا ذکر غلام عباس افسانہ "بہروپیا" میں بڑی دردمندی سے کرتے ہیں۔افسانے میں دو نوجوان لڑکے ایک بہروپیے کو اس کے اصلی روپ میں دیکھنے کے لیے اس کا تعاقب کرتے ہیں۔ان لڑکوں کے سامنے بہروپیا جٹا دھارمی سادھو،مہاجن،پنواڑی، گوالا،تانگہ بان اور سرمہ فروش جیسے روپ بدل کر اپنی زندگی بسر کرنے کا سامان پیدا کرتا ہے۔اس افسانے کے کچھ روپ متوسط طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں جہاں ان کے لیے زندگی کا سامان پیدا کرنا انتہائی مشکل ہوتا ہے۔سماج میں انسان زندگی اپنی خواہشات کے برعکس بسر کرتا ہے۔اس کے لیے اپنی خواہشات کے متضاد جینا اور مختلف پیشوں کا انتخاب جہاں اس کی مرضی شامل نہیں ہوتی ایک بہروپ ہی کی مانند ہوتا ہے۔زندگی کی یہ جبریت فرد میں نفسیاتی الجھاؤ کا باعث بنتی ہے۔ہندوستان میں نچلے متوسط طبقے کا عکاس ایک اور افسانہ "حمام میں" ہے۔جس میں ایک مخصوص معاشرتی ماحول میں نچلے متوسط طبقے کے چند کرداروں کو دل کش انداز سے پیش کیا گیا ہے۔یہ افسانہ بظاہر فرخندہ بھابی اور اس کے چند ساتھیوں کے دل کش نقوش کا مرقع ہے مگر اس منڈلی کی مجلسی زندگی تقسیم ہند سے پہلے کے ہندوستانی سماج کی محرومیوں، خوابوں،امیدوں،عذابوں اور سمجھوتوں کا رزمیہ بن جاتا ہے۔اس افسانے کا پہلا حصہ ہمیں دکھاتا ہے کہ انگریز کے ہندوستان میں ہمارا ذہین طبقہ معاشی عدم مساوات کے باعث نفسیاتی الجھنوں میں مبتلا تھا۔ہر چیز کی شکستہ حالی مجموعی بے چینی بن کر سماج کی رگوں میں سمائی ہوئی تھی۔فرخ کا کردار ہندوستان بن کر سامنے آتا ہے جو ۱۹۴۷ء سے قبل کا تھا تو اس

کے دیگر کرداروں میں محسن عدیل ،بھٹنا گر اور مولانا جیسے ظلمت پرست کردار اسے پھر استعماریت کی طرف دھکیلتے ہیں۔ افسانے میں میر صاحب جاگیردار طبقے کا روپ ہیں جو فرخ بھابی کی صورت میں ہندوستان کو داخلی دشمنوں مولانا کی مدد سے اپنی جھولی میں ڈال لیتا ہے۔

افسانے کی پوری فضاء، ماحول، کردار، رہن سہن کے اطوار، میل جول اور باہمی گفت گو ہندوستان میں بیرونی استعماریت کی بدولت زندگی کے بے معنی پن کا غماز ہے۔ غلام عباس نے اپنے افسانوں میں ایک کردار یا شخص کے بجائے پورے سماج اور معاشرے کو اپنے متعدد افسانوں میں بیان کیا ہے۔ "آنندی" ایک ایسا کردار ہے جہاں بے شمار کردار اپنی انفرادیت کے باوجود شہر کے ایک بڑے کردار سے وابستہ ہیں۔ "بامبے والا" کی گلستان کالونی، "فینسی ہیر کٹنگ سیلون" میں حجام کی دکان، "تنکے کا سہارا" میں حاجی صاحب کا محلّہ، "حمام میں" فرح بھابی کا مکان سب اجتماعی کردار ہیں جن میں پورے سماج کو موضوع بنایا گیا ہے۔ "غلام عباس نے کسی ایک شخص کا افسانہ لکھنے کے بجائے پورے ایک محلے یا پورے ایک شہر کا افسانہ لکھنے کی کاوش کی ہے" (۷) سماج کے مجموعی بیان میں ان کے ہاں معاصر عہد کی جھلک کے دوران ہندوستان کا متوسط طبقہ اور اس پر خارجی حاکمیت اور جبلی تقاضوں کی بدولت مرتب ہونے والی طبقاتی نفسیات کا مخصوص اظہار ملتا ہے۔ ان کا متوسط طبقہ مغربی زندگی سے گہرا متاثر ہوتا نظر آتا ہے جس کا انداز زیست اور معمولات مغربی طرز زندگی کا غماز ہیں۔

غلام عباس کے ہاں متوسط طبقہ اور اس کی نفسیات

غلام عباس کے افسانوں میں متوسط طبقے کا وجود دو حوالوں سے تلاش کیا جا سکتا ہے۔ خود غلام عباس نے اپنے افسانوں کے بعض کرداروں کا تعلق متوسط طبقے سے بیان کیا ہے جس کی بدولت اس طبقے کو ان کی افسانہ نگاری میں آسانی سے پہچانا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کلرک اور سرکاری ملازمت سے وابستہ افراد کے تعارف میں متوسط طبقے کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کے ملازم پیشہ کردار وں متوسط طبقات سے وابستہ ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان پر تحریر شدہ تنقیدی مضامین میں بھی متوسط طبقے کا وجود ملتا ہے۔ " غلام عباس خواہ" کن رس" جیسا درد مندی سے بھر پور افسانہ لکھیں یا" کتبہ "، "سیاہ سفید" اور "اندھیرے میں" جیسے افسانوں میں متوسط طبقے کے مسائل و مصائب کو پیش کریں" (۸) غلام عباس کی افسانہ نگاری میں متوسط طبقے کے بارے میں ناقدین کی آرا درج ذیل ہیں:۔

متوسط اور نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے افسانوں مثلاً "بحران"، جوار بھاٹہ"، "غازی مرد"، "ہمسائے"، "فینسی ہیر کٹنگ سیلون" وغیرہ یوں تو سب کے سب کسی نہ کسی طرح سے منفرد ہیں(۹)

غلام عباس کے افسانے زیادہ تر متوسط اور نچلے متوسط طبقے کی عکاسی کرتے ہیں(۱۰)

یہ شریف حسین ہی کی نہیں نچلے متوسط طبقے کے تمام کلرکوں کی کہانی ہے(۱۱)

"بحران" دراصل متوسط طبقے کے ان افراد کا نفسیاتی بحران ہے ذاتی مکان تعمیر کرنے کی آرزو کو عملی جامہ پہنانے کی حماقت کر بیٹھتے ہیں(۱۲)

فرخندہ اور اس کے احباب نچلے اور بے وسیلہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں(۱۳)

میمونہ کا تعلق متوسط طبقے کے ایک گھرانے سے ہے۔اس کا باپ خود بھی ایک مدرس ہے(۱۴)

غلام عباس کے افسانوں میں کلرک کا کردار (جواری کا سرکاری اکاونٹینٹ، کتبہ کا شریف حسین اور دفاتر کے ملازم، چکر کا چیلا رام اوورکوٹ کے شہر کے لوگ، تنکے کا سہارا کا میر صاحب) بھی جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔کلرک سے مراد یہ ہے کہ وہ پڑھا لکھا ہے اور اسے ملازمت بھی مل چکی ہے مگر وہ تنخواہ کی کمی یا ملازمت اور زندگی کے مسائل میں الجھا ہوا ہے(۱۵)

اس طرح ناقدین کے تحقیقی مضامین کی روشنی میں کن رس، سیاہ سفید، کتبہ، حمام میں، بامبے والا، بحران اور اندھیرے میں کا تعلق متوسط طبقے سے ہے۔اس کے علاوہ جواری، تنکے کا سہارا اور جوار بھاٹہ کے کچھ کرداروں کا تعلق متوسط اور نچلے متوسط طبقے سے ہے۔ناقدین کے مضامین کے ساتھ ساتھ غلام عباس نے خود اپنے کئی افسانوں کے کرداروں، ان کے محلوں اور مکانوں کا تعلق خود متوسط طبقات سے بتایا ہے۔ان کے ملازم پیشہ کردار متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔مثال کے طور پر مختلف افسانوں کی یہ سطور دیکھیے جیسے شریف حسین کلرک درجہ دوم معمول سے کچھ سویرے دفتر سے

نکلا (کتبہ) (۱۶) وہ جواری جو کسی سرکاری دفتر میں اکاؤنٹنٹ تھا (جواری) (۱۷) یہ محلّہ خاص شرفا کا تھا۔ زیادہ تر متوسط طبقے کے لوگ ہی یہاں رہتے تھے (تنکے کا سہارا) (۱۸) "گلستان کالونی" میں صرف سرکاری ملازموں کو کوارٹر دیئے جاتے تھے جن کی تنخواہ ڈھائی سو سے ساڑھے چار سو تک ہوتی (بمبے والا) (۱۹) پھر رفتہ رفتہ فکر معاش نے مجھے "ستارہ مشرق" میں ملازمت کرنے پر مجبور کر دیا (سرخ جلوس) (۲۰) ایک حاجی صاحب تھے جو ہیڈ کلرک سے ریٹائر ہو کر پینشن پا رہے تھے (تنکے کا سہارا) (۲۱) ان مکانوں میں متوسط درجے کے لوگ رہا کرتے تھے علاوہ ازیں کچھ کمرے تھیٹر کے مالک نے اپنے ایکٹروں کے رہنے کے لیے کرائے پر لے رکھے تھے (پتلی بائی) (۲۲) اس جگہ زیادہ تر درمیانے درجے کے لوگ یا غریب غرباء ہی آباد تھے (۲۳) آخر ایک نیم سرکاری دفتر میں اسے سر چھپانے کی جگہ مل گئی تھی (اندھیرے میں) (۲۴) بیوی سے جدا رہنا اس پر اتنا شاق گزرتا کہ دفتر میں وقت کاٹنا دوبھر ہو جاتا (سمجھوتہ) (۲۵) میمونہ کو پینتیس روپے ماہوار پر لاہور کے ایک قصبے کے زنانہ اسکول میں استانی کی جگہ مل گئی (سیاہ سفید) (۲۶) غلام عباس کے مطابق کتبہ، کن رس، سیاہ سفید، بامبے والا، اندھیرے میں، سمجھوتہ، سرخ جلوس اور پتلی بائی متوسط طبقے کے نمائندہ افسانے ہیں جب کہ جواری، بحران، بہروپیا، تنکے کا سہارا اور جوار بھاٹہ کے بعض کرداروں کا تعلق بھی متوسط طبقے سے ہے۔ غلام عباس کا متوسط طبقہ بنیادی طور پر معاشی الجھن، ضروریات زندگی کہ عدم دستیابی، صاحب جائیداد ہونے کی خواہش، ناتمام آرزوؤں کا دکھ، زندگی کی دیگر الجھنوں، سماجی کش مکش، منافقت، جنسی ناآسودگی اور طبقاتی جبریت کے نفسیاتی مسائل کا شکار ہے۔ اس کے علاوہ طبقاتی نفسیات کے حوالے سے مسائل پر قابو پانے کی جستجو، آرزو اور حقیقت میں ہم آہنگی کی تگ ودو، احساس کم تری اور خود فریبی، خاندانی و اختیاری رشتوں کی کش مکش، سوچوں اور رویوں کا بدلتا انداز فکر، خود اعتمادی کا فقدان، دیگر طبقات میں انفرادیت کی کوششوں اور الجھنوں سے مفاہمتوں جیسے الجھاؤ کے گرد گھومتا ہے۔ متوسط طبقات کے اندر گریز، فرار، احساس کم تری، بیگانگی، بے چینی، داخل میں پناہ، ٹکراؤ، خیالی دنیا کی تخلیق اور مسلسل بے یقینی کے علاوہ بے چارگی جیسے طبقاتی و نفسیاتی مسائل خصوصیات سے محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ متوسط طبقات کی داخلی الجھن کے عوامل خارج سے طبقاتی سماج، اقتصادی مسائل، جنسی گھٹن، طبقاتی تشدد اور فطرت کے جبر کی صورت میں نمودار ہو کر اپنا اثر دکھاتے ہیں۔ اصل میں غلام عباس کو تلخ معاشرتی حقائق میں جنم لینے والے نفسیاتی المیوں کو گرفت میں لینے کا ہنر خوب آتا تھا جس میں ان کی اپنی زندگی کے مسائل کا لاشعوری عکس شدت سے محسوس ہوتا ہے۔ "میں نے جو نقشے کھینچے ہیں وہ بیشتر حقیقت پر مبنی ہیں" (۲۷)

آرزو اور حقیقت میں ہم آہنگی کی تگ ودو

غلام عباس کے افسانوں میں متوسط طبقہ اپنے مسائل کا گہرا ادراک رکھتا ہے اور اپنی حیثیت کے مطابق اپنے

مسائل پر قابو پانے کی جستجو کرتا نظر آتا ہے۔اس طبقے کے مسائل داخلی و خارجی نوعیت کے ہوتے ہیں۔فرد عموماً الجھنوں کے خارجی عوامل سے آگاہ ہوتا ہے مگر ان عوامل کے داخلی اور نفسیاتی اثرات اس سے پوشیدہ ہوتے ہیں کیوں کہ فرد کے تمام شعوری عوامل کی تہہ میں لاشعوری عوامل کی طاقت اپنا اثر دکھا رہی ہوتی ہے۔غلام عباس کا متوسط طبقہ معاشی جبریت کی چکی میں پستا ہوا نظر آتا ہے جہاں اس کی خواہشات اور زندگی کی ضروریات کی عدم تکمیلیت اندرونی شکست و ریخت کا باعث بنتی ہے۔" کتبہ " کا مرکزی کردار شریف حسین ایک کلرک کی حیثیت سے ملازمت اور زندگی کی معاشی الجھن میں الجھا ہوا ہے۔"وہ تنخواہ کی کمی یا ملازمت اور زندگی کے مسائل میں الجھا ہوا ہے"(۲۸)اس افسانے میں متوسط طبقے کی بے بسی، ناکام آرزوؤں، دل ہی دل میں گھٹ کر مر جانے والی خواہشات اور اس کے لاشعوری اثرات کی بدولت بے کیف و بے لطف زندگی کو دردمندی سے پیش کیا گیا ہے۔

غلام عباس نے متوسط طبقے کے مسائل اور مصائب کی بھرپور ترجمانی کے ساتھ ساتھ ان مسائل کے داخلی اثرات کو بھی نمایاں کیا ہے۔متوسط طبقہ اپنی خاص طبقاتی نفسیات کے زیر اثر اپنے مسائل پر قابو پا کر بہتر اور خوش حال زندگی بسر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔زندگی کی جدو جہد کے باوجود نا تمام حسرتیں اس طبقے کے اندر احساس کم تری کی فضا پیدا کر کے زندگی سے سمجھوتے کی راہ ہموار کرتی ہیں۔شریف حسین بنیادی طور پر طبقاتی سماج کا ایک بے بس کردار ہے جس کا بنیادی مسئلہ قلیل آمدنی اور ضروریات زندگی کی عدم دستیابی ہے۔شریف حسین اپنے مسائل پر قابو پانے کی پوری جستجو کرتا ہے مگر طبقاتی سماج کی سماجی اور معاشی ناہمواریاں اس کی نفسیاتی الجھنوں کی ذمہ دار ہیں:۔

> وہ محنت کرتا ہے، خواب دیکھتا ہے اور ان خوابوں کی تعبیر کے لیے خون پسینہ ایک کرتا ہے لیکن کچھ بھی حاصل نہیں کر پاتا۔طبقاتی جبر سارے خوابوں کو چکنا چور کر دیتا ہے کتبہ میں کوئی مذہبی، اخلاقی، معاشرتی یا سیاسی مسئلہ پیش نظر نہیں ، یہاں بنیادی حیثیت معاش کو حاصل ہے(۲۹)

غلام عباس نے متوسط طبقے کے اندر چھپی ہوئی حسرتوں کو گہرائی سے ٹٹولنے کی کوشش کی ہے۔طبقاتی نفسیات کے حوالے سے متوسط طبقہ سماج میں اپنی انفرادیت قائم کرنے کے لیے آرزو کو حقیقت میں بدلنے کی حماقت کر بیٹھتا ہے۔اس کوشش میں ناکامی اس کے اندر فرار اور گریز کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔شریف حسین کا کتبہ اس کے اندر صاحب جائیداد ہونے کی پوشیدہ خواہش کا عملی مظاہرہ ہے۔دفتر تک آمد و واپسی کے راستوں پر تعمیر شدہ مکانات، ان کے باہر کتبے اور مالک مکان کے جلی حروف میں تحریر شدہ منقش و دیدہ زیب نام اس کے اپنے مکان کی حسرت بن کر اس کی اندرونی

شکست وریخت کی راہ ہموار کرتے ہیں۔شریف حسین اپنے مسائل پر قابو پانے کی پوری کوشش کرتا ہے لیکن اس کی خواہشات اس کی حیثیت سے بڑھ کر ہوتی ہیں۔اپنی خواہشات کی تکمیل کی ایک ہلکی سے کرن اسے دوسرے کلرک کی چھٹی میں نظر آتی ہے لیکن اس کی واپسی کا خوف اور اپنے گرتے مرتبے کی فکر اس قدر شدت اختیار کر لیتی ہے کہ وہ اس کی موت کا سوچنے لگتا ہے جو طبقاتی سماج میں انسانیت کے رتبے سے گرنے کا بین ثبوت ہے:۔

> گھر پر آدھی رات تک فائلوں میں غرق رہتا پھر بھی وہ خوش تھا۔ہاں جب کبھی اسے اس کلرک کی واپسی کا خیال آتا تو اس کا دل بجھ سا جاتا۔کبھی کبھی وہ سوچتا ممکن ہے وہ اپنی چھٹی کی معیاد بڑھوالے۔۔۔ممکن ہے وہ بیمار پڑ جائے۔۔۔ممکن ہے وہ کبھی نہ آئے (۳۰)

شریف حسین ایک نیک، ایمان دار اور محنت پر یقین رکھنے والا انسان ہے جو اپنی محنت کے بل پر ترقی کا خواہش مند ہے۔طبقاتی سماج میں محنت کی مسلسل ناکامی اس کے اندر بے یقینی پیدا کرتی ہے۔اس بے یقینی کی بدولت شریف حسین کے اندر اکتاہٹ، کام سے فرار، بے چینی اور بیگانگی جیسی نفسیاتی پریشانیاں اپنی گرفت مضبوط کرتی ہیں:۔

> شریف حسین نے اب اپنے مستقبل کے متعلق زیادہ سوچنا چھوڑ دیا تھا دفتروں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر وہ اس نتیجہ پر پہنچ گیا تھا کہ ترقی لطیفہ غیبی سے نصیب ہوتی ہے۔ کڑی محنت جھیلنے اور جان کھپانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا (۳۱)

شریف حسین متوسط طبقے کا ایک نمائندہ کردار ہے جو اپنی معاشرتی انفرادیت اور سماج میں اپنی محنت کے بدولت ترقی کا خواہش مند ہے لیکن طبقاتی سماج میں عدم مساوات کی وجہ سے وہ اپنی پوری لگن کے باوجود ناکام ہو کر نفسیاتی بحران کا شکار ہوتا ہے۔اس کردار کی مدد سے غلام عباس متوسط طبقے پر خارجی عوامل کے داخلی اثرات بیان کرتے ہیں۔اس نفسیاتی مسئلے کی طرف سید علی عباس جلالپوری لکھتے ہیں:۔

> جب انسان کو اپنی تمام کوششوں کی بے حاصلی اور بے ثمری کا یقین ہو جائے تو اس کا ولولہ اقدام اور جوش عمل سرد پڑ جاتا ہے اور وہ تسخیر فطرت پر کمر بستہ ہونے کے بجائے فنا اور موت پر غور کرنے لگتا ہے۔مزید براں جبر مطلق کا یہ تصور ترقی کے خیال کو باطل کر دیتا ہے (۳۲)

"سیاہ سفید" کی میمونہ بیگم ایک چھوٹے سے قصبے کے سکول میں استانی ہے۔باپ کے انتقال کے بعد اس کے

قریبی عزیزوں میں صرف ایک بڑی بہن ساجدہ ہے جو نئی دہلی میں اپنے خاوند اور بچوں کے ساتھ رہائش پذیر ہے۔ وہ سکول کے ہاسٹل میں ہی رہائش پذیر ہے۔ ادھر میمونہ کے بالوں میں چاندی کا اضافہ ہونے لگتا ہے۔ بڑھتی عمر کا غم اور یکسانیت سے بھرپور زندگی بے کیفی اور بے رنگی بن کر لاشعوری الجھنوں کو سامنے لاتی ہے۔ اسی الجھن میں آشیانہ سازی اور خواہش تحفظ ممیّز کا کام کرتے ہیں۔ وہ گھر بسانے کی خواہش کے لیے نئی دہلی کا رخت سفر بندھتی ہے جہاں ایک نوجوان میں اپنے لیے پیار کی جھلک دیکھ کر وہ اپنے اندر زندگی کی نئی امنگ پاتی ہے۔ معاشی تنگ دستی اور قلیل تنخواہ کے علاوہ سماج کے ضابطے متوسط طبقات کی جائز خواہش کی راہ میں رکاوٹ بن کر داخلی دنیا میں ارتعاش پیدا کرتے ہیں۔ میمونہ متوسط طبقے کا ایک کردار ہے جو سماجی جبریت کی بدولت شادی کے بندھن میں بندھنے سے قاصر ہے:۔

> شباب کی سرحد میں قدم رکھتے ہی لڑکی کو دو پریشانیاں لاحق ہوتی ہیں، رومان کی تلاش اور شادی کی تمنا۔ وہ کسی قسم کے تعلق کا رومانی عنصر کے بغیر تصور ہی نہیں کر سکتی۔ جس لڑکی کی منگنی نہ ہو پائے وہ اپنے آپ کو "بے روزگار" محسوس کرنے لگتی ہے اور بے روزگاروں ہی کی طرح ذہنی پریشانی اور جذباتی خلفشار میں مبتلا ہو جاتی ہے (۳۳)

غلام عباس متوسط طبقات کے اندر جنسی ناآسودگی کو معاش اور سماج کے تلخ ضابطوں سے ابھرتا ہوا دکھاتے ہیں۔ وہ متوسط طبقات کی طبقاتی نفسیات بیان کرتے ہوئے اس طبقے میں زندگی بسر کرنے والی عورتوں کی خواہش تحفظ اور آشیانہ سازی میں پیدا ہونے والی رکاوٹ کے نفسیاتی مسائل کو بھی سامنے لاتے ہیں۔ ان کے نزدیک عورت کا مقصد اولی ارشتہ ازواج میں منسلک ہو کر شخصیت کی تکمیل کرنا ہوتا ہے اور اگر وہ اس مقصد میں ناکام ہو جائے تو خود کو فریب خوردہ، استحصال زدہ اور گم کردہ راہ تصور کرتی ہے۔ اس میں تاخیر اور رکاوٹ داخلی شکست وریخت کا طاقت ور محرک بن جاتی ہے۔

عورت کے حوالے سے نفسیاتی الجھنوں کا اظہار "سیاہ سفید" کے علاوہ "حمام میں" کی فرخندہ، "بھنور" کی گل اور بہار "سایہ" کی بڑی صاحبزادی اور "تنکے کا سہارا" کی سیدانی میں محسوس کیا جا سکتا ہے جہاں یہ ساری عورتیں گھریلو زندگی بسر کرنے کی خواہش مند ہیں جس کے پس پردہ آشیانہ سازی اور خواہش تحفظ جیسی نفسیاتی الجھنیں اپنا اثر دکھا رہی ہوتی ہیں۔ غلام عباس معاشی ناآسودگی کی بدولت زندگی میں پیدا ہونے والی بدمزگی اور بے لطفی کو متوسط طبقات میں گہرائی سے تلاش کرتے ہیں اس کی وجہ ان کے سوانح اور فن کا نفسیاتی تعلق ہے جو ان کے فن پر شدت سے اثر انداز ہوا۔ غلام عباس متوسط طبقے کی طبقاتی نفسیات میں آرزو کو حقیقت میں بدلنے کو ایک بڑی حماقت قرار دیتے ہیں جس

سے نفسیاتی الجھنوں کی راہ ہم وار ہوتی ہے۔ میمونہ بھی اپنی نا آسودگی کو آسودگی میں بدلنے کی حماقت کر بیٹھتی ہے جس میں ناکامی مستقل روگ بن کر زندگی میں تاریکی کا بیج بوتی ہے۔ اس کی واپسی کا منظر نہ صرف بے چینی، اکتاہٹ، بے رنگی خواہشات اور جذبات کی موت جیسے لاشعوری الجھاؤ کا عکاس ہے بل کہ اسے اپنی عمر بھی بڑھتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ "وہ کھڑکی سے لگی بیٹھی ہر چیز کو بڑی بے توجہی سے دیکھ رہی تھی اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ پانچ برس اور بوڑھی ہو گی ہو" (۳۴)

آرزو اور حقیقت کی نفسیاتی الجھنوں کے مابین جھولتا ہوا متوسط طبقے کا ایک اور افسانہ " کن رس" بھی ہے جس کا مرکزی کردار فیاض اپنے دل میں بچپن سے موسیقی کا شوق چھپائے ہوئے ہے۔ اس کا والد مولوی طرز کا انسان ہے جس کی سخت اور جابرانہ گھریلو حاکمیت سے فیاض اپنا شوق پورا کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ پھر ملازمت، شادی، والد کا انتقال اور دیگر خاندانی و سماجی ذمہ داریاں اس کے شوق کی راہ میں حائل ہو جاتی ہیں۔ اس کے لاشعور میں دبی خواہش اور شوق موسیقی سر تال کی آواز سن کر کبھی کبھی شعور کی وادی میں ابھر آتی ہے۔ ایک دن دفتر سے واپسی کے دوران وہ ایک بوڑھے فقیر حیدری خان کو سرود بجاتے ہوئے سن لیتا ہے۔ اسی لمحے اس کے بچپن کی خواہش اور دل میں پوشیدہ آرزو حقیقت کا روپ دھارنے کے لیے بے چین ہو جاتی ہے کیوں کہ خواہشات کو خارج کے خوف سے دبانے کی صورت میں وہ نہ صرف لاشعور میں زندہ بل کہ کئی نفسیاتی مسائل پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ موقع پاتے ہی اپنی تکمیل کا سامان پیدا کر لیتی ہیں۔

> اس نے اپنی زندگی کا مقصد فقط عزت و آبرو کی روزی کمانا اور بچوں کی پرورش کرنا قرار دے لیا تھا اور وہ یہ فرض بڑی مسرت کے ساتھ انجام دے رہا تھا اور اگر اس کی زندگی میں کسی چیز کی کمی رہ جاتی تو اصغری سے اس کی والہانہ گرویدگی اس کمی کو پورا کر دیتی تھی مگر اب اس موسیقی کو سن کر اسے ایسی محسوس ہوا جیسے اس کے دل کے اندر کوئی سوئی چیز دفعتاً جاگ اٹھی ہو (۳۵)

فیاض اپنی آرزو کو حقیقت میں بدلنے کی طبقاتی نفسیات کے زیر اثر حیدری خان کو گھر لے آتا ہے۔ اپنی بیوی اصغری کی مخالفت کے باوجود وہ اس کو اپنے گھر میں مستقل قیام اور دیگر آسائشیں مہیا کرتا ہے۔ حیدری خان کو فیاض کی بیوی اصغری کی سخت مخالفت کا سامنا ہے جس کو وہ اپنے تجربے کی بدولت کمال مہارت سے قابو میں لاتا ہے۔ اس موقع پر غلام عباس عورتوں کی نفسیات کو فنی چابکدستی سے احاطہ تحریر میں لاتے ہیں۔ ان کے مطابق عورت کی خوشامند اور جھوٹی تعریفیں اس کے اندر نرگسیت کی نفسیاتی الجھن کو بیدار کرتی ہیں۔ محض مرد کے چند توصیفی کلمات عام خواتین کو مبتلائے فریب کر سکتے ہیں "بنیادی طور پر خوشامد پسند لوگ وہ ہوتے ہیں جو حب ذات میں ڈوبا ہوا نرگسی ذہن رکھتے ہیں جن کو لاشعوری طور پر اپنی کسی کمی یا محرومی کا احساس ہوتا ہے، جو حقائق سے چشم پوشی کا رجحان رکھتے ہیں جب کوئی فرد ان کی چاپلوسی کرتا

ہے تو ان کی انا کی تسکین ہوتی ہے"(۳۶) حیدری خان دراصل اصغری کی مخالفت کو کم کرنے اور اپنے مستقل قیام کی خاطر اس کی خوشامند شروع کرتا ہے۔ اپنے ٹھکانے کے علاوہ حیدری خان اپنی عیاری اور منافقت سے اس خاندان کی دو بیٹیوں کو طوائف بنا کر مستقل آمدنی کی راہ ہموار کرنے کا خواہش مند ہے۔ "رفتہ رفتہ اس کی تعریفوں میں اصغری کو مزہ آنے لگا۔ وہ کبھی کوئی خاص چیز پکاتی تو دل میں کہتی۔ "دیکھیں آج خان صاحب کیا کہتے ہیں"(۳۷)

اہل محلّہ گانے بجانے اور حیدری خان کے دخل سے نالاں ہو کر فیاض کو محلے سے نکال دیتے ہیں۔ حیدری خان فیاض کو خاندان سمیت بازار حسن میں منتقل کر دیتا ہے۔ فیاض نے اپنے خاندان کی پرورش کے لیے دفتر کے علاوہ شام کو ٹیوشن پڑھا کر اپنے مسائل پر قابو پا لیتا ہے مگر متوسط طبقے کی طبقاتی نفسیات کی بدولت اپنی آرزو کو حقیقت میں بدلنے کی حماقت کے زیر اثر اپنے خاندان کے گرد پھیلنے والے جال سے بے خبر رہتا ہے۔ وہ سماج میں قدرے مالی آسودگی کی وجہ سے اپنی خواہشات کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے جس میں اس کی انفرادیت کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے۔ اس حماقت سے وہ زندگی کی الجھنوں میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ متوسط طبقات کے اندر آرزو کو حقیقت میں بدلنے کی خواہش دراصل ایک احساس کم تری کے لاشعوری اثرات سے پروان چڑھتی ہے۔ یہ طبقہ سماج میں اپنی انفرادیت قائم کرنے میں کوشاں نظر آتا ہے۔ "بحران" میں سہیل اپنی سماجی انفرادیت کی خاطر مکان بنانے کی آرزو کو حقیقت میں بدلنے کی کوشش میں نفسیاتی بحران کا شکار ہو جاتا ہے۔ اپنی اسی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے دوران اس کے اندر بے چینی، اکتاہٹ، راج مستریوں اور مزدوروں کی چالاکیوں سے صرف نظر اور بزدلی کا جذبہ اسے سماج کے دیگر انسانوں سے بھی متنفر کر دیتا ہے۔ غلام عباس متوسط طبقے کی طبقاتی نفسیات بیان کرنے کے دوران اس حقیقت کو سامنے لاتے ہیں کہ انسان فطری طور پر اقامت اور آشیاں سازی کا رجحان رکھتا ہے۔ اس مشقت بھری دنیا میں گھر فرد کے لیے سکون اور راحت کا گوشہ ہے۔ یہ اس کے لیے دارالقیام ہی نہیں دارالامان بھی ہے۔ ایک محفوظ پناہ گاہ جس کے بغیر اسے ہمیشہ عدم تحفظ کا کھٹکا سا لگا رہتا ہے۔ مکان بنانے کی فطری خواہش کے علاوہ متوسط طبقات اس کو اپنے سماجی مرتبے کا ذریعہ بھی بناتے ہیں۔ مکان کی مکانیت، سائز اور تزین و آرائش سے صاحب خانہ کی معاشی و معاشرتی حیثیت کا بھی تعین ہوتا ہے۔ مکان کی تعمیر دراصل سماج میں صاحب جائیداد ہونے کی لاشعوری خواہش کا عملی اظہار ہے:۔

> مکان بنانے کی آرزو انسان کی فطرت کا لازمہ ہے۔ یہ وہ آرزو ہے جو بچپن ہی سے جب وہ گھروندے بنا بنا کر کھیلتا ہے اس کے دل میں گھر کر لیتی ہے اور عمر بھر کبھی ابھرتی کبھی دبتی رہتی ہے۔ عمر کے کسی دور میں جب کبھی اسے ذرا سی خوش حالی

نصیب ہوتی ہے وہ اپنی اس دیرینہ خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے تا کہ
صاحب جائیداد ہونے کا فخر حاصل کر سکے(۳۸)

غلام عباس کا متوسط طبقہ اپنی طبقاتی نفسیات کی بدولت سماج میں انفرادیت قائم کرنے، آرزو اور حقیقت کی تگ ودو اور ذاتی املاک کا رجحان رکھتا ہے۔ اسے اگر اس کوشش میں ناکامی بھی ہو تو وہ خود فریبی کا سہارا لے کر اپنی جستجو جاری و ساری رکھتا ہے۔ انسانی زندگی انھی فریبوں سے عبارت ہے۔ متوسط اور نچلے طبقات کا یہی المیہ ہے کہ ایک نسل جس کرب سے گزرتی ہے تو اگلی نسل اپنے اجداد کی ناکامی پر غور کرنے کے بجائے خود کو ان سے بہتر سمجھ کر اسی راہ کی ناکام مسافر بن جاتی ہے۔ "کتبہ" کا شریف حسین طبقاتی سماج کی بدولت جس ذہنی کرب ناکامی اور جبریت سے گزر کر موت کا سفر اختیار کرتا ہے تو اس کا بیٹا باپ کی قبر پر کتبہ نصب کر کے اپنے لیے بہتر مستقبل کے خواب اپنی آنکھوں میں سجا کر ایک نئے فریب کی راہ ہموار کرتا ہے۔ میمونہ بھی نئی دہلی سے ناکامی، بے رنگی اور کرب سے بھرپور واپسی کے سفر میں اس خیال کا دامن تھامے رکھتی ہے کہ اگر زندگی مہربان ہو جائے تو گاؤں میں بھی رنگینی، خوش دلی اور آسودگی کی صورت نکل سکتی ہے۔ کن رس کا فیاض بھی اپنے خاندان سمیت شرافت اور مروجہ اخلاقیات سے بھرپور زندگی کو خیر آباد کہہ کر بہتری کی آس کے سہارے ایک نئے فریب کا دامن پکڑ لیتا ہے۔ بحران کا پروفیسر سہیل ایک طویل ذہنی کرب اور داخلی انتشار سے گزرنے کے باوجود ایک نئے گھر کی تعمیر پر کمربستہ ہو جاتا ہے۔ "اندھیرے میں" کا نوجوان اپنے دل میں دبی شراب نوشی کی آرزو کو کناٹ پیلس کی رنگین فضا میں حقیقت کا روپ عطا کر کے فریب خوردگی اور حماقت کی دلدل میں گم ہو جاتا ہے۔ متوسط طبقات اپنی طبقاتی نفسیات کے زیر اثر آرزو کو حقیقت میں بدلنے کی خواہش انفرادیت کی احساس کم تری کی لا شعوری گرفتوں سے ممکن بناتے ہیں اور ناکامی کے احساس سے بچاؤ کا سامان فریب خوردگی کی صورت میں محفوظ رکھتے ہیں۔ اس طبقے کی نفسیاتی الجھنوں کا تعلق معاشی، معاشرتی اور جنسی ناآسودگیوں سے جڑا ہوتا ہے۔ متوسط طبقہ اپنے خاندانی رشتوں کے ذریعے نچلے طبقات سے گہری وابستگی رکھتا ہے۔ وہ سماجی ڈھانچے میں اپنی انفرادیت کا خواہش مند ہوتا ہے اور خود کو سماج کے نچلے طبقات سے الگ پہچان اور مقام دلوانے کا گہرا رجحان رکھتا ہے۔ اس کے اندر احساس کم تری کی الجھن اسے سماج کے اعلیٰ طبقات سے مراسم استوار کرنے پر اکساتی رہتی ہے۔ یہ احساس کم مائیگی اس لیے ابھرتا ہے چوں کہ اس طبقے کا ظہور نچلے طبقات کی معاشی شکست وریخت سے ہوتا ہے اور نچلے طبقات میں بسر کی ہوئی زندگی کے مصائب اسے بے چین کیے رکھتے ہیں۔ نچلے طبقات کی سسکتی زندگی اور دم توڑتے ارمان اسے سماج کے اعلیٰ طبقات میں شمولیت کے لیے اکساتے ہیں۔

متوسط طبقہ ایک طرف اپنے خاندانی پس منظر کی وجہ سے بڑے پیمانے پر نچلے طبقات سے جوڑا ہوتا ہے جس سے وہ خود کو الگ کرنے کی شدید آرزو رکھتا ہے مگر دوسری طرف وہ اس طبقے سے مکمل فرار اور الگ ہونا بھی نہیں چاہتا کیوں کہ اس کا وقار اور عزت نچلے طبقات ہی سے قائم دائم ہے۔ سماج کے اعلیٰ طبقات میں متوسط طبقے کی اہمیت کاروباری نوعیت کی ہوتی ہے۔ اس لیے متوسط طبقے کو اپنی خواہشات کے برعکس اپنی انفرادیت کے لیے نچلے طبقات کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے اور اس طبقے کی طبقاتی نفسیات میں پنڈولم حرکت کا نقطۂ آغاز اسی مقام سے ہوتا ہے۔ متوسط طبقہ اپنے خاندانی اور اختیاری رشتوں کی کش مکش میں جھولتا رہتا ہے۔ اسی الجھن کی وجہ سے متوسط طبقہ ایک انجانے خوف، دہشت، بے یقینی، اضطراب اور ڈر جیسے نفسیاتی الجھاؤ میں مبتلا رہتا ہے اور ایک طرح کی دوہری کش مکش کے دھندلکوں میں محو سفر ہوتا ہے۔ "فرار" کا ماموں سرفراز زندگی بھر خاندانی اور اختیاری رشتوں میں الجھا رہا۔ وہ ایک متوسط طبقے کا فرد ہونے کی وجہ سے اپنی معاشرتی انفرادیت کا خواہش مند ہے۔ وہ نواب ظہیر الدولہ کی صاحب زادی سے شادی کا متمنی ہے۔ نواب صاحب اس پر بی۔ اے پاس کرنے کے علاوہ دو لاکھ روپے نقد مہر کی شرائط عائد کرتے ہیں۔ ان شرائط میں اعلیٰ طبقات کی تعلیمی اور معاشی انفرادیت کا رجحان اور سماج کے زیر دست اور خود میں ایک حد امتیاز قائم رکھنے کی سوچ کا اظہار پوشیدہ ہے۔ سرفراز ماموں شادی کی شرائط پوری کرنے کے باوجود شادی کے دن گھر سے بھاگ جاتے ہیں۔ اس کا بھاگنا اس نفسیاتی دباؤ کی وجہ سے ممکن ہوتا ہے جہاں وہ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے اپنے خاندان کی معاشی قربانی سے گریز کرتا ہے۔ یہ بھی متوسط طبقات کی معاشی نا آسودگیوں کے لاشعوری اثرات ہیں جو ہمیشہ اس کے ساتھ مضبوطی سے چمٹے رہتے ہیں۔ "شاید یہ وجہ ہو کہ وہ اپنے والد اپنے بھائیوں اور ان کے بچوں سے ان کی جائیداد چھین کر انہیں مفلس و قلاش بنانا نہیں چاہتے تھے" (۳۹) اختیاری اور خاندانی رشتوں کے درمیان الجھاؤ ہوا ایک اور کردار مکرجی بابو ہے جو متوسط طبقے کا ایک فرد اور افسانہ " مکرجی بابو کی ڈائری" کا مرکزی کردار ہے۔ اس نے خود کو لندن میں مصروف کر لیا ہے۔ اس کا نہ وطن واپسی کا کوئی ارادہ ہے اور نہ کوئی خاص زندگی کا مقصد ہے۔ اس نے وقت گزاری کے لیے لوگوں سے جان پہچان بنا رکھی ہے۔ اپنے بچپن کی تنگ دستی اور نچلے طبقات کی آرزوؤں سے خالی سسکتی زندگی کی لاشعوری مایوسی اس کی واپسی کا راستہ روکے ہوئے ہے۔ ایک طرف اپنے دیس اور اپنے خاندان کی لاشعوری کشش اسے اندر سے بے تاب کیے رکھتی ہے تو دوسری طرف متوسط طبقے کی انفرادیت اور اختیاری رشتوں میں پرسکون رہنے کی طبقاتی نفسیات اسے دیار غیر میں بھی مطمئن رکھے ہوئے ہے۔

متوسط طبقہ اپنے خاندانی اور لازمی رشتوں کے بجائے اختیاری تعلقات میں زیادہ کشش محسوس کرتا ہے۔ جہاں

اسے دو وقت کی روٹی اور تھوڑی سی عزت و توقیر ملتی ہے وہ سب کچھ چھوڑ کر وہیں کا ہو رہتا ہے۔ مکرجی بابو کی ڈائری میں اختیاری رشتوں کے فون نمبر، گفت گو کا انداز، موسم کی کیفیت، بادلوں کا چھانا اور سورج کی آنکھ مچولی کے ظاہری اثرات اس کی اپنے وطن میں گزری یادوں کو بیدار کر کے اسے بے چین کرتے ہیں جس کے لیے وہ مس نور اٹریک کو فون کرتا ہے۔ یہ دراصل داخلی الجھنوں سے چھٹکارے کی شعوری کوششوں کا عمل ہے۔ اس کردار میں غلام عباس کی لندن میں بسر ہونے والی اپنی زندگی کی کش مکش بھی محسوس ہوتی ہے کیوں کہ تخلیق کار کی اپنی زندگی کا عکس اس کے فن پر مختلف زاویوں سے اثر انداز ہوتا رہتا ہے۔ "جس طرح غلام عباس کے بچپن کا ماحول بعد کے افسانوں کے (کا) پس منظر بن گیا تھا اس طرح قیام لندن کے واقعات بھی ان کے بعد کے افسانوں کا پس منظر یا موضوع بن گئے مثلاً' مکرجی بابو کی ڈائری' اور 'ایک دردمند دل' ہیں (۴۰) اس کے علاوہ "بامبے والا" میں پوری گلستان کالونی اختیاری رشتوں کو نبھانے اور اپنی الگ شناخت قائم کرنے کی خاطر آباد ہوتی ہے۔ اس کالونی کا ہر مکین اسی کوشش میں مگن ہے۔ اسی طرح "تنکے کا سہارا" میں حاجی صاحب اور انجینئر چوہدری فتح محمد بیوہ سیدانی سے ساری ہم دردیاں اختیاری رشتوں ہی کے گرد گھومتی ہیں۔

متوسط طبقے کا بدلتا انداز فکر اور خود اعتمادی کا فقدان

متوسط طبقہ اپنی معاشرتی انفرادیت، طبقاتی شناخت اور خاندانی و اختیاتی رشتوں کی لاشعوری گرفت کے علاوہ خود اعتمادی اور قناعت کے فقدان کا شکار ہے۔ متوسط طبقے کی یہ طبقاتی نفسیات ان طبقات میں بدلتے انداز فکر کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ انداز فکر کی یہ تبدیلی بتدریج رویوں، جذبات و احساسات، فکر و سوچ اور تعلقات میں بدلتے انداز میں محسوس کی جا سکتی ہے۔ اس تبدیلی میں وہ لاشعوری محرکات اپنا اثر دکھا رہے ہوتے ہیں جو ان کو معاشرتی ڈھانچے میں الگ شناخت پر اکساتے ہیں۔ "فرار" کے سرفراز ماموں کا شادی کے دن گھر سے بھاگ جانا اور ایک طویل مدت کے بعد واپس لوٹنا متوسط طبقے میں اعتماد کے فقدان کی عکاسی ہے۔ اس کے اندر اعتماد کی کمی اس پر ازلی محرومی اور مستقل بنجر پن کی صورت میں ظاہر ہو کر اسے گوشہ نشینی کی راہ دکھاتی ہے۔ بدلتے انداز فکر کا ایک اور کردار "دو تماشے" کا مرزا برجیس قدر بھی ہے۔ وہ شہر میں جوتے خریدنے کے دوران ایک بوڑھے بھکاری اور اس کی پانچ سالہ بیٹی کو شہر میں بھیک مانگتے دیکھ کر ان پر کوئی توجہ نہیں کرتا۔ کچھ دن بعد ایک فلم میں بھیک کے مناظر اس کو رونے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ایک طرف وہ بھیک مانگنے والوں سے لاتعلقی کا اظہار کرتا ہے مگر دوسرے ہی لمحے اس کے اندر ہم دردی کے جذبات بھی پیدا ہو کر اس کی شخصیت کے دوہرے غلاف کو اتار دیتے ہیں۔ متوسط طبقہ اپنی شناخت قائم کرنے کی شعوری کوشش ضرور کرتا ہے لیکن

نچلے طبقات سے خاندانی روابط کی بدولت اس کے اندازِ فکر میں فوراً تبدیلی اس کے نفسیاتی بحران کا بھی باعث بنتی ہے۔ افسانہ "پتلی بائی" میں پتلی بائی متوسط طبقے کا ایسا کردار ہے جو اندر سے خود اعتمادی کے فقدان کا شکار ہے۔اس کی مصروفیات سے بھری فلمی طرز کی زندگی کی تہہ میں اس کی معاشی مجبوریاں، سماج میں اپنی انفرادیت اور الگ پہچان کی طبقاتی فضیلت مصروف عمل ہے۔اس کی مشینی نوعیت کی زندگی اس کے عورت پنے کے متوازی چلتی ہے۔اس کی زندگی جبریت کی ایک علامت ہے۔اپنی ڈھلتی عمر میں اس کے بچپن کا ایک نوجوان عاشق اس کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے جب وہ اپنی جوان سال خوبرو بیٹی کے ساتھ سیر میں مصروف ہوتی ہے۔اپنے اندر اعتماد کی گرتی دیوار کے زیر اثر وہ نوجوان کو اپنی بیٹی کا عاشق سمجھ کر اس سے الجھ جاتی ہے۔ایک طرف پتلی بائی خود کو سماج کے سامنے ایک مہذب عورت کے طور پر پیش کرتی ہے لیکن اس کے اندر کی عورت ایک خوف میں مبتلا ہے۔اپنی بیٹی کے بارے میں اس کی فکر فلمی زندگی کے وہ لاشعوری محرکات ہیں جہاں عورت کی عزت و حیا کاروباری بندھوں سے بندھی ہوتی ہے۔وہاں کی ہر مسکراہٹ، ادا، اندازِ گفت گو، رشتے ناتے اور میل جول کاروباری تقاضوں کے گرد گھومتے ہیں۔کتبہ کا شریف حسین بھی بدلتے اندازِ فکر اور اعتماد کی کمی کا شکار ہے۔اس کے مستقبل کے سارے منصوبے، مکان بنانے کی خواہش، کتبے کی تراش خراش اور سجاوٹ میں فکر و سوچ کی تبدیلی کی تہہ میں اس کی اپنی ذات کا عدم اعتماد اثر دکھاتا ہے۔اپنی محنت کے باوجود ترقی میں ناکامی کا لاشعوری خوف شریف حسین میں اعتماد کی کمی کو فروغ دیتا ہے۔متوسط طبقات معاشرے کی طبقاتی بنت کی بدولت اپنی لاحاصل محنت میں ناکام ہو کر احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں جہاں سے اعتماد کی کمی اور بدلتے رویوں کا آغاز ہوتا ہے۔میمونہ کا دورانِ سفر خواہشات کا ابھرنا، ارادوں کا ٹوٹنا، کناٹ پیلس کے قہوہ خانوں میں کھوئے کھوئے رہنا، اجنبی نوجوان پر فریفتہ ہونا اور اگلے دن کی بھرپور تیاری، نوجوان کی اصلیت پر اعتماد کی گرتی دیوار اور واپسی کا بے رونق سفر متوسط طبقے کا بدلتا اندازِ فکر اور اعتماد کی کمی کی عکاسی ہے جو متوسط طبقے کی خاص طبقاتی نفسیات ہے۔ایک طرف میمونہ اپنی خواہشات اور مسائل پر قابو پانے کی جستجو کرتی ہے تو اس میں ناکامی اور خواہشات کی عدم تکمیلیت متوسط طبقے کی طبقاتی نفسیات بن کر سو روپے کے بے کار مصرف پر الجھاؤ کا شکار ہو جاتی ہے۔متوسط طبقے کی طبقاتی نفسیات میں پیسے کی قلت اکثر مقامات پر طاقت ور محرک بن کر ظاہر ہوتی ہے۔جیسے کہ غلام عباس ایک افسانے میں لکھتے ہیں:۔

> اس کے منی بیگ میں صرف پندرہ روپے اور کچھ ریزگاری رہ گئی تھی۔سو روپے کے یوں بیکار مصرف اٹھ جانے پر اس کا دل بھر بھر کر آتا تھا۔کیا یہ اچھا نہ ہوتا کہ وہ اس کا کوئی زیور بنا لیتی جو آڑے وقت میں اس کے کام بھی آتا (۴۱)

بہتر طبقات میں شمولیت کی خواہش

متوسط طبقے کی طبقاتی نفسیات میں اپنے بلند اور بہتر طبقات میں شمولیت کی شدید خواہش بھی پائی جاتی ہے۔سماج کے نچلے اور اعلیٰ طبقات میں انفرادیت قائم کرنے کی شعوری کوشش کے پس پردہ بھی ایک احساس کم تری پوری طرح اس طبقے کو بے چین کیے رکھتی ہے۔"بامبے والا" کی پوری گلستان کالونی کا تعلق متوسط طبقے سے ہے۔اس کے سارے مکین اپنی خاندانی جڑیں نچلے طبقات میں رکھنے کے باوجود اعلیٰ طبقات میں گردانے جانے کی گہری آرزو رکھتے ہیں۔اپنی تنگ دستی کے باوجود مکانوں کی آرائش،رہن سہن،بات چیت، کھانوں میں تکلف،دل چسپیاں اور شوق،اخبارت کی روزانہ طلبی،انگریزی الفاظ کا غیر ضروری استعمال اور روشن خیالی کی سبھی شعوری کوششیں بہتر طبقات میں شمولیت کی لاشعوری خواہشات ہیں۔مثلاً دیکھیے:۔

> اس کالونی کے باشندے متمدن سمجھے جانے کے بہت متمنی تھے۔تنگی ترشی میں گزر کرتے،مگر ظاہری ٹھاٹھ میں فرق نہ آنے دیتے۔ہر گھر میں صبح کو پابندی کے ساتھ ڈبل روٹی،مکھن اور اخبار آتا،اخبار کا صاحب خانہ بے چینی سے منتظر رہتا(۴۲)

اس کے علاوہ پوری بستی میں ناچ گانے،موسیقی کے شوق اور تعلیم،میوزک پارٹیاں،عورتوں میں بناؤ سنگار کے نت نئے طریقے اور مرد وزن کی بلا روک ٹوک ملاقاتیں اعلیٰ طبقات میں شمولیت کے شعوری مظاہرے ہیں۔یہ سارے تکلفات اور شوق اس بستی کے متوسط طبقے کے لیے نہ صرف غیر ضروری بل کی معاشی تنگ دستی کے بھی ذمہ دار تھے لیکن سماج میں صاحب حیثیت ہونے اور قابل رشک زندگی کی طلب ایک داخلی بے چینی بن کر اس طبقے کو اکساتی رہتی ہے۔متوسط طبقہ سماج کے نچلے طبقات سے اپنا تعلق اسی لیے بحال رکھتا ہے تا کہ اس کی ظاہری چمک ان طبقات کو مغلوب کر کے اس کی انفرادیت اور بالادستی قائم کر سکے۔متوسط طبقات کے اندر اعلیٰ طبقات میں شمولیت کی خواہش اور اکثر اوقات عدم قبولیت کا خوف ان کے اندر ایک مسلسل کرب کی فضاء تیار کرتا ہے۔ان ساری ظاہری اور کھوکھلی کوششوں میں ایک طبقاتی برتری کا عنصر کارفرما ہوتا ہے۔اس طبقے کا وجود چوں کہ کھوکھلے،احساسات سے خالی خود ساختہ اصولوں اور رویوں پر استوار ہوتا ہے جس سے ان کے آپس کے باہمی تعلقات و روابط بھی اندر سے خالی اور بناوٹی نوعیت کے ہوتے ہیں۔اس لیے یہ طبقہ بنیادی انسانی اوصاف سے عاری ہوتا چلا جاتا ہے جو ایک مدت بعد نہ صرف ان کی اپنی مستقل الجھن کا باعث بنتا ہے بل کہ دیگر طبقات اور انسانی رشتوں میں ان کو الگ تھلگ کر کے دائمی بے چینی اور بے رنگی کا سبب بنتا ہے۔ان کی انفرادیت

اور خود ساختہ پہچان کے محلات کم زور بنیادوں پر استوار ہوتے ہیں جہاں ایک لمحے کی حماقت ان کو زمین بوس کر دیتی ہے۔ گلستان کالونی کی ظاہری چمک، اصلی انسانی رشتوں سے خالی بت، خود کو اپنی جڑوں سے اکھاڑنے کی ناکام حماقت کے اسیر اور سماجی اخلاقیات کے مقابل خود ساختہ اصولوں کے پجاری ایک ہی لمحے میں بستی کی دو نو جوان لڑکیوں کا کا ٹھیاواری کتھک کے ساتھ غائب ہونے سے اپنی آزادی اور انفرادیت کی کوششوں کے سامنے نادم، شرمندہ اور بے بس نظر آنے لگتے ہیں:۔

> جس دن یہ واقعہ پیش آیا کالونی میں تہلکہ سا مچ گیا۔ کالونی والوں کے چہرے اتر سے گئے جیسے کوئی موت واقع ہوگئی ہو۔ ریڈیو پر فلمی گانے بند کر دیئے گے اور ایک سوگ کا سماں بندھ گیا۔ کالونی کے ایک کالیستھ کی بیٹی ایک ستار یئے سے ستار سیکھا کرتی تھی۔ کالیستھ نے اسی دن اسے برطرف کر دیا۔ یہ واقعہ تھا تو بہت افسوس ناک مگر ان بڑے بوڑھوں کے حق میں تائید غیبی ثابت ہوا۔ یک لخت ان کا وقار بڑھ گیا۔ یہ بوڑھے جو پہلے سر ڈالے سائے کی طرح چپکے سے گلی کوچوں سے گزر جاتے تھے اب انھی راستوں پر کنکھارتے زور زور سے لاٹھی ٹیکتے، سر اٹھا اٹھا کر چلنے لگے (۴۳)

افسانے میں بوڑھے متوسط طبقات کی نچلے طبقات سے وابستگیوں اور رشتوں کا استعارہ ہیں جو اپنی مروجہ اخلاقیات و روایات سے جڑے رہنے اور کالونی کے مکینوں کی کھوکھلی معاشرت کے خلاف ہیں۔ یہاں قدیم و جدید کے ٹکراؤ میں جدیدیت اپنی کمزور بنیادوں سے شکست خوردہ نظر آتی ہے۔ اپنی انفرادیت اور الگ پہچان کا سماجی حق رکھنے کے باوجود متوسط طبقہ اپنی روایات سے چمٹی جڑوں کی بدولت الجھاؤ کا شکار ہوتا ہے۔ گلستان کالونی سے بھاگنے والی لڑکیوں نے پوری متوسط بستی کی الگ پہچان کے خوابوں، جذبوں اور انفرادی شناخت کی ساری کاوشوں کو گم نامی کے اندھیروں میں دھکیل دیا۔ بڈھوں کے سامنے سر تسلیم خم اس طبقے میں خود اعتمادی کے فقدان کا ثبوت ہے۔ بستی کے بوڑھے بھی قدیم روایات سے گہری وابستگی کی بدولت نئی ترقی اور انقلاب کا راستہ روکنے کے خواہش مند ہیں۔ متوسط طبقے کے اندر خارجی جبریت کے زیر اثر داخلی شکست و ریخت کا عمل جاری رہتا ہے اور کسی بہتر اور مناسب موقع پر شدید دباؤ کے تحت اظہار کی راہ نکل جاتی ہے۔ جس طرح بوڑھوں نے اپنی محرومی کا ازالہ بامبے والے پر تشدد سے کیا۔

اعلیٰ طبقات میں شمولیت کی شعوری کوشش کا نمائندہ کردار "بھنور" کے حاجی شفاعت احمد خان ہیں۔ بنیادی طور پر وہ سرکاری ملازمت سے پنشن پا کر تبلیغ کی عملی کوششوں میں خلوص نیت سے مصروف ہیں۔ ان کی تبلیغ کا مرکز کوٹھوں پر

گناہوں کی زندگیاں بسر کرنے والی عورتیں ہیں۔ متوسط طبقہ عمر کے آخری حصے میں موت کے خوف کی بدولت مذہبی امور سے گہری رغبت اختیار کر لیتا ہے۔ حاجی صاحب کی تبلیغ سے متاثر ہوتی بہار کوٹھے کی زندگی سے تائب ہو کر ان کی دہلیز پر آ پہنچتی ہے۔ وہ اس کے لیے ایک گھریلو اور آسودہ زندگی کی خاطر ایک باعزت خاوند تلاش کرتے ہیں۔ ان کا رشتہ تلاش کرنے میں متوسط طبقے کی طبقاتی نفسیات اپنا اثر دکھاتی ہے جس کے زیر اثر وہ اس کے ماضی سے واقفیت کے باوجود اس کا رشتہ نچلے طبقات کے بجائے بہتر طبقات میں تلاش کرتے ہیں۔ وہ بھرپور کوشش سے ایک انجینئر انور کا رشتہ تلاش کر لیتے ہیں۔ دونوں کی شادی ہو جاتی ہے لیکن بہار کا ماضی اور سماجی رویے دونوں کو الگ کر دیتے ہیں۔ حاجی صاحب ایک بار پھر نئے جوش سے متحرک ہوتے ہیں۔ اس مرتبہ ان کی نظر ربانی نامی امیر میوہ فروش پر رکتی ہے۔ پانچ ہزار نقد مہر اور بہار کے نام ایک مکان کے عوض نکاح طے ہو جاتا ہے۔ شادی کا انجام پہلے سے کوئی زیادہ الگ نہیں ہوتا البتہ اس طلاق پر ان کے پاس ایک معقول رقم، مکان اور زیورات جمع ہو جاتے ہے۔ بار بار کی ناکامی سے حاجی صاحب اس مرتبہ ایک غریب خاندان کا رخ کرتے ہیں چوں کہ ان کی خاندانی وابستگی نچلے طبقات سے گہری ہوتی ہے۔ متوسط طبقہ اس بات سے باخبر اور آگاہ ہوتا ہے کہ اس کا قدر دان نچلا طبقہ ہوتا ہے:۔

> اس دفعہ حاجی صاحب نے اونچے خاندان اور روپے پیسے کا لالچ نہیں کیا تھا بلکہ مصلحتاً غریب شوہر چنا تھا اور پھر روپے کی ضرورت بھی کیا تھی کیونکہ پچھلے مہروں کی رقمیں، گھر کا سامان زیور کپڑا التا پہلے ہی وافر تھا (۴۴)

اعلیٰ طبقات میں شمولیت کی خواہش اور معاشرتی برتری قائم کرنے کی طبقاتی نفسیات کا اظہار کتبہ کا شریف حسین بھی ہے جو بظاہر مکان کے باہر کتبہ آویزں کرنے کا خواہش مند ہے مگر اس کے پس پردہ دولت کا حصول، صاحب جائیداد ہونے کی طلب، انفرادی معاشرتی مقام کی تلاش اور اعلیٰ طبقات میں شمولیت کی طبقاتی نفسیات اپنا اثر دکھاتی ہے:۔

> رات کو جب وہ کھلے آسمان کے نیچے اپنے گھر کی چھت پر اکیلا بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا تو اس سنگ مرمر کے ٹکڑے کا ایک مصرف اس کے ذہن میں آیا۔ خدا کے کارخانے عجیب ہیں وہ بڑا غفور الرحیم ہے۔ کیا عجیب اس کے دن پھر جائیں وہ کلرک درجہ دوئم سے ترقی کر کے سپرنٹنڈنٹ بن جائے اور اس کی تنخواہ چالیس سے بڑھ کر سو ہو جائے۔۔۔ یہ نہیں تو کم سے کم ہیڈ کلرک ہی سہی۔ پھر اسے ساجھے کے مکان میں رہنے کی ضرورت نہ رہے۔ بلکہ وہ کوئی چھوٹا سا مکان لے لے اور اس مرمریں ٹکڑے پر اپنا نام کندہ کرا کے دروازے کے باہر نصب کر دے (۴۵)

مکان بنانے کی خواہش کی عدم تکمیلیت ، ناموافق حالات اور صلے کا نہ ملنا، قوت عمل کی سستی اور محنت کے باوجود منزل کا نہ ملنا شریف حسین کی نفسیاتی الجھنوں کے خارجی محرکات ہیں جو آگے چل کر ایک ہی عمل کو بے حسی سے دوہرائے جانے سے پیدا ہوتے ہے۔اپنی خواہشات کے حصول میں محنت کے باوجود ناکامی کام میں اکتاہٹ پیدا کرتی ہے۔اس میں نئے عمل کی قوت و آرزو مفقود ہو جاتی ہے۔زندگی بھر متوسط طبقے کے افراد کی آرزوئیں تشنہ اور ناآسودہ رہتی ہیں، محدود و مقرر لگی بندھی تنخواہ جس میں کوئی اضافہ محنت کے باوجود ممکن نہیں ہوتا اور اس میں خاندان کی کفالت کے بدلے اپنی خواہشات کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ایک بے حس اور مشینی انداز کی زندگی متوسط طبقات کے نئے عمل کی جستجو کو مدھم کر کے اس طبقے کو مزید مایوسی اور کام سے اکتاہٹ کی راہ دکھاتی ہے۔اس لیے متوسط طبقے کی طبقاتی نفسیات میں بیگانگی کا عمل بتدریج وقوع پذیر ہوتا ہے وہ کسی بھی کام یا ملازمت کے شروع میں کام کا زیادہ جذبہ،لگن اور محنت سے ترقی کا خواہش مند ہوتا ہے۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب ترقی کی راہ میں رکاوٹ آتی ہے تو محنت کا عمل جبری ہو جاتا ہے۔"اس محنت سے اس کی کسی احتیاج کی تسکین نہیں ہوتی بلکہ وہ فقط ذریعہ ہوتی ہے خارجی احتیاجوں کی تسکین کا۔محنت کا اجنبی کردار اس بات سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ اگر مجبوری نہ ہو تو پھر محنت کار محنت سے طاعون کی طرح دور بھاگتا ہے"(۴۶) متوسط طبقات اپنی اعلیٰ طبقات میں شمولیت کی شدید خواہش اور جستجو کے باوجود پل بھر کی ناکامی سے ایک انجانے سے لاشعوری خوف میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں جہاں وہ ایک ہی ناکامی سے واپس اپنی متوسط طبقے کی زندگی کو اہمیت دینے لگتے ہیں۔وہ ایک خوف کی وجہ سے اپنے طبقے سے کسی صورت گرنا نہیں چاہتا۔اس خوف میں اس کے ماضی کی تلخیاں اور نچلے طبقات کی زندگی کا عکس ہوتا ہے کیوں کہ متوسط طبقہ نچلے طبقے ہی سے اپنا سفر شروع کرتا ہے۔گلستان کالونی کے متوسط طبقے کی روشن خیالی کی گرتی دیوار،شریف حسین کی مکان بنانے کی آرزو، حج اور بیٹی کی شادی کی ڈوبتی خواہش،سرفراز ماموں کا شادی سے فرار، حاجی شفاعت کا رشتوں میں ناکام ہونے کے باوجود اپنی جستجو جاری رکھنا سب اسی بدولت ممکن ہوتا ہے کہ وہ اعلیٰ طبقات میں شمولیت کی کوششوں میں ناکام ہو کر اپنی سوچ کو متوسط طبقے تک محدود کر لیتے ہیں۔

غلام عباس متوسط طبقات کی طبقاتی نفسیات میں معاشی اور معاشرتی جبریت کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔متوسط طبقے پر سرمایہ دار بنے کی دھن سوار رہتی ہے۔اس کا سر سرمایہ دار کے قدموں اور پاؤں نچلے طبقے کے کندھے پر ہوتے ہیں۔سرمایہ دار کے لیے متوسط طبقہ ایک آلہ کار کا کردار ادا کرتا ہے جس کے ذریعے وہ اپنی برتری قائم رکھتا ہے۔متوسط طبقہ بہتر معاشی حالات اور اپنی حیثیت میں اضافے کے دوران سرمایہ دار بنے کے خواب دیکھتا ہے اور اس کے لیے باقاعدہ جستجو اور منصوبہ بندی کرتا ہے۔معاشی تنگ دستی کے دوران اس کی ہمدردی اپنے سے نچلے طبقات کی طرف مڑ جاتی

ہے۔ غلام عباس کا متوسط طبقہ اعلیٰ طبقات میں شمولیت کی خواہش کے لاشعوری اثرات کے زیر اثر ان طبقات کے شوق بھی پالتا ہے۔ ان ظاہری اور باطنی کاوشوں سے وہ اپنی احساس کم تری کو کم کرنا چاہتا ہے جو اس کے اندر طبقاتی تقسیم کی بدولت نمو پاتی ہے۔ متوسط طبقات کی یہ بھونڈی نقالی ان کے معاشی، اخلاقی اور سماجی مرتبے میں کمی کا ذریعہ بنتی ہے لیکن ان کے اندر مایوسی اور احساس ندامت ان کو اس عمل کے لیے اکساتی ہے۔

" کن رس" کا فیاض موسیقی کا شوق پال لیتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اسے بچپن سے اس کا شوق اور خواہش تھی مگر عمر کے جس حصے میں جن ذمہ داریوں، معاشرتی مرتبے، مصروفیات اور گھریلو زندگی کی خوشحالی میں وہ اس شوق کو پورا کرتا ہے وہ اس کے لیے نہ صرف تباہ کن نتائج لاتا ہے بل کہ اس کی داخلی بے چینی، ندامت اور مستقل الجھنوں کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔ متوسط طبقے کے امیرانہ شوق پالنے کے پس پردہ اس کی سماجی انفرادیت قائم کرنے کی طبقاتی نفسیات اپنا اثر دکھا رہی ہوتی ہے۔ غلام عباس نے افسانے کے آغاز میں اس صورت حال کی طرف اشارہ کیا ہے:۔

> رفتہ رفتہ وہ گانے بجانے کے ایسے عادی ہو جاتے ہیں جیسے کسی کو کوئی نشہ لگ جائے۔ صاحب ثروت ہوئے تو عمر بھر گویاں کی پرورش کرتے رہے۔ نہیں تو استادوں کی جوتیاں سیدھی کر کے اپنے ذوق کی تسکین کر لی (۴۷)

موسیقی کے علاوہ قمار بازی، شرب نوشی اور میوزک و ناچ کے شوق بھی اس طبقے کے مرغوب شوق ہیں۔ اس طبقے کے یہ شوق اس کے لیے سنگین مسائل پیدا کرتے ہیں۔ یہی شوق اعلیٰ طبقات کے لیے وقت گزاری اور حصول مسرت کا ذریعہ ہوتے ہیں:۔

> اہل ثروت اپنے اوقات فراغت میں بے پناہ اکتاہٹ اور بیزاری محسوس کرتے ہیں۔ ذوق و فکر سے عاری ہونے کے باعث وہ تنہائی کو بہلانے کا کوئی سامان نہیں رکھتے۔ اپنے اندرون میں جھانکنے سے گریز کرتے ہیں کہ وہ سراسر ویران ہوتا ہے۔ اس بیزاری سے نجات پانے کے لیے وہ مجالس عیش و عشرت، سیر و سیاحت اور ہنگامہ ناؤ نوش میں پناہ لیتے ہیں (۴۸)

متوسط طبقہ اس طرح کی صورت حال کا کم کم شکار ہوتا ہے۔ اس کی معاشی ضروریات، خاندانی ذمہ داریاں، معاشرتی روابط اور دیگر مصروفیات اس کو الجھائے رکھتی ہیں۔ اس کے اوقات فراغت اس کی تھکاوٹ دور کرنے تک ہی محدود ہوتے ہیں۔ معاشی الجھنیں اس کی راہ میں رکاوٹ بنتی رہتی ہیں۔ "جواری" کے سرکاری اکاونٹنٹ کو جوئے سے

سخت نفرت ہے وہ اپنے اہل وعیال کی کفالت اور خاندانی ذمہ داریاں پوری محنت سے پوری کرتا ہے۔فراغت کے اوقات اور بیوی بچوں کی عدم موجودگی میں ہر بار کے پکے عہد کے باوجود اسے نکو کی بیٹھک ہی کی یاد ستانے لگتی ہے۔وہ ایک نامعلوم کشش سے اس جانب کھنچا چلا آتا ہے۔اگر اس کے اندر تفریح کی سہولیات کا فقدان ہوتا تو وہ کوئی صحت مند سرگرمی اختیار کر سکتا تھا لیکن وہ ایسا ہرگز نہیں کرتا۔اس کے اندر احساس کم تری کی لاشعوری گرفت اسے امیروں کی نقالی پر اکساتی ہے۔وہ اس بات سے باخبر ہوتا ہے کہ اس شوق میں اس کی عزت، وقار، ملازمت اور مالی تحفظ کچھ بھی محفوظ نہیں مگر وہ اس شوق کو ضرور پورا کرتا ہے:۔

> وہ جواری جو کسی سرکاری دفتر میں اکاونٹنٹ تھا اسے جوئے سے سخت نفرت تھی مگر جب کبھی اس کی بیوی بچوں کو لے کر میکے جاتی تو اسے اس بیٹھک ہی کی سوجھتی۔دفتر سے اٹھ کر سیدھا وہیں کا رخ کیا کرتا۔ہر بار ہارتا اور اپنے کو کوستا، عہد کرتا پھر کبھی نہ آؤں گا۔مگر اگلے روز سب سے پہلے پہنچتا(۴۹)

گلستان کالونی کے مکینوں کے شوق بھی زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ان کے ہاں تو امیروں کے شوق پالنے کا باقاعدہ رواج اجتماعی طور پر موجود ہے۔ان کے اندر اس بات کی شدید تڑپ موجود ہے کہ عام طبقے کی نسبت ان کی آسودہ زندگی اور روشن خیالی کا اس قدر چرچا ہو کہ عام کلرکوں اور ملازمین کی نظر میں ان کی عزت و رفعت انتہائی مقام کو چھو جائے۔ان کے مشاغل کے پس پردہ بالادست طبقات میں شمولیت کی شدید خواہش اور نچلے طبقات پر اپنی سماجی برتری کے لاشعوری اثرات اظہار کی راہ پاتے ہیں۔

ان کے دل پسند مشاغل میں ظاہری ٹھاٹھ باٹھ، ڈبل روٹی، مکھن، اخبار، ریڈیو، پرتکلف مہمان نوازی، گھروں میں کتھک اور گھنگھرو کی آواز، نئے اور دل کش ملبوسات، روشن خیالیاں، تمدنی ترقیاں اور پارٹیاں سبھی کچھ امیروں کے فارغ اوقات میں دل بہلانے والے شوق ہیں جو ان کی یک رخی اور اکتاہٹ سے لبریز زندگی میں سکون کے لمحات مہیا کرتے ہیں۔اس کے برعکس گلستان کالونی کے مشاغل احساس کم تری کی بدولت نمودار ہوتے ہیں۔

"اندھیرے میں" کا نوجوان نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والا کردار قدرے مالی آسودگی کا تھوڑا تھوڑا نشہ ایک نیم سرکاری دفتر میں ملازمت سے حاصل کرتا ہے۔اس کے اوقات کار تھکا دینے والے کام کے مقابلے میں تھوڑی اجرت کی جبریت کے گرد گھومتے ہیں۔ماضی میں روزگار کے سلسلے میں دفاتر کے دھکے اور سنگ دل انسانوں سے دوچار ہونے کے تلخ تجربات کا اثر اب آہستہ آہستہ قدرے مالی آسودگی کی سمت بڑھ رہا ہے۔اس کے لاشعوری اثرات بہتر

طبقات میں شمولیت کی طبقاتی نفسیات کو اجاگر کرنے کا سبب بنتے ہیں۔دن بھر دفتر میں آفیسروں کی گفت گو، بہتر زندگی اور سہولیات کا آنکھوں دکھا حال اس کے اندر بہتر زندگی بسر کرنے کی امنگ پیدا کرتا ہے۔وہ اپنے والد کی شراب نوشی سے نفرت ضرور کرتا ہے لیکن اس کے لاشعور میں اس کے بارے میں ایک کشش موجود ہوتی ہے جس کو اس نے ماحول کے خوف سے دبا کر رکھا ہوتا ہے۔اپنے والد کی بوتل لے کر وہ اسے ضائع کرنے کے لیے کناٹ پیلس کا رخ کرتا ہے۔وہاں کی رنگین شام، مرد وزن کا قرب، سینما گھروں اور انگریزی ہوٹلوں کی رنگینی اور دیگر پر جوش مناظر اس کے دل میں پوشیدہ خواہشات کو نکاسی کی سمت لے جاتے ہیں۔اسی دوران ایک جوڑے کا بوس وکنار اور سردی میں وسکی کی طلب نوجوان کے جذبات کو مزید ابھارتا ہے۔وہ وسکی کی بوتل سے سکون حاصل کرنا شروع کر دیتا ہے۔وسکی کا یہ شوق اور نشے کے لمحات اس کا دائمی روگ بن سکتے ہیں مگر والد کی حالت سے آگہی کے باوجود وہ ایک نیا شوق پالنے کی گرفت میں خود کو جکڑ لیتا ہے۔

"وسکی کا نام سن کر نوجوان اچھل پڑا۔ان کی باتوں نے اس پر ایک نشہ طاری کر دیا تھا"(۵۰)

"سمجھوتہ" کا شوہر بھی دفتر میں ملازمت کی وجہ سے معاشی آسودگی کو ممکن بناتا ہے۔اس کے اندر ایک جنسی گھٹن کی ایک بے چینی موجود ہوتی ہے جو اپنی بیوی کی بدولت قدرے قابو میں ہوتی ہے۔جب اس کی بیوی گھر سے فرار ہو جاتی ہے تو وہ اپنے ایک رنگین مزاج دوست کی وساطت سے کوٹھوں کی راہ اختیار کرتا ہے۔اس میں ایک قابل حیرت بات بھی پوشیدہ ہے کہ وہ دوسری شادی کی طرف سرے سے کوئی توجہ نہیں دیتا۔وہ اپنی تسکین کا سامان پیدا کرنے کے لیے مختلف عورتوں کو خریدنے کا عمل شروع کرتا ہے۔اس کے اندر یہ جذبات جنسی دباؤ کے ساتھ ساتھ امیروں کی عیاشی اور قحبگی کی بھونڈی نقالی بھی ہے۔اس میں ایک دل چسپ نفسیاتی پہلو نوجوان کی بیوی کے فرار ہونے میں بھی بیان ہوا ہے۔اس کے اندر بھی اعلیٰ طبقات میں شمولیت کی خواہش موجزن ہے:۔

> جو معاشرہ طبقاتی تفریق پر مبنی ہو اس کی نادار عورتیں امراء کی عورتوں کو رشک اور
> حسرت کی نگاہ سے دیکھتی رہتی ہیں اور ان جیسا سامان آرائش، قیمتی ملبوسات اور
> زیورات فراہم کرنے کے لیے ہر ممکن اقدامات کرنے لگتی ہیں(۵۱)

"سیاہ سفید" کی میمونہ کے اندر شہری زندگی کی گہما گہمی میں دل چسپی، گاؤں کے مردوں کے برعکس شہری وضع قطع کے مرد کی تلاش، نئے فیشن کا انتخاب اور بالوں کی تراش خراش کے بدلتے انداز بھی اعلیٰ طبقات میں شمولیت کی کوشش ہے۔یہ احساس کم تری کی وجہ سے پروان چڑھتی ہے اور متوسط طبقے کی ایک مستقل طبقاتی نفسیات بن جاتی ہے۔غلام عباس نے متوسط طبقے کے اندر عمر کے آخری ایام میں موت اور آخروی زندگی کے خوف کی بدولت مذہبی امور میں گہری

دل چسپی، دینی تبلیغ و ہدایت اور فریضہ حج انجام دینے کی ایک تڑپ کو طبقاتی نفسیات کے تناظر میں بیان کیا ہے۔ ہے۔ جوانی کے ایام میں پوری لگن اور محنت سے اپنے وسائل کو بڑھانے کی سعی کرتا ہے۔ جان توڑ محنت اور صلے کے حصول میں ناکامی بتدریج ترقی کے تمام ولولے دل سے نکال دیتی ہے۔ اس وجہ سے متوسط طبقہ ایک احساس کم تری کے ساتھ زندگی کے طے شدہ انجام کی طرف بڑھتا ہے۔ ڈھلتی عمر کا خوف اور گھر میں اپنی کم ہوتی مقبولیت مذہبی لگاؤ کی راہ ہموار کرتی ہے۔

"بھنور" کے حاجی شفاعت احمد خان، "کتبہ" کا شریف حسین، "جوار بھاٹہ" کے حاجی شفاعت احمد اور "تنکے کا سہارا" کے حاجی صاحب اسی طبقاتی نفسیات کے بدولت مذہبی کاموں میں گہرا سکون پاتے ہیں۔ ایک دل چسپ بات بھی سامنے آتی ہے کہ غلام عباس کئی مواقعوں پر کرداروں کی تکرار بھی پیش کرتے ہیں۔ ان کے ہاں شفاعت احمد کے نام کی تکرار نظر آتی ہے۔ دونوں پینشن کے بعد فریضہ حج انجام دیتے ہیں۔ انھوں نے حاجی شفاعت احمد خان کو "بھنور" اور حاجی شفاعت احمد کو "جوار بھاٹہ" میں تکرار سے سامنے لایا ہے جس میں صرف "خان" کا فرق ہے۔ پہلے افسانے کا تعلق مجموعہ "آنندی" اور دوسرے افسانے کا تعلق "کن رس" سے ہے۔ ان دونوں کے درمیان لگ بھگ اکیس برس کا طویل زمانی فاصلہ تکرار کی وجہ ہوسکتا ہے:۔

> حاجی شفاعت احمد خان ایسے ہی دینداروں میں سے تھے۔۔۔ جب انھیں نوکری کرتے بیس برس ہو گئے تو حج کا شوق ہوا۔ (بھنور) "حاجی شفاعت احمد چودھری شمس الدین کے بیٹے۔ انٹرنس تک تعلیم پائی مدتوں ایک سرکاری دفتر میں کلرکی کرتے رہے اسی دفتر میں ترقی کرتے سپرنٹنڈنٹ ہو گئے پنشن ملی۔ حج کو گئے" (جوار بھاٹہ) ان ضروری کاموں سے نمٹ کر اس کے جی میں آئی کہ حج کر آئے۔ مگر اس کی توفیق نہ ہوسکی البتہ کچھ دنوں مسجدوں کی رونق خوب بڑھائی (۵۲)

شریف حسین اور حاجی صاحب دونوں کا ایک ایک بیٹا کسی دفتر میں ٹائپسٹ ہوتے ہیں۔ جب کہ "جوار بھاٹہ" والے حاجی شفاعت احمد کا بیٹا ریلوے میں گارڈ کی نوکری کرتا ہے۔ اپنی نوکری کے اختتام پر متوسط طبقہ اپنے اثر و رسوخ سے اپنی اولاد کو ملازمت کے حصول میں معاونت کرتا ہے۔ اس کا یہ عمل معاشی جبریت سے ابھرتا ہے لیکن وہ اپنی نسلوں کو مستقل غلامی کی جکڑ بندیوں میں دھکیل دیتا ہے۔ اس کے اندر ایک لاشعوری خوف اپنا بسیرا کیے ہوتا ہے جس کی گرفت سے وہ آزاد نہیں ہوسکتا۔ اس کی شدید خواہش ہوتی ہے کہ اس کی اولاد نچلے طبقات میں اپنی عمر بسر نہ کرے۔ اس طرح

کے خدشات اس طبقے کی نسلوں کو اس کرب میں مبتلا کر دیتے ہیں جس سے وہ خود گزرتا رہا ہے۔ متوسط اور نچلے طبقات کی اولاد بھی اسی ڈگر پر چلتی ہیں جو ایک طرح کے غلام ذہنوں کا مقدر ہوتی ہیں۔ طبقاتی سماج ہی ان طبقات کی سوچوں کو محدود کرتا ہے۔ میمونہ ایک مدرس کے ہاں پرورش پاتی ہے۔ جس کا مقدر معاشی تنگ دستی اور کڑی محنت کے باوجود سسکتی زندگی ہے لیکن وہ باپ ہی کی طرح مدرس کے پیشے کا انتخاب کر کے خود کو اسی کرب میں دھکیل دیتی ہے۔ شریف حسین جان گسل اور جان توڑ محنت کرتا ہے مگر طبقاتی سماج اس کو طرز کہن پر مجبور کرتا ہے لیکن بڑے بیٹے کی ریل کے مال گودام اور چھوٹے کی ایک دفتر میں ٹائپسٹ کی ملازمت اس کی نسلوں کو اسی جبر کا راستہ دکھاتی ہیں۔ "جوار بھاٹہ" کے حاجی شفاعت احمد کے بیٹے قاری غوث محمد کی ریلوے گارڈ کی نوکری کا مستقبل بھی شریف حسین کے بیٹوں اور میمونہ کی زندگی سے زیادہ مختلف نوعیت کی نہیں۔ "حاجی شفاعت احمد کے بیٹے۔ ابھی کالج میں زیر تعلیم ہی تھے کہ حاجی صاحب نے اپنے رسوخ سے کام لے کر انہیں ریلوے میں گارڈ کی نوکری دلوادی" (۵۳) یوں متوسط طبقہ اپنی خاص طبقاتی نفسیات کے زیر اثر اپنی نسلوں کو اپنے طبقے میں بحال رکھنے کے بعد بہتر طبقات میں شمولیت کے خواب دیکھتا ہے۔ ملازمتوں کے باوجود اپنے والدین کی کڑی محنت اور ناکافی سہولیات کا مقدر اس طبقے کی نسلوں میں ایک احساس کم تری کو ابھارتا ہے جس کے وجہ سے ہر نئی نسل غلام ذہن لے کر پیدا ہوتی ہے۔

نفسیاتی الجھنوں سے سمجھوتہ بازی

متوسط طبقے پر اقتصادی جبریت، جنس و معاش کی الجھنوں اور قانون و ماحول کی خارجی حاکمیت نفسیاتی مسائل پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے۔ اس کی بدولت متوسط طبقے کی طبقاتی نفسیات میں اختیاری و خاندانی رشتوں کا الجھاؤ، خود اعتمادی کا فقدان، اعلیٰ طبقات میں شمولیت اور انفرادیت کی طلب، بدلتا انداز فکر، قوت فیصلہ کا فقدان، طبقات کی بھونڈی نقالی، امیرانہ شوق اور اپنی طبقاتی بحالی جیسی مستقل الجھنیں نمایاں نظر آتی ہیں۔ یہ طبقہ ان الجھنوں سے زندگی کی قوت کی بدولت سمجھوتہ بازی کی راہ نکالتا ہے۔ کرداروں کی یہ سمجھوتہ بازی جینے کی راہ نکالتی ہے۔ "کتبہ" کا شریف حسین غلام عباس کے افسانوں میں متوسط طبقے کا نمائندہ ہے۔ اس کے اندر پیدا ہونے والی احساس کم تری اور اس کی وجوہات ہی اس طبقے کی طبقاتی نفسیات کو متعین کرتی ہے۔ وہ اپنی پوری لگن اور جستجو کے باوجود مایوس ہو کر زندگی سے غیر مشروط سمجھوتہ کر لیتا ہے۔ اس سمجھوتے میں اس طبقے کی مستقل مایوسی چھپی ہوتی ہے۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر اورنگ زیب عالم گیر کہتے ہیں:۔

وہ بیزار بیزار سا رہتا ہے۔ نہ کبھی ہنستا ہے نہ کسی سے بولتا ہے۔ وہ تنگ راستے پر گھٹ گھٹ کر مقرر اور طے شدہ انجام کی طرف بڑھتا ہے۔ زندگی کا لگا بندھا دھڑا، مراحل و مدارج و واقعات، کلرکی، شادی، بچوں کی پیدائش، حج کی خواہش، بیٹی کی شادی، مکان بنانے کی خواہش، مکان کا کتبہ قبر کا کتبہ بن جاتا ہے (۵۴)

"سیاہ سفید" کی میمونہ ۱۳ دسمبر کی شام ریل کے زنانہ درجے میں جوش سے خالی، لگے بندھے اصولوں کے تحت دم لیتی زندگی، خواہشات کی قاتل فضاؤں اور کولہو کے بیل کی مانند بسر ہونے والی جی اے وی مڈل سکول کے بورڈنگ ہاؤس کا سفر واپسی اختیار کر کے اپنے متوسط طبقے کی طبقاتی نفسیات کا نمائندہ بن کر زندگی اور اپنی نفسیاتی الجھنوں سے سمجھوتہ کر لیتی ہے۔ "بامبے والا" کی پوری متوسط کالونی اپنی سماجی انفرادیت کے کوششوں کے باوجود ناکام ہو کر زندگی سے سمجھوتہ کر لیتی ہے۔ اس افسانے میں بامبے والا بغیر کسی قصور کے بوڑھوں کے تشدد کا شکار ہوتا ہے لیکن اگلے ہی لمحے وہ حالات سے سمجھوتہ بھی کر لیتا ہے۔ "آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اس طرف گیا جہاں سائیکل کھڑی تھی۔ پھر سائیکل پر بیٹھ کر خاموشی سے اس نواح سے رخصت ہو گیا (۵۵) "تنکے کا سہارا" کے ریٹائر ہیڈ کلرک حاجی صاحب بھی اپنی طبقاتی نفسیات کی بدولت پوری بستی پر اپنا اثر اور انفرادیت قائم کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ ان کی بیوہ سیدانی اور پورے خاندان کی کفالت اور ہم دردی کے پیچھے یہی طبقاتی نفسیات اپنا اثر دکھا رہی ہوتی ہے۔ اس خاندان پر ان کے اثر رسوخ سے پورا محلّہ واقف اور نالاں تھا۔ "غرض رفتہ رفتہ اہل محلّہ اس خاندان کی سرپرستی میں حاجی صاحب کے حد سے بڑھے ہوئے دخل کو ناپسند کرنے لگے تھے" (۵۶) حاجی صاحب اپنی پوری کوشش کے باوجود اپنے بیٹے کی اس خاندان میں شادی کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ اسی دوران بیوہ سیدانی کا عقد ثانی ان کو مزید ناکامی کی طرف لے جاتا ہے۔ اس کے باوجود وہ حالات سے سمجھوتہ کر کے خود کو محدود کر لیتے ہیں۔ "کن رس" کا فیاض بھی اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے حیدری خان اور کالکا پرشاد کی قوت اور عیاری سے سمجھوتہ کر لیتا ہے۔ "جواری" کے سارے کردار اسی سمجھوتہ بازی کی طرف سفر کرتے ہیں۔ وہ نکو کی ذات اور اس کے تھانے میں روابط کو شکوک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان سب باتوں کو جانتے ہوئے سرکاری اکاؤنٹینٹ اور اس کے ساتھی نکو کی کھوکھلی باتوں سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔ "یوں تو دھیرے دھیرے سبھی لوگ آخر کار نکو کی باتوں پر کان دھرنے لگے تھے" (۵۷) "سمجھوتہ" کا نوجوان خاوند اپنی بیوی کے فرار ہونے پر طوائفوں سے اس کا نعم البدل پیدا کرتا ہے۔ وہ اپنی بیوی سے انتقام لینے کا جذبہ رکھتا ہے۔ وہ خیالوں میں اپنی بیوی کا گلہ دبا کر اس کی دہشت زدہ آنکھوں میں رحم اور عفو کی التجا کے باوجود اسے زمین پر پٹخ دیتا ہے۔ اتنی نفرت اور جوش انتقام کے باوجود اقتصادی مسائل کی جبریت

کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بیوی سے سمجھوتہ کر لیتا ہے۔ "ایک دردمند دل" کا فضل دیار غیر سے اپنے وطن کی محبت کا جذبہ لے کر آتا ہے۔ وہ اپنے دیس میں پہنچ کر نوکری کے حصول کی پوری کوشش کرتا ہے۔ اپنی پرانی تعلق داری، محنت، کوشش اور لگن کے باوجود حصول ملازمت میں ناکام رہتا ہے۔ اس کی اقتصادی جبریت اسے گھریلو استعمال کی اشیاء تک فروخت کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ فضل کا جذبہ وطنیت سرد پڑ جاتا ہے۔ اس نے زندگی کی قوت کے سامنے بے بس ہو کر حالات سے سمجھوتہ کر لیا اور لندن اسکول آف بال روم ڈانسنگ کے نام سے ایک ادارہ کھول لیا۔

غلام عباس کے افسانوں میں متوسط طبقہ اپنی طبقاتی نفسیات کی بدولت خاص افکار، تصوارت، نظریات، رویوں اور رجحانات کا حامل ہے۔ اس کی اقتصادی مجبوریاں، جنسی گھٹن، طبقاتی عدم مساوات اور سماجی و قانونی جبریت خارج سے ان کے داخل پر اثر انداز ہو کر ان کی خاص طبقاتی نفسیات مرتب کرتی ہیں۔ متوسط طبقے کی طبقاتی نفسیات میں مسائل پر قابو پانے کی جستجو، آرزو کو حقیقت کا روپ دینے کی کوشش، خود فریبی، احساس کم تری، قناعت کا فقدان، خود فریبی، اعلیٰ اور بالا دست طبقات میں دل چسپی اور شمولیت کی طلب، زندگی سے سمجھوتہ بازی، حماقت، خاندانی اور اختیاری رشتوں کے الجھاؤ اہم مقام حاصل ہے۔ اس طبقے کی طبقاتی نفسیات کا اظہار اس کے رہن سہن، خوراک ولباس، گفت گو، معمولات زندگی، میل جول، رشتوں، معاشرتی روابط، دلچسپیوں، مشاغل، کاروباری مراسم، تقریبات، روزگار، سماجی دباؤ اور افکار و خیالات سے اظہار کی راہ پاتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ کیا کہتی ہے، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۵۶

۲۔ علمدار حسین بخاری، ڈاکٹر، اردو افسانے کی روایت میں غلام عباس کا مقام، مقالہ، پی ایچ ڈی، بہاء الدین زکریا، یونی ورسٹی، ملتان، ۲۰۰۶ء، ص ۴۹

۳۔ ایضاً، ص ۵۲

۴۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ کیا کہتی ہے، ص ۷۷

۵۔ علمدار حسین بخاری، ڈاکٹر، اردو افسانے کی روایت میں غلام عباس کا مقام، ص ۶۰

۶۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ کی آگہی، تاریخ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۳۶

۷۔ انور سدید، ڈاکٹر، مضمون، غلام عباس معاشرتی حقیقت کا نمائندہ، مشمولہ، غلام عباس فکر و فن، مرتب، ایم۔ خالد فیاض، نقش گر، پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۰ء، ص ۱۱۳

۸۔ فیصل جعفری، مضمون، غلام عباس کا افسانوی ادب، مشمولہ، غلام عباس فکر و فن، ص ۱۰۰

۹۔ ایضاً، ص ۹۴

۱۰۔ انور سدید، ڈاکٹر، غلام عباس فکر و فن، ص ۱۱۰

۱۱۔ انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۰۷ء، ص ۳۵۰

۱۲۔ ایضاً، ص ۳۵۸

۱۳۔ علمدار حسین بخاری، ڈاکٹر، اردو افسانے کی روایت میں غلام عباس کا مقام، ص ۱۸۶

۱۴۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، مضمون، غلام عباس کی افسانہ نگاری، مشمولہ، غلام عباس فکر و فن، ص ۴۰

۱۵۔ سویا مانے یاسر، غلام عباس کے سوانح اور فن کا تحقیقی جائزہ، سنگ میل، پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۲۱۴

۱۶۔ غلام عباس، زندگی نقاب چہرے، مکتبہ، دانیال، کراچی، اشاعت ششم، ۲۰۰۰ء، ص ۳۴

۱۷۔ شہزاد منظر، غلام عباس کے ۱۰ بہترین افسانے، تخلیقات، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۱۰۹

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۳۴

۱۹۔ غلام عباس، زندگی نقاب چہرے، ص ۲۱۲

۲۰۔ ایضاً،ص۲۳۹

۲۱۔ غلام عباس کے بے مثال افسانے ،مرتب،طاہر منصور،فاروقی ،الحمد،پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۸ء،ص ۲۶۸

۲۲۔ ایضاً،ص۲۷۸

۲۳۔ ایضاً،ص۳۰۹

۲۴۔ ایضاً،ص۲۰۱

۲۵۔ ایضاً،ص۲۰۶

۲۶۔ ایضاً،ص۲۱۷

۲۷۔ سویامانے یاسر،غلام عباس سوانح اورفن کا تحقیقی جائزہ،ص۵۸

۲۸۔ ایضاً،ص۲۱۴

۲۹۔ شفیق،انجم،ڈاکٹر،اردوافسانہ(بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اوررجحانات کے تناظر میں)،پورب اکادمی، اسلام آباد،۲۰۰۸ء،ص۱۱۴

۳۰۔ شہزادمنظر،غلام عباس کے ۱۰بہترین افسانے تخلیقات،لاہور،۲۰۰۰ء،ص ۸۷

۳۱۔ ایضاً،ص۸۶

۳۲۔ علی عباس،جلالپوری،عام فکری مغالطے تخلیقات،لاہور،۲۰۱۰ء،ص۱۳

۳۳۔ علی عباس،جلالپوری،جنسیاتی مطالعے تخلیقات،لاہور،۲۰۱۰ء،ص۳۶

۳۴۔ غلام عباس کے بے مثال افسانے ،مرتب،طاہر منصور،فاروقی ،الحمد،پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۸ء،ص ۲۲۸

۳۵۔ ایضاً،ص۱۲۶

۳۶۔ ایم۔اے ملک،عورت کی نفسیات،عمران ملک۔۷۰۔ڈی نیو مسلم ٹاؤن،لاہور،۱۹۹۰ء،ص۱۴۰

۳۷۔ غلام عباس کے بے مثال افسانے ،مرتب،طاہر منصور،فاروقی،ص۱۴۰

۳۸۔ ایضاً،ص۳۲۶

۳۹۔ ایضاً،ص۳۵۱

۴۰۔ سویامانے یاسر،غلام عباس کے سوانح اورفن کا تحقیقی جائزہ،ص۴۹

۴۱۔ غلام عباس کے بے مثال افسانے،ص۲۲۸

۴۲۔ ایضاً،ص۲۳۰

۴۳۔ ایضاً،ص۲۳۵

۴۴۔ ایضاً،ص۳۹

۴۵۔ ایضاً،ص۸۵

۴۶۔ سبط حسن، موسیٰ سے مارکس تک، مکتبہ دانیال، کراچی، اشاعت سولھویں، ۲۰۱۱ء، ص۲۷۶

۴۷۔ شہزاد منظر، غلام عباس کے ۱۰ بہترین افسانے، تخلیقات، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص۱۱۷

۴۸۔ علی عباس، جلالپوری، عام فکری مطالعے، ص۹۰

۴۹۔ شہزاد منظر، غلام عباس کے ۱۰ بہترین افسانے، ص۱۰۹

۵۰۔ غلام عباس کے بے مثال افسانے، مرتب، ص۱۹۹

۵۱۔ علی عباس، جلالپوری، جنسیاتی مطالعے، ص۱۷۶

۵۲۔ غلام عباس کے بے مثال افسانے،، ص۲۹، ۱۵۱، ۹۰

۵۳۔ ایضاً،ص۱۵۲

۵۴۔ اورنگ زیب، عالم گیر، ڈاکٹر، غلام عباس، تحقیقی وتنقیدی مطالعہ، سنگت پبلیشرز، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص۸۰

۵۵۔ غلام عباس، زندگی نقاب چہرے، ص۲۱۲

۵۶۔ غلام عباس کے بے مثال افسانے، مرتب، ص۲۷۴

۵۸۔ ایضاً،ص۲۷۴

باب نمبر۴

غلام عباس کے کردار اور دیگر طبقات

اس کائنات پر غیر طبقاتی سماج کے قیام کی خواہش، جستجو اور جدو جہد کی تاریخ، انسان کے ہاتھوں انسان کے استحصال کی مانند قدیم وجود کی حامل ہے۔ ہر وہ انسان جو فکری اور شعوری طور پر بیدار ہوتا ہے اس کے ہاں کائنات کو سمجھنے کا ایک منفرد شعور موجود ہوتا ہے۔ اسی کی بدولت وہ اس کرۂ ارض پر ضروریات زندگی اور لوازمات حیات کے بارے میں ایک رائے، فکر یا رجحان قائم کرتا ہے۔ اس کا بڑا مقصد آزادی، مساوات اور برابری کی بنیاد پر زندگی کی آسائشوں کو ممکن بنانا ہوتا ہے۔ اگر اس کی وہ تمام ضروریات پوری نہ ہو رہی ہوں اور اسے کسی قسم کی بیرونی جبریت کا سامنا کرنا پڑے تو وہ ردعمل کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس محرومی کے خاتمے کے لیے انسان کی فکری اور عملی جدو جہد کا سفر صدیوں پر مشتمل ہے۔

اس کرۂ ارض پر انسان مدت سے اپنی محرومیوں، طبقاتی سماج کے خاتمے اور وسائل پر ایک مخصوص طبقے کی اجارہ داری کے خلاف برسر پیکار ہے۔ طبقاتی سماج کے خاتمے کی جدو جہد ورثہ انسانی کے طور پر نسل در نسل منتقل ہو کر اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔ اردو کے افسانوی ادب میں ترقی پسند تحریک نے فکری اور فنی سطح پر نئے رجحانات کی بنیاد ڈالی۔ افسانوی ادب میں سماج کے مسائل، معشیت، نفسیات اور سیاسی مسائل کو موضوع بنایا گیا۔ "ترقی پسند عہد میں اردو افسانے کا غالب رجحان زندگی کی مادی حقیقتوں کی عکاسی اور معاشرے میں انقلابی رویوں کا فروغ تھا"(۱) اسی تحریک کی بدولت غلام عباس کی افسانہ نگاری میں ایک منفرد طبقاتی اور نفسیاتی شعور پروان چڑھا۔ ان کے افسانوں میں متوسط طبقے کے ساتھ ساتھ نچلے اور اعلیٰ طبقے کی طبقاتی نفسیات ایک انفرادی رنگ کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ غلام عباس کی افسانہ نگاری میں نچلے طبقات کا وجود اعلیٰ طبقاتی استحصال کے گرد گھومتا ہے۔ اعلیٰ طبقے ہی کی بدولت نچلے طبقات سماجی جبریت، معاشی استحصال اور ناآسودگی کا شکار ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں اعلیٰ طبقات کی خاص استحصالی طبقاتی نفسیات بھی موجود ہے۔

غلام عباس کے اعلیٰ طبقے کے افسانے

غلام عباس کے ہاں اعلیٰ طبقے کی نمائندگی کرنے والے افسانوں میں "مجسمہ"، "نواب صاحب کا بنگلہ"، بندر

والا"اور "یہ پری چہرہ لوگ" قابل ذکر ہیں۔" مجسمہ "بنیادی طور پر ایک بادشاہ اور ملکہ کے مابین طبقاتی سماج کی پیدا کردہ معاشرتی تفریق اور اس کے لاشعوری اثرات کا اظہار ہے۔ بادشاہ کا جاہ وجلال اور شاہی طرز زندگی اس کی ازواجی زندگی میں بے رونقی، روکھا پن اور بے زاری سے بھرپور فضا تعمیر کرتی ہے۔ بادشاہ اپنی ملکہ سے ایک کائناتی عشق، اعتماد اور اظہار محبت کا متمنی ہے۔ ملکہ کا نسوانی حسن اور عقیدت والفت بادشاہ کے رعب وجلال سے دب جاتی ہے۔ جس سے اس کی نسوانیت بری طرح مجروح ہوتی ہے۔ بادشاہ کا حد درجہ ادب اور طبقاتی دبدبہ ازواجی زندگی میں اکتاہٹ، بنجر پن اور ناآسودگی کی راہ ہموار کرتا ہے۔ بادشاہ اس کا حل عورت کے اندر پوشیدہ رقابت کے جذبات کو بیدار کر کے نکالتا ہے۔ اس سے ایک طرف بادشاہ تو سکون حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن دوسری طرف ملکہ ایک اذیت سے دوچار ہوتی ہے۔

"نواب صاحب کا بنگلہ "اعلیٰ طبقات کے اندر سماجی بھرم قائم رکھنے، اندر کی روکھی زندگی اور معاشرے میں اصلیت کھلنے کے لاشعوری خوف کی الجھن کا اظہار ہے۔ نواب صمصام الدولہ کا تعلق سماج کے بااثر اور قابل احترام طبقے سے ہے۔ "ان کا شمار معززین شہر میں ہوتا تھا اور انہیں اکثر شہری تقریبات میں شمولیت کے لیے دعوت نامے آیا کرتے تھے۔ اس کی وجہ ان کی اعلیٰ نسبی، خاندانی وجاہت اور ذاتی شرافت تھی" (۲)

غلام عباس سماج کی اجتماعی نفسیات کو بیان کرتے ہوئے اعلیٰ طبقات کی برتری قائم کرنے والے بنیادی عوامل کا بھی ذکر کرتے ہیں جن میں اعلیٰ نسبی، خاندانی جاہ وحشمت اور وجاہت کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ معاشرے کے نچلے طبقات اپنے ہم پلہ طبقات میں انفرادیت قائم کرنے کے لیے اپنی تقریبات میں اعلیٰ طبقات کی شمولیت کو قابل افتخار سمجھتے ہیں۔ اس امر کی تہہ میں ان کی طبقاتی احساس کم تری کا عنصر اپنا اثر دکھا رہا ہوتا ہے۔ اسی افسانے میں غلام عباس نچلے طبقات کے اندر ایک احساس محرومی سے جرائم کو بھی ابھرتا ہوا دکھاتے ہیں۔ نچلے طبقات کی معاشی الجھن انھیں جرائم کا راستہ دکھاتی ہے۔ نواب صاحب کے بنگلے میں داخل ہونے والا چور خاصا ہوشیار اور چوری کی واردتوں سے گہری واقفیت رکھتا ہے۔ غلام عباس جس کردار کو سامنے لاتے ہیں، اس کی طبقاتی نفسیات کو کمال مہارت سے بیان کرتے ہیں۔ وہ اس بات کو منظر عام پر لاتے ہیں کہ چور عموماً الگ تھلگ اور سنسان جگہ پر واقع بڑے کنبوں والے گھروں کا انتخاب کرتے ہیں۔ رات کے نصف حصے کا تعین، نقدی کی تلاش، زیورات، نوادرات، قیمتی اشیاء، مہنگے ملبوسات اور آخر پر برقی آلات کی تلاش جہاں چوروں کی نفسیات کے عین مطابق ہے وہاں کم وقت اور تھوڑی محنت سے زیادہ دولت کمانے کی خواہش کا اظہار بھی ہے۔ افسانے میں چور کی زبانی زندگی کی ادھوری خواہشات اور اعلیٰ طبقات کے ہاں دولت کی فروانی کا ایک

گمان بھی موجود ہے۔ مادی اشیاء سے زندگی کی خوشی تلاش کرنے کا نچلے طبقات میں پایا جانے والا رجحان ایک احساس کم تری کی بدولت ابھرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ان کے افسانے کا ایک اقتباس دیکھئے:۔

> چوروں کو نواب صاحب جس چیز سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے وہ اول تو ہے نقدی۔ اس کے بعد جواہر اور زیورات کی باری آتی ہے اور ان کے بعد نوادر، سونے چاندی کے ظروف، گھڑیاں، خواہ جیبی ہوں یا کلائی کی، پھر ریشمی کپڑے بنارسی ساڑیاں، قیمتی گرم کپڑے کے عمدہ سلے ہوئے مردانہ سوٹ، پھر آتشی اسلحہ، جیسے بندوق یا پستول یا پھر دل بہلانے کی چیزیں ریڈیو یا ٹرانسسٹر، سلائی کی مشین بھی بری نہیں (۳)

ان اشیاء میں نچلے طبقات کے اندر بالا دست طبقات کی زندگی کے بارے میں قائم اجتماعی سوچ کا ذکر ہے۔ نچلے طبقات کی محرومیاں، استحصال، زندگی بسر کرنے کی تگ و دو اور نا کافی سہولیات کے لاشعوری اثرات اعلیٰ طبقات کی پر آسائش زندگی کی ایک تخیلاتی فضا تعمیر کر کے ایک سماجی جبریت کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ ان مادی اشیاء کا حصول اور ان تک رسائی دراصل نچلے طبقات کے وہ ادھورے خواب ہوتے ہیں جن کی تکمیل ان کا کبھی مقدر نہیں بنتی اور طبقاتی سماج میں ان کی نسلیں صدیوں پر محیط اپنا سفر جاری رکھتی ہیں۔

نواب صاحب بنگلے کی خستہ حالی کے باوجود اپنی خاندانی وجاہت قائم رکھنے کی کوشش جاری رکھے ہوئے ہیں جو ان کے طبقے کی خاص طبقاتی نفسیات کا اثر ہے۔ وہ ہر حربے سے زیر دست طبقات پر اپنا تسلط قائم رکھنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ نواب صاحب کے بنگلے کی شکستہ حالی اور اجنبیت پن کا احساس دولت کے باوجود حقیقی مسرت سے عاری زندگی کی عکاسی ہے۔ "بندر والا" ایک اعلیٰ طبقے کا افسانہ ہے۔ بالا دست طبقات کی خاص طبقاتی نفسیات میں ان کے اندر مادی اشیاء کے حصول کے جنون کے ساتھ ساتھ اقدار، روایات، دولت اور جائیداد کی اپنی اولاد میں منتقلی کی الجھن کو سامنے لایا گیا ہے۔ افسانے میں مسٹر شاہ کی خوش حالی کا ذکر یوں بیان ہوا ہے۔ "ڈرائنگ روم بڑے تکلف سے سجایا گیا تھا۔ قیمتی قالینوں پر خوش نما تصاویر، چینی کے ظروف، آرٹ کے نوادر، غرض ہر چیز ان کی خوشحالی کی غمازی کرتی ہے" (۴)

مسٹر شاہ نچلے طبقات پر اپنی عظمت ثابت کرنے کے لیے دعوتوں کا اہتمام کر کے اپنے بیٹے کو خوبیوں سمیت متعارف کرواتے تھے۔ اس طرح کے اقدامات سے ان کو ایک دلی سکون اور راحت کا احساس ہوتا ہے۔ سماج کے اعلیٰ طبقات اپنی برتری کی خاطر اولاد کو اپنی خواہشات اور مرضی کے مطابق پروان چڑھانے کے طلب گار ہوتے ہیں۔ اپنے ہاں متوسط طبقات کو مدعو کر کے اپنی خوشامد اور سماجی عظمت کا اظہار کر کے وہ اپنی اولاد میں شروع ہی سے ایک استحصالی

رجحان کو ابھارتے ہیں۔ اولاد کی خواہشات کے برعکس وہ اپنے طبقے کی ضروریات کے مطابق تشدد کی صفات سے مزین ایسے وارثوں کے خواہش مند ہوتے ہیں جو مستقبل میں ان کے خاندانی وقار، حسب ونسب کی بحالی اور املاک کو مزید وسعت دے سکیں۔

"یہ پری چہرہ لوگ" بالائی اور نچلے طبقے کے گرد گھومتا ہے۔ بیگم تراب علی اعلیٰ طبقے کی بدولت رعب دار شخصیت اور استحصالی طبعیت کی مالک ہیں۔ ایک دن صحن میں گھومتے ہوئے وہ ایک غریب مہترانی کی اپنی بیٹی سے ہونے والی گفت گو سے غضب ناک ہو جاتی ہیں۔ مہترانی اور اس کی بیٹی کشادہ بنگلوں کی تمام سہولیات سے آراستہ، بڑے حسب و نسب والی بیگمات کے بگڑے ہوئے نام استعمال کر کے اپنے استحصال کی بھڑاس نکال رہی تھیں۔ ان بیگمات کی بگڑے نام سن کر بیگم تراب علی کو نچلے طبقات میں اپنا مقام گرتا ہوا محسوس ہوا۔ اسی گرفت کے زیر اثر انھوں نے دونوں کو اندر بلایا۔ مہترانی نے اپنی مخصوص گفت گو سے ان کو شیشے میں اتار لیا لیکن بیگم کا خوف اس پر گہرائی سے اثر انداز ہوا۔ "سایہ" بنیادی طور پر ایک نئے دولت مند وکیل صاحب کے خاندان کی کہانی ہے۔ وکیل صاحب ایک مشرقی طرز کے انسان ہیں جن کے ہاں مشرقی روایات واقدار، رسمی پردہ داری، احباب کے لیے نیک جذبات اور ہم دردی کی خواہشات موجود ہیں۔ ان کے دونوں بیٹوں کا دوست ریاض وکیل صاحب کی بڑی بیٹی کے دل میں سما جاتا ہے۔ وہ اپنے والدین کی عزت اور سماجی دباؤ کے خوف سے اپنے جذبات کو دل میں دبانے کی کوششوں میں سرسام کا شکار ہو جاتی ہے۔ وکیل صاحب اعلیٰ طبقے کا فرد ہونے کی بدولت اپنے خاندان کے لیے وقت نکالنے سے قاصر رہتے ہیں مگر سماجی روابط کی گرفت ان کی خاندانی ساکھ کو متاثر کر دیتی ہے۔

ان افسانوں کے علاوہ نچلے اور متوسط طبقے کے افسانوں میں بھی غلام عباس نے ایسے متعدد کردار پیش کیے ہیں جو بالا دست طبقات کے نمائندہ ہیں۔ اس قبیل کے کرداروں میں "چکر" کا سیٹھ چھنامل، "فرار" کا نواب ظہیر الدولہ، "ایک دردمند دل" کے فضل کا والد، "بردہ فروش" کے چوہدری گلاب اور کرم دین، "حمام میں" کے میر صاحب، "سرخ گلاب" کے ذیل دار اور پٹواری، "ناک کاٹنے والے" کے چشتی صاحب اور "غازی مرد" کا زمین دار عمر وشامل ہیں۔

نچلے طبقے کے افسانے

غلام عباس کے افسانوں میں نچلے طبقے کا وجود اور اس طبقے کی خاص طبقاتی نفسیات موجود ہے۔ اس تقسیم میں "چکر"، "اوور کوٹ"، "غازی مرد"، "جواری"، "تنکے کا سہارا" اور "اوتار" شامل ہیں۔ انھوں نے نچلے طبقات میں موجود

بے چینی، فرار، استحصالی احساس کم تری، کرب و الم، مظلومیت، سماجی بے حسی، روٹی، تن ڈھانپنے کی مشقتوں اور سسکتی زندگی کی الجھنوں کو نمایاں مقام مہیا کیا ہے۔ "چکر" میں چیلا رام نچلے طبقے کا نمائندہ ہے۔ اس کے مرکزی کردار چیلا رام کا لباس، خوراک، طرز رہائش اور معمولات زیست غربت اور افلاس کی عریاں تصویر کشی ہے:۔

> چونکہ اسے دن بھر چلتے پھرتے رہنا پڑتا تھا۔ اس لیے یہ جوتا، بوٹ چپل وغیرہ کی نسبت زیادہ پائیدار ثابت ہوا تھا۔ اس جوتے نے شروع شروع میں اس کے پیروں کو بہت تکلیف پہنچائی تھی مگر جب اس نے اس کے ٹخنوں اور پیروں کی انگلیوں پر سخت سیاہ گٹے ڈال دیئے تو تکلیف رفع ہوگئی (۵)

"اوورکوٹ" کا بے روزگار اور بے نام نوجوان بھی نظام اقدار کی ناہمواری، ناداری، تنہائی، بے چینی، اعلیٰ طبقات کی بھونڈی نقالی اور نا آسودگی کی دنیا کا باسی ہے۔ اس کے لیے زندگی کا حاصل غربت اور ناداری کو مصنوعی حربوں سے چھپانے کی ناکام کوشش ہے۔ نوجوان کے اوورکوٹ میں پوشیدہ بوسیدہ بدبودار کپڑے، دن بھر کی مٹرگشت، پیسے سے خالی جیبیں، لذت کوشی اور احساس کم تری نچلے طبقات کی سسکتی زندگی کا استعارہ ہیں۔ مثلاً ان کے افسانے "اوورکوٹ" کا ایک اقتباس دیکھئے:۔

> نوجوان کے گلو بند کے نیچے نکٹائی اور کالر کیا سرے سے قمیض ہی نہیں تھی۔ اوورکوٹ اتارا گیا تو نیچے سے ایک بہت بوسیدہ اونی سویٹر نکلا جس میں جا بجا بڑے بڑے سوراخ تھے۔ ان سوراخوں اور سویٹر سے بھی زیادہ بوسیدہ اور میلا کچیلا ایک بنیان نظر آرہا تھا (۶)

"غازی مرد" کا قصہ ایک نوجوان دیہاتی کسان علیا اور اس کی اندھی بیوی چراغ بی بی میں موجود گھریلو نا آسودگی کا منفرد بیان ہے۔ گاؤں کا ایک خوب صورت نوجوان علیا امام مسجد کی وفات پر اس کی نابینا بیٹی کو ایثار و قربانی کے جذبات کی بدولت اپنا جیون ساتھی بناتا ہے۔ دونوں کے درمیان موجود جسمانی اختلافات و نقائص ازواجی زندگی کے سکون پر بربادی کے بادل برساتے ہیں۔ اندھی بیوی دعاؤں کے سہارے اپنی گرہستی بحال رکھنا چاہتی ہے۔ گھر کا منظر اور معمولات زندگی غریب طبقات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ "ایسے میں اگر علیا گھر آتا تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے کسی خانقاہ میں داخل ہوگیا ہے" (۷) "جواری" کے کرداروں میں پنواڑی، نکو اور وثیقہ نویس جیسے کردار نچلے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ سماجی اور معاشی عدم مساوات، دولت کا ناجائز حصول، تفریح کا فقدان اور ریاکاری افسانے کا خاص حسن ہے۔ نکو کی

بیٹھک پر پولیس کے چھاپے سے دس جواری گرفتار ہوئے۔ان میں دو ایک پیشہ وروں کے علاوہ باقی شوقیہ کھلاڑی اور دو بے قصور اشخاص شامل تھے۔ بیٹھک کا مالک نکو ظاہر اور باطن کے تضاد پر مشتمل کردار ہے۔وہ پکڑے جانے والے افراد کو اس بات پر قائل کرتا ہے کہ تھانے میں وہ ہر ماہ دینے والی رشوت کی بدولت ان کو صبح ہونے سے پہلے ہی حوالات سے نکال دے گا۔اس کی ساری باتیں جھوٹی ہوتی ہیں اور سب سے پہلے وہی سزا کے لیے خود کو پیش کرتا ہے۔ان جواریوں پر عائد ہونے والی سزا ان کا تعلق سماج کے نچلے طبقات سے ظاہر کرتی ہے۔اگر ایسا نہ ہوتا تو جوئے کے بااثر اڈوں اور عیاشی کے کلبوں پر ایسی سزا منظر عام پر آتی:۔

> "او جواریو! سنو۔داروغہ صاحب نے حکم دیا ہے کہ تم سب کے سب دھوتی پاجامہ کھول کر زمین پر ایک قطار میں اوندھے لیٹ جاؤ۔پھر تم میں سے سرے والا آدمی ایک ایک کر کے اٹھے اور ہر ایک کے دس دس جوتے لگا کر خود دوسرے سرے پر اوندھا لیٹتا جائے۔غرض اس طرح سب کے سب باری باری ہر ایک کے دس دس جوتے لگائیں"(۸)

"تنکے کا سہارا" چنگی خانے میں ملازم ایک غریب طبقے کے میر صاحب کی وفات پر ان کے بے سہارا خاندان کی داستان غم ہے۔ان کی اچانک موت کے سبب اہل محلّہ پر اس خاندان کی غربت کا راز کھلتا ہے۔اس تنگ دستی کو ایک طویل عرصے تک میر صاحب نے اپنی بوسیدہ شیروانی اور سفید رنگ کے صافے میں چھپا رکھا تھا۔پردیس میں ایک سید مسلمان کے بے کس لاشے اور اس کے خاندان پر محلے دار ہم دردی کی مرہم رکھتے ہیں۔اسی بستی کے ایک بااثر مکین حاجی صاحب قصاب، شیر فروش، بھٹیارے، کنجڑے اور گاڑی بان کی اجتماعی مدد سے اخراجات کا بیڑا اٹھاتے ہیں۔آہستہ آہستہ مرحوم کی بیٹیاں جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتی ہیں تو حاجی صاحب کے بیٹے کی یک طرفہ محبت ان کے گھر کا رخ کرتی ہے۔ادھر ایک اولاد سے محروم فتح محمد انجینئر اس خاندان کے بیٹے کا اپنا متبنّٰے بنانے کے خواہش مند ہیں۔محلے میں مقیم ہر فرد اپنی اپنی حیثیت کے مطابق اس خاندان پر اپنا حق طلب کرنے میں مگن ہے۔اسی دوران بیوہ سیدانی ایک نئے امام مسجد سے عقد ثانی کر لیتی ہے۔محلے میں نچلے طبقات کی سسکتی زندگی کا عکس نظر آتا ہے:۔

> یہ ایک بڑا سا چوکور احاطہ جس کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے دو منزلہ مکان تھے اور بیچ میں کھلا میدان، نچلی منزل میں دو دو کوٹھڑیوں اور ایک ایک آنگن کے مکان تھے۔ ان میں زیادہ تر گاڑی بان بسے ہوئے تھے جن کے نام یہ محلّہ مشہور تھا۔ان کی گاڑیاں

اور مویشی رات کو اسی میدان میں پڑے رہتے اور خود بھی سخت جاڑے کے دو ایک مہینوں کو چھوڑ کر باقی سارا سال باہر میدان ہی میں سوتے تھے۔ میر صاحب کا خاندان بھی ان نچلے مکانوں ہی میں سے ایک میں رہتا تھا(۹)

"فینسی ہیئر کٹنگ سیلون" کا پس منظر تقسیم کے دوران آبادیوں کی ادل بدل اور نئے وطن میں بسنے کے دوران پیش آنے والے مصائب اور مسائل ہیں۔ چار حجام اپنی غربت پر قابو پانے کی خاطر نئی جگہ پر ساجھے کی دکان سے زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔ چاروں حجام برابری اور مساوات کے اصولوں پر خوب ترقی کرتے ہیں۔ آہستہ آہستہ غربت اور سماجی شکست وریخت کی لاشعوری گرفت دوسروں کی حقوق کو اپنا مقدر بنانے کی راہ ہموار کرتی ہے۔ وسائل پیداور پر قبضے کی فطرت باہمی نفرتوں کو فروغ دے کر زندگی کو پھر پہلی سیڑھی پر لے آتی ہے۔ ان حجاموں کی زندگی اور معمولات ان کا تعلق معاشرے کے نچلے طبقات سے بیان کرتے ہیں۔ دیکھیے:۔

ایک چھوٹی سی انگیٹھی، ایک کیتلی اور دو تین روغنی پرچ پیالیاں خرید لیں۔ صبح کو دکان ہی میں چائے بناتے اور ناشتہ کرتے، دوپہر کو تنور سے دو ایک قسم کے سالن اور روٹیاں لے آتے اور چاروں مل کر پیٹ بھر لیتے (۱۰)

"حمام میں" کے کرداروں کا تعلق بھی نچلے طبقے سے ہے۔ یہ کردار ایک خاتون فرخ کے گرد جال کی مانند پھیلے ہوئے ہیں۔ کردار محنت سے عاری زبانی جمع خرچ کے عادی ہیں۔ سماجی عدم مساوات کی بدولت ان کے جذبات اور جسم کھوکھلے محسوس ہوتے ہیں۔ افسانے میں نچلے طبقات کی طبقاتی نفسیات کو بیان کیا گیا ہے کہ معاشی تنگ دستی کی لاشعوری گرفت اس طبقے کے افراد کو محنت سے متنفر کر دیتی ہے۔ وہ اپنی غذائی ضروریات کی تکمیل ہی کو اپنا مقدر سمجھ کر بے بسی کی تصویر بن جاتے ہیں۔ "اوتار" کی فضاء بھی دیہاتی غربت، بے بسی، استحصال اور طبقاتی جبریت کی چکی میں پستی زندگی کا آئینہ ہے:۔

سنبھل ضلع مراد آباد کا ایک پرانا قصبہ ہے۔ یہ قصبہ ہندوستان کے دوسرے قصبوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ وہی گرد سے اٹی ہوئی سڑکیں، وہی تنگ بازار اور گلی کوچے۔ کہیں مٹی کے گھروندے کہیں پختہ اینٹوں کے مکان (۱۱)

اس طرح "جوار بھاٹہ" میں چھجو، شیخ مسیتا، حکیم عمر دراز، "آنندی" کے مستری، مزدور، کبابی، خوانچہ فروش، "اس کی بیوی"، میں نسرین کا والد، نوکر، "اوور کوٹ"، میں بیڑی فروش، تانگے والے، "سایہ"، کا سبحان، وکیل صاحب کا

نوکر، "تنکے کا سہارا"، کی سگو، دکان دار، قصاب، کنجڑا، گاڑی بان، "دو تماشے"، کا اندھا فقیر، اس کی لڑکی، "غازی مرد"، کا امام مسجد، رحمتے کی لڑکی، "بحران"، میں چاند خان کا خاندان، مزدور، مستری، "بندر والا"، میں تماش بین، بندر والا، "کتبہ" کے بازار کے لوگ اور "چکر"، میں چیلا رام اور اس کا خاندان سبھی سماج کے نچلے طبقات سے تعلق رکھتے ہیں۔

طوائفوں کا طبقہ

غلام عباس نے طوائف کو اپنی افسانہ نگاری میں معاشرتی اور معاشی جبر کے طور پر پیش کیا ہے۔ ان کے عہد کا پسندیدہ موضوع ترقی پسند تحریک کی بدولت جنس نگاری تھا۔ انھوں نے مشرقی روایات کے زیر اثر جنس کو ایک موضوع کے طور پر اعتدال سے پیش کیا۔ انھوں نے طوائف کی زندگی پر خارجی جبریت کے داخلی اثرات کو کمال مہارت سے بیان کیا۔ "آنندی" میں طوائفوں کی پوری بستی سماج کی جبریت سے شہر بدر ہو کر داخلی انتشار میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ "بھنور" میں دو طوائف بہنیں گل اور بہار اپنی زندگی سے کنارا کشی کر کے حاجی صاحب کے گھر آ جاتی ہیں۔ سماج میں جائز مقام کی ناکامی ان کو الجھائے رکھتی ہے۔ "اس کی بیوی" کی نسرین اپنے والد کے ستم کا نشانہ بنتی ہے۔ "بردہ فروش" کی ریشماں، "ناک کاٹنے والے" کی ننھی جان، "حمام میں" کی فرخ بھابی، "کن رس" کی لڑکیاں اور "سمجھوتہ" میں طوائف کسی نہ کسی خارجی جبریت سے اندرونی شکست و ریخت اور توڑ پھوڑ میں مبتلا دکھائی دیتی ہے۔ غلام عباس کی طوائف سماج کے نچلے طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا پیشہ کسی ہوس ناکی کے بجائے معاش کی تکمیل اور مردانہ سماج کی خواہشات کے گرد گھومتا ہے۔ اپنی زندگی دوسروں کی مرضی اور منشاء کے مطابق بسر کرنے سے طوائف نفسیاتی کش مکش کا شکار ہو جاتی ہے۔ وہ ایک طرف اپنے دھندے سے ناخوش دکھائی دیتی ہے تو دوسری طرف امید کی ہلکی سی کرن کا دامن بھی اپنے قریب پا کر نئی زندگی کی کوشش کرتی ہے، چاہے اس میں ناکامی مزید الجھاؤ ہی کیوں نہ پیدا کر دے:۔

> طوائف کو انھوں نے کہیں بھی جنسی ضرورت کے طور پر استعمال نہیں کیا بلکہ اسے معاشرتی پس منظر میں رکھ کر دیکھا ہے۔ وہ معاشرے کا ستایا ہوا ایسا کردار ہے جس کے لیے پیٹ بھرنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ وہ اپنے پیشے کو نہ چاہتے ہوئے بھی جاری رکھے (۱۲)

اعلیٰ طبقے پر مشرقی روایات کی جکڑ بندی

غلام عباس کی افسانہ نگاری میں اعلیٰ طبقے کے کردار مشرقی روایات سے گہری عقیدت رکھتے ہیں۔ان پر اپنے خاندانی ناموں، شجرہ نسب، پرانی تعلق داری اور خاندانی روایات کی پاس داری کا گہرا لحاظ جذباتیت کی سطح تک اپنی گرفت مضبوط کیے ہوئے ہے۔"نواب صاحب کا بنگلہ "میں نواب صمام الدولہ اپنی خاندانی روایات کو سینے سے لگائے، جدید عہد کے تقاضوں سے بے خبر ایک فریب میں مبتلا زندگی بسر کر رہے ہیں۔وہ ایک خاص کلچر میں پرورش پانے والے رجعت پسند شخص ہیں جو وقار کے گہرے ملبے تلے مدفون ہیں۔انھوں نے سماج سے خود کو پوشیدہ رکھنے کے لیے ایک اوورکوٹ پہن رکھا ہے جس کے باہر نواب صاحب کی شان و شوکت کا خود ساختہ خول اور اندر روایات سے گہری عقیدت کا استر موجود ہے۔وہ اپنے ویران بنگلے کی چار دیواری میں خاندانی نام سینے سے لگائے ہوئے شجرہ نسب کو الماری کی زینت بنا کر ایک گم نام زندگی بسر کر رہے ہیں۔ان کا خاندانی شرف اور وقار ان کو سماج کے طبقات سے کٹے رہنے پر اکساتا ہے۔ ان کی استحصالی طبعیت جو اپنے اسلاف کی میراث ہے، اعلیٰ طبقے کی خاص نفسیات کا آئینہ دار ہے۔وہ معاشرے کے غریب طبقات کو خود سے کم تر تصور کر کے ایک حد امتیاز قائم رکھتے ہیں۔نواب صاحب اپنی پرانی دنیا میں زندگی کے شب و روز بسر کرتے ہوئے اس خوش فہمی میں گرفتار ہیں کہ معاشرے کے نچلے طبقات کو اب بھی ان کی خاندانی برتری کا احساس ہے۔وقت کے بدلنے سے معاشرتی رویے بھی بدل جاتے ہیں۔ان کے بنگلے کا اندرونی نقشہ ان پر روایات کی گہری جکڑی بندیوں کی غمازی کرتا ہے:۔

> وہ یوں نواب صاحب! بے تکلفی معاف کہ یہ بنگلہ سراسر ایک فریب ہے، ایک دھوکا ہے۔اس بنگلے میں کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں جو چرانے کے قابل ہو۔ذرا اس ڈرائنگ روم پر نظر ڈالیے۔یہ دقیانوسی صوفہ سیٹ، یہ پرانا قالین، جس میں جگہ جگہ سوراخ ہیں، یہ پرانی گول میز، یہ بے ڈھنگی تپائیاں جن کا روغن اتر چکا ہے، دیوان پر یہ میلا سا پلنگ بچھا ہے، یہ پرانے مخملی گاؤ تکیے، یہ بوسیدہ پردے (۱۳)

نواب صاحب کے بنگلے کی ہر چیز اپنے وقت کی قیمتی، اعلیٰ شان و شوکت والی، منفرد رکھ رکھاؤ، بہترین تزین و آرائش، ان کے خاندانی وقار اور امارت کی عکاسی کرتی ہے۔بدلتے حالات نے ان اشیاء کو آثار قدیمہ کی فہرست میں شامل کر دیا ہے۔نواب صاحب اور ان کے بنگلے کی اندرونی کیفیت کوئی زیادہ مختلف محسوس نہیں ہوتی۔دونوں کے اندر کی

دنیا بدلتے حالات سے بے خبر اور قدیم روایات کی اسیر ہے۔ایک معمولی چور کی طرف سے ان کا سماجی بھرم بے نقاب کرنے کی ایک دھمکی نواب صاحب کی اندر طبقاتی تفریق کا محل زمین بوس کر دیتی ہے۔بالا دست طبقے کی استحصالی طبقاتی نفسیات سماج کے زیر دست طبقات میں اصلیت اور اندر کی شکستہ حالی کا راز کھلنے پر ایک خوف میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ معاشرے کے اعلیٰ طبقات کا یہ کردار اصلیت کھلنے کے خوف اور مصنوعی زندگی کے انکشاف سے گھبرا کر سمجھوتے بازی پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

"سایہ" میں وکیل صاحب اور ان کی پورے خاندان پر مشرقی روایات کی گہری پکڑ محسوس ہوتی ہے۔یہ اس روایتی معاشرے کی کہانی ہے جہاں عورتیں بے زبان جانوروں کی مانند ہوتی ہیں۔بچپن ہی سے لڑکیوں کی پرورش و پرداخت اس ڈھنگ سے کی جاتی ہے کہ وہ پوری سنجیدگی اور دیانت داری سے روایات واقدار کو اپنا مقدر سمجھنے لگتی ہیں۔ اعلیٰ تعلیم بھی ان خاندانوں میں اخلاقی جرات اور اقدار سے بغاوت ابھارنے میں ناکام رہتی ہے۔مشرقی راویات کی کڑی جکڑ بندیوں کی بدولت ان کی قوت فیصلہ سرد پڑ جاتی ہے۔اپنی خواہشات کو سماجی جبریت کے زیر اثر اپنے ہی اندر دبا کر یہ لوگ دائمی امراض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔وکیل صاحب کی بڑی صاحب زادی اپنے بھائیوں کے دوست ریاض میں دل چسپی لیتی ہے۔وہ ہر روز اپنے کمرے کی کھڑکی پر پڑی چق کے پیچھے سے اس کو دیکھتی ہے۔ریاض ان باتوں سے ان جان ہے کیوں کہ دونوں کے درمیان روایات اور پردے کی چق مضبوطی سے حائل ہے۔اعلیٰ طبقے کی مصروفیات ان کو گھر سے باہر الجھائے رکھتی ہیں۔ان کی خواتین گھروں کی چار دیواری میں اپنی پسند و ناپسند کے احساس کو خاندانی روایات کے خوف سے دبا لیتی ہیں۔ان کی زندگیاں تمام تر مادی آسائشوں کے باوجود لاشعوری الجھنوں میں گر کر امراض اور مستقل بے چینی کا روپ دھار لیتی ہیں:۔

> روایتی معاشرے کی قدروں کے نظام میں ان کے لیے اپنے جذبات اور پسند و ناپسند کے اظہار کی گنجائش نہ ہونے کے برابر تھی۔اپنے خیالات اور تمناؤں کی دنیا بسا لینے کے بعد راہیں مسدود پا کر اندر ہی اندر گھٹ کر زندگی گزارنے کا المیہ اور ذہنی دباؤ اس طرح کے واقعات و کیفیات کو جنم دیتا ہے۔وکیل صاحب کی بڑی صاحبزادی کی خود میں دلچسپی کا ریاض کو سان و گمان بھی نہیں۔دوسری طرف وکیل صاحب کی صاحبزادی کے لیے کوئی راہ اور حل موجود ہی نہیں۔اسے حالات اور قسمت کے دھارے کے ساتھ بہنا ہے(۱۴)

"یہ پری چہرہ لوگ" کے کردار بھی طبقاتی سماج میں روایات کی کڑی جکڑ بندیوں کی لاشعوری الجھن میں گرفتار ہیں۔ بیگم تراب علی اعلیٰ طبقے کا نمائندہ کردار ہے۔ جن کے اندر غرور، تکبر، اعلیٰ شان وشوکت کی ظاہری چمک، استحصالی سوچ، نچلے طبقات پر اپنا رعب بحال رکھنے کی کوشش اور مالی استحکام کا دبدبہ بالا دست طبقات کی خاص نفسیات کی متنوع جھلک ہے۔ بنیادی طور پر وہ بھی مشرقی روایات کے زیر اثر ایک جاگیردارانہ سوچ رکھتی ہیں۔ ان کی شخصیت میں ایک نوابی سوچ ہر لمحہ بیدار رہتی ہے۔ " آواز اونچی اور گھمبیر اور رنگ سانولا جو غصے کی حالت میں سیاہ پڑ جایا کرتا چنانچہ نوکر چاکر ان کی ڈانٹ ڈپٹ سے تھر تھر کانپنے لگتے اور گھر بھر میں سناٹا چھا جاتا" (۱۵) اپنے بنگلے کے آنگن میں ٹہلتے ہوئے وہ ایک مہترانی سگو اور اس کی بیٹی کے درمیان ہونے والی بے تکلف بات چیت سن کر اپنی استحصالی نفسیات کے زیر اثر نچلے طبقات کے سامنے اپنا اور اپنے طبقے کا مقام گرتا ہوا محسوس کرتی ہیں۔ وہ ایک لمحے جب مہترانی سے اپنی ہم پلہ بیگمات کے بگڑے ہوئے نام سنتی ہیں تو ایک لاشعوری تسکین اور سکون محسوس کرتی ہیں۔ بنیادی طور پر ہر انسان نرگسیت کی نفسیاتی الجھن کی بدولت اپنے ہم پیشہ، ہم پلہ اور یکساں حیثیت کے افراد کی گراوٹ کو اپنی فتح تصور کرتا ہے۔ معاشرے کے بالا دست طبقات میں استحصالی سوچ یکساں نوعیت کی ہوتی ہے چوں کہ اس کے پس پردہ ان کی سماجی برتری کا عنصر اپنا اثر دکھا رہا ہوتا ہے۔ طبقاتی معاشرے کا اخلاق بھی طبقاتی نوعیت کا ہوتا ہے۔ بیگم تراب علی کو جب اپنے طبقے کا مقام معاشرے کے نچلے طبقات میں گرتا ہوا محسوس ہوا تو اس میں اپنی تنزلی پا کر وہ اس کو طاقت سے بحال رکھنے کی کوشش کرتی ہیں:۔

> بیگم صاحب بے اختیار مسکرا دیں، ان کا غصہ اب اتر چکا تھا اور سگو کی باتوں کو بڑی دلچسپی سے سن رہی تھیں کہ اچانک ایک اور بات ان کے ذہن میں آئی اور ان کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ ماتھے پر بل پڑ گے۔ ڈانٹ کر بولیں۔ " کیوں مردار تو نے میرا بھی تو کوئی نہ کوئی نام ضرور رکھا ہو گا۔ بتا کیا نام رکھا ہے؟ سچ سچ بتائیو، نہیں تو مارتے مارتے بھرکس نکال دوں گی (۱۶)

مہترانی سگو کو ڈانٹنا اور مار مار کر بھرکس نکالنے کی دھمکی اعلیٰ طبقات کی استحصالی سوچ کے عین مطابق ہے جس کی بدولت وہ خود کو ارفع دنیا کی مقدس ترین مخلوق تصور کرتے ہیں۔ یہی طبقاتی سوچ اس طبقے کو استحصال پر اکساتی ہے۔ سگو کی طرف سے بیگمات کے رکھے ہوئے نام نچلے طبقات کے اندر طبقاتی، معاشرتی اور معاشی عدم مساوات کے لاشعوری احساس کم مائیگی کی بدولت ممکن ہوتے ہیں۔ معاشرے کے نچلے طبقات اعلیٰ طبقات کی خدمت گزاری سے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ جب زندگی میں شدید مشکلات، ناکافی سہولیات، افلاس، بیماری، بھوک، تنگ دستی، ٹھکانے کی عدم دستیابی،

سسکتی زندگی ان کا مقدر بنتی ہے اور ان کی لیے زندگی کی آسائشیں ایک خواب بن جاتی ہیں تو ان کے اندر نفرت ایک احتجاج بن کر سامنے آتی ہے۔ انھیں اپنی زندگی کا استحصال امراء کی عیاشیوں اور پر آسائش زندگی میں نظر آتا ہے۔ اس طرح غلام عباس اعلیٰ طبقے کی طبقاتی نفسیات میں طبقاتی روایات کی شدید گرفت کا ذکر کرتے ہیں جن سے اعلیٰ طبقات بری طرح متاثر ہوتے ہیں۔ وہ اپنے خاندانوں سے استحصالی موج اور جاگیردارنہ روایات ساتھ لے کر جوان ہوتے ہیں۔ یہ اپنی خاندانی بالادستی قائم کرنے میں زیردست طبقات کا استحصال کرتے ہیں۔ اس ساری الجھن کے پس پردہ سماج میں اپنی ساکھ کو بحال رکھنے کی احساس کم تری شامل ہوتی ہے۔

نچلے طبقات پر طبقاتی تشدد کے عوامل

غلام عباس کا نچلا طبقہ طبقاتی تشدد کے زیر اثر نفسیاتی مسائل کا شکار ہے۔ نفسیاتی الجھنیں نچلے طبقات کے رجحانات اور رویے تشکیل کرتی ہیں۔ طبقاتی تشدد کے عوامل میں طبقاتی تقسیم، جبر و استحصال، دولت کی غیر مساوی تقسیم، پیداوری وسائل پر مقتدر افراد کا قبضہ، ذاتی املاک کے تحفظات کے قوانین، معاشی نا ہم واریاں، جنسی گھٹن، نا آسودگی، طبقہ امراء کی ہوس اور سماجی اونچ نیچ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ طبقاتی تشدد کے یہی عناصر نچلے طبقات میں نفسیاتی مسائل پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ غلام عباس نے نچلے طبقات کے طبقاتی تشدد میں معاش، جنس، سماجی عدم مساوات اور معاشرتی جبریت کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ نچلے طبقات میں معاش کی بدولت پیدا ہونے والی نفسیاتی شکست و ریخت اور اس سے پروان چڑھنے والی طبقاتی نفسیات کا اظہار "چکر"، "آنندی"، "اوور کوٹ"، "فینسی ہیر کٹنگ سیلون" اور "دو تماشے" میں زیادہ شدت سے محسوس ہوتا ہے۔ جنس کے حوالے سے "اس کی بیوی"، "بھنور"، جنس و معاش کے ضمن میں "بردہ فروش"، "تنکے کا سہارا"، "ناک کاٹنے والے" کا ذکر خصوصیت سے کیا جا سکتا ہے۔ "چکر" معاش کی نفسیاتی الجھن کے گرد گھومنے والا ایک بے مثال افسانہ ہے۔ اس میں دولت کی غیر مساوی تقسیم اور دولت پر چند افراد کے قبضے کو بیان کیا گیا ہے۔ سیٹھ چھنامل سرمایہ دار طبقے کی علامت ہے جس پر اپنے کاروبار کی وسعت اور دولت کو زیادہ مقدار میں سمیٹنے کی دھن سوار ہے۔ اس کے لیے اپنے ملازم چیلا رام کی زندگی، صحت، مشکلات، احساسات و جذبات، موسم، سفری تھکاوٹ اور خاندان کی بیماری کوئی خاص معانی نہیں رکھتی۔ اس کے لیے مال گودام، بینک میں روپے کی منتقلی، رجسٹریاں، اپنے نسخہ جات اور گھریلو ضروریات کی اشیاء کی فراہمی زیادہ معانی رکھتی ہے۔ "سیٹھ اس وقت گاؤ تکیے سے لگے پیچوان پی رہے تھے۔ انھوں نے چق کے اندر سے چلا کر کہا، اے منیم جی! دیکھنا مال گودام جانا نہ بھول جانا اور بینک میں روپیہ بھی جمع ہو جائے اور وہاں

وہ رجسٹریاں بھی تو ضروری ہیں"(۱۷) آنندی کے ارد گرد ایک پوری منڈی سجی ہوئی ہے ۔اس منڈی میں خوانچہ فروش،مستری،مزدور،کسان،حجام،بزاز،اور دیگر روزگار سے وابستہ افراد کی ذہنی الجھنیں اور سفری مصائب ان کی نفسیاتی شکست وریخت کا باعث بنتے ہیں۔"اوورکوٹ"میں نظام اقدار کی ناہمواری،ناداری،تنہائی،نا آسودگی اور بہروپ کی خارجی جبریت سے داخلی مسائل کو سامنے لایا گیا ہے۔"فینسی ہیر کٹنگ سیلون" کا موضوع بھی معاشی فکر ہے۔اقتصادی الجھنوں کی تہہ سے ہی نفسیاتی الجھاؤ ابھرتے ہیں۔اس افسانے میں غلام عباس اشتراکیت سے گہرے متاثر دکھائی دیتے ہیں۔چار حجام اپنی دکان کو اشتراکیت کے مساوی اصولوں سے شروع کرتے ہیں۔دکان کی ترقی میں وسائل پیداوار پر یکساں قبضے کا راز پوشیدہ ہے۔اشتراکی ممالک میں پیداوار اجتماعی صورت اختیار کر لیتی ہے جس سے تضادات باقی نہیں رہتے۔"دو تماشے"میں بھی غربت اور تنگ دستی کی عریاں تصویر کشی کا حق ادا کیا گیا ہے۔بوڑھا بھکاری اور اس کی بھوکی اندھی لاغر بیٹی افلاس کی بھیانک تصویر ہیں جو طبقاتی سماج کی انسان کش تدابیر سے ابھرتی ہیں۔معاشرے میں چند افراد کا وسائل پر قبضہ تنگ دستی کو نچلے طبقات کا مقدر بناتا ہے۔غلام عباس معاشرے میں طبقاتی تشدد کے حوالے سے معاش کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔نچلے طبقات کی زندگی میں بے چینی،افراتفری،اکتاہٹ،فرار اور احساس کم تری کی طبقاتی نفسیات میں دولت کی غیر منصفانہ تقسیم،ذاتی املاک کی ہوس،نظام اقدار کی ناہم واری اور غلامی کی مستقل روایت بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔

جنس کی نا آسودگی کو بھی غلام عباس نے طبقاتی بنت سے ظاہر کیا ہے۔"آنندی"میں جبلتوں کی قوت اور اس کی سامنے دم توڑتے اخلاقی و معاشرتی بندھنوں کو افسانوی رنگ میں بیان کیا گیا ہے۔اس افسانے میں جنس کو معاشی الجھاؤ کے ساتھ ملا کر بیان کیا گیا ہے۔طوائف کا پیشہ جہاں مردوں کی جسمانی خواہش اور طلب کی تسکین ہے وہاں پیٹ کی بھوک اور دیگر ضروریات زندگی کی فراہمی کا بھی ذریعہ بھی ہے۔"اس کی بیوی"میں مردانہ سماج کے جسمانی تقاضوں کے سامنے کم زور ہوتی عورت کی بے بسی کو سامنے لایا گیا ہے۔اسی کے ساتھ قحبگی اور دیگر جرائم کو غربت سے نمو پاتے دکھا کر عورت کے طبقاتی اور نفسیاتی مسائل کو بے نقاب کیا گیا ہے۔سماج میں جنسی گھٹن اور گھریلو الجھنوں کا دباؤ نوجوان کو کوٹھے کی طرف راغب کرتا ہے۔نسرین کی داخلی شکست وریخت کے پس پردہ اس کی والد کی غربت سامنے آتی ہے جو اس کو بچپن میں ایک کوٹھے پر فروخت کر دیتا ہے۔افسانے میں معاشرے کے نچلے طبقات اولاد کی پرورش سے عاری نظر آتے ہیں:۔

یہ سفر بہت لمبا تھا۔مگر اس کی سہمی ہوئی نظروں نے جلد ہی ستاروں کو ڈھونڈ نکالا تھا۔
ان کو دیکھ کر اس کا ڈر کم ہونے لگا تھا۔ یہاں تک کی وہ باپ کے کندھے سے لگ کر سو
گئی۔آنکھ کھلی تو خود کو ایک اجنبی عورت کے گھر پایا۔وہ کئی دن تک روتی بلکتی رہی مگر
باپ کی صورت دیکھنا اسے کبھی نصیب نہ ہوئی (۱۸)

اپنی اولاد کو فروخت کرنے میں غربت کے علاوہ کچھ سماجی قدروں کا بھی عمل دخل ہے۔مردوں کی طرف سے عورت کو اپنی املاک تصور کرنے سے اس سلسلے کی ابتدا کا ذکر علی عباس جلالپوری یوں کرتے ہیں:۔

باپ بیٹیوں کو اور خاوند بیویوں کو اپنی ذاتی املاک سمجھتے تھے۔باپ اپنی بیٹی کی قیمت
وصول کرنے لگے۔ایران کے دیہات میں آج بھی دلہن کی ماں دلہا سے شیر بہا
وصول کرتی ہے یعنی اس دودھ کی قیمت مانگتی ہے جو اس نے اپنی بیٹی کو پلایا تھا۔
چین (انقلاب سے قبل) جاپان، وسطی امریکہ، قدیم ہندوستان اور یہودیہ میں
بیٹیاں فروخت کرنے کا عام رواج تھا بعض ممالک میں آج بھی بیٹیوں کی قیمت
وصول کی جاتی ہے (۱۹)

نسرین کی ماں جب فوت ہوئی تو اس کی عمر صرف چار سال تھی۔اس کے والد کا ریل کا سفر، سامان کی ایک مختصر گٹھڑی اس کی تنگ دستی، دوسری شادی کے خرچ اور بیٹی کی پرورش کو ایک بوجھ خیال کرنے کے اشارے بین السطور میں محسوس ہوتے ہیں۔اولاد کی فروخت میں انسان کی غربت اور تنگ دستی آخری حدوں کو چھو رہی ہوتی ہے۔نسرین کی نفسیاتی الجھن میں یہ سانحہ ایک طاقت ور محرک سے کم نہ تھا۔اسی وجہ سے وہ زندگی میں ایک اکتاہٹ کا شکار رہی۔قحبگی کے ساتھ ساتھ والدین اپنی اولاد میں بیٹیوں کو کوٹھوں کی رونق بنا کر اپنی مستقل آمدنی کا ذریعہ بھی بنانے پر طبقاتی سماج کی بدولت مجبور ہوتے ہیں۔"حضرت ہمارے ماں باپ نے ہمیں یہی پیشہ سکھایا ہے اس میں ہمارا کیا قصور" (۲۰) سماج کے نچلے طبقات کی احساس کم تری کی شدت میں ان کی اقتصادی بدحالی زیادہ اہم کردار ادا کرتی ہے۔طبقاتی سماج میں جنسی گھٹن نہ صرف طوائفوں کو زندہ رکھتی ہے بل کہ ان تک رسائی کی کوشش نچلے طبقات میں جرائم کو ابھارنے میں بھی کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ان جرائم کی تہہ میں جنسی نا آسودگی متحرک ہوتی ہے۔"ببنور" کا ایک کردار جو ایک بینک میں ملازم ہوتا ہے وہ طوائفوں کو رام کرنے کے لیے ڈکیتی کرتا ہے۔غلام عباس جرائم کی نفسیات میں جنسی نا آسودگی اور معاشی تنگ دستی کو سماج کے زیر دست طبقات کی طبقاتی نفسیات کے طور پر سامنے لاتے ہیں۔"حمام میں" کی فرخ بھابی کو بھی معاشی تنگ دستی کی

جبریت سے طوائف بنتے دکھایا گیا ہے۔اس کی سلائی مشین کی چوری اور نکمے احباب کی منڈلی اس کو معاشی بد حالی کی طرف لے جاتی ہے۔وہ میر صاحب کی آغوش میں اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے ہی گرتی ہے۔معاش کی الجھن ہی اس کی زندگی کو یکسانیت اور یک رخی کی طرف دھکیلتی ہے۔اس کا میر صاحب سے میل جول عورت پن کے تقاضے کے ساتھ ساتھ معاشی جبر کا شاخسانہ بھی ہے۔سماج قانون اور ماحول کی جبریت کے گرد گھومنے والے افسانوں میں "جواری"، "ہمسائے" اور "ناک کاٹنے والے" قابل ذکر ہیں۔نکو کے کردار سے غلام عباس معاشرے کے نچلے طبقے کو سامنے لاتے ہیں۔قانون کی سماج کے کم زور طبقات پر مضبوط پکڑ اور بالا دست طبقات کے جرائم سے چشم پوشی کو ابھارا گیا ہے، قانون کا دوہرا معیار سماج کے نچلے طبقات میں مایوسی اور بدگمانی کو اس طبقے کی طبقاتی نفسیات بنا کر مستقل وجود عطا کرتا ہے۔"ہمسائے" میں ایک ہی آنگن کے مکین طبقاتی تفریق کا شکار ہو کر اپنے بچوں کی نفسیاتی کم زوری کو تحریک دینے میں الجھے ہوئے ہیں۔والدین کا طبقاتی رویہ عمر بھر بچوں کی سوچوں اور رویوں کا تعاقب کرتا رہتا ہے اور ایک مستقل نفسیاتی الجھن بن کر سماجی عدم مطابقت کو بنیاد مہیا کرتا ہے۔"ناک کاٹنے والے" میں ننھی جان پر قانون کی جبریت تین پٹھانوں کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔وہ سماج کے کم زور طبقات پر بالا دست طبقات کی طاقت اور استحصال کا استعارہ ہیں۔اپنے اختیارات اور قوت کے استعمال میں اعلیٰ طبقات کا سکون اور اپنی بالا دستی کی طبقاتی نفسیات کارفرما ہے۔دوسری طرف نچلے طبقات کی مستقل اکتاہٹ اور زندگی کی بے یقینی کے پس پردہ اسی جبر اور طاقت کا محرک نمو پا رہا ہوتا ہے۔زیر دست طبقات کی مایوسی ایک بے بس و بے کس رویے کو شخصیت کے اندر سمو دیتی ہے:۔

> اس کے جواب میں تیسرے آدمی نے یکبارگی آگے بڑھ کر زور کا ایک مکا اس کے منہ پر مارا۔اس ناگہانی ضرب پر حسین بخش کی آنکھوں کے آگے اندھیرا آ گیا۔آنسو اس کی آنکھوں میں جھلکنے لگے۔اس نے سر جھکا لیا(۲۱)

نچلے طبقے کے نفسیاتی مسائل

نچلے طبقات کے اندر پیدا ہونے والے نفسیاتی مسائل خارج کی جبریت سے پروان چڑھتے ہیں۔خارجی جبریت کے عوامل داخلی گوشوں کے اندر ارتعاش پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔سماج کے نچلے طبقات کی طبقاتی نفسیات کو مرتب کرنے میں بیرونی حاکمیت و عوامل اہم کردار ادا کرتے ہیں۔اس جبریت میں اقتصادی ناہم واری کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔غلام عباس کی افسانہ نگاری میں معاش طبقاتی نفسیات کو متاثر کرنے میں کلیدی مقام رکھتی ہے۔افسانہ

"چکر" کا کردار چیلا رام معاشرے کے بے بس اور دبے ہوئے طبقے کا نمائندہ ہے۔زندگی اس کے لیے ایک تھکا دینے والا مسلسل سفر ہے جہاں اندھیروں اور تاریکیوں کا راج ہے۔زندگی کا پھیکا پن،اکتاہٹ اور بے یقینی معاشی الجھن کی آغوش میں پرورش پاتی ہے۔گرمی کے تپتے ایام میں بھوک پیاس سے نڈھال چیلا رام زندگی کی مشقتوں کا آئینہ ہے جہاں جان توڑ محنت اور بے ثمر حاصل نچلے طبقات کی طبقاتی نفسیات میں احساس کم تری کو مستقل وجود مہیا کرتا ہے۔ مایوسی اور اندھیروں میں سفر کرتی زندگی فرد کی اندر اس قدر بے یقینی کی کیفیت کو مضبوط کرتی ہے کہ فرد خود کو جانوروں سے بد تر سمجھ لیتا ہے۔اسی جبریت سے گھبرا کر انسان اپنی تخیلاتی دنیا میں پناہ لیتا ہے اور حقیقت سے گریز کا رجحان وقوع پذیر ہوتا ہے:۔

> "چکر" سیٹھ چھینامل کے منیم چیلا رام کی اس لا حاصل بھاگ دوڑ اور بے ثمر محنت کی کہانی ہے جس کے آخر میں وہ اپنے ہمسائے کو چوان کو اپنے گھوڑے کی ٹہل کرتے دیکھ کر افسردہ ہو جاتا ہے اور سوچنے لگتا ہے" کیا وہ آواگون کے مسئلے پر غور کر رہا تھا؟ کیا وہ یہ چاہ رہا تھا کہ اب کے جب وہ مر جائے تو اس کا جنم گھوڑے کی جون میں ہو(۲۲)

زندگی کی معاشی الجھن چیلا رام کے اندر ایک ترش اور روکھا انداز گفت گو پیدا کرتی ہے۔اس کا چڑچڑا پن زندگی سے نفرت کی لاشعوری صورت سے شعور کی طرف سفر کرتا ہے۔وہ اپنی بیوی اور بیٹی کے لیے ایک ان جا،نیم مردہ، جذبات سے خالی حرکت کرتا جسم ہے جو محض روٹی اور سانس کے اشاروں سے زندہ محسوس ہوتا ہے۔"اس کی چھوٹی لڑکی آ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی تھی۔شاید اس نے اسے درشتی سے پرے ہٹا دیا تھا"(۲۳) اپنے خاندان اور سماجی رشتوں سے ایک اکتاہٹ اور لاتعلقی کی طبقاتی نفسیات میں زندگی کی معاشی تگ و دو اور اس میں ناکامی کی الجھن مصروف عمل ہوتی ہے۔ دولت کی غیر منصفانہ بانٹ سے ایک طرف چیلا رام اس قدر مصائب و آلام میں گرفتار ہے تو دوسری طرف سیٹھ چھنامل اور اس کے دوست ان تکالیف سے بے خبر گاؤ تکیوں کے سہارے خوش گپیوں میں مگن ہیں۔سماج کے اعلیٰ طبقات میں زندگی کی رونق اور سماج کے نچلے طبقات سے بے زاری کی طبقاتی نفسیات میں معاشی آسائشوں کا عمل دخل ہوتا ہے۔ "اوورکوٹ" کا ہیرو جنسی ناآسودگی کی بدولت لذت پرستی اور چھیڑ چھاڑ جیسی نفسیاتی کش مکش کا اسیر ہے۔انسان کے جذبات،نوجوانی کی خواہشات،جنس کی لطف اندوزی اور جسمانی تسکین پر ہر طبقے کے نوجوان کا یکساں حق ہے۔طبقاتی سماج میں معاشرتی تفریق اور معاشی الجھن سماج کے نچلے طبقات کی جسمانی خواہشات میں رکاوٹ بنتی ہیں۔جذبات کی

تسکین پر عائد ہونے والی پابندیاں نچلے طبقات میں لذت پرستی کو ایک مستقل طبقاتی نفسیات کے طور پر سامنے لاتی ہیں۔ اسی وجہ سے اس طبقے کے اکثر نوجوان عمر بھر عورت کا حقیقت میں سامنا کرنے میں ایک عجیب سا خوف محسوس کرتے ہیں۔ افسانے کا نوجوان اوورکوٹ کے طفیل اپنی ناداری اور غربت کو ضرور ڈھانپ لیتا ہے لیکن جنسی ناآسودگی نوجوان جوڑے کی گفت گو کے زیر اثر بے قابو ہو کر اس قدر شعوری زندگی پر اپنی گرفت بنا لیتی ہے کہ نوجوان چھکڑے کے نیچے آ کر اپنی جان گنوا دیتا ہے۔ "سرخ جلوس" امتیازی صفات کے لحاظ سے نچلے متوسط طبقات پر معاشی جکڑ بندیوں کی بدولت نفسیاتی شکست و ریخت کو سامنے لاتا ہے۔ افسانے میں طبقاتی کش مکش کو تاریخی قوتوں کے بطن سے پھوٹنے کے بجائے معاشرے کی بھیڑ چال سے پھوٹتا ہوا دکھایا گیا ہے۔ "پھر رفتہ رفتہ فکر معاش نے مجھے "ستارہ مشرق" میں ملازمت کرنے پر مجبور کر دیا" (۲۴) فکر معاش کی مجبوری میں گھرا کردار ستارہ مشرق میں ملازمت کے دوران ایک امریکی خاتون مس گلبرٹ کو ایک فرضی جلوس دکھاتا ہے۔ بنیادی طور پر نوجوان اپنی معاشی الجھن کی وجہ سے جھوٹ کا سہارا لیتا ہے۔ وہ غیر ملکی مہمان کے سامنے غلط بیانی کے دوران ایک نفسیاتی خوف میں الجھا ہوا ہے مگر اس جھوٹ کی تہہ میں ملازمت کی بحالی کی کوشش اور بے روزگار ہونے کی فکر شامل ہوتی ہے۔ سماج کے نچلے طبقات کی کمزور اخلاقیات میں بھی اکثر معاشی مسائل ہی اپنا اثر دکھا رہے ہوتے ہیں۔ سماج کے پستے ہوئے کردار اپنے بالا دست طبقات سے کئی توقعات وابستہ کر لیتے ہیں۔ غیر ملکی مہمانوں سے مقامی افراد کی توقعات بھی غلام عباس کے ہاں اقتصادی عوامل سے پھوٹتی محسوس ہوتی ہیں۔ "وہ بہت امیر عورت ہے۔ امریکہ والوں کو تم جانتے ہی ہو" (۲۵) افسانے کے مشرقی کردار روایات کے اسیر ہیں۔ وہ غیر ملکی مہمان کو دھوکہ دینا ایک اخلاقی جرم خیال کرتے ہیں۔ دولت کی چمک، ناآسودہ زندگی اور مس گلبرٹ کی پرآسائش زندگی ان کو اس امر کے لیے اکساتی ہے۔ زیر دست طبقات میں بھوک اور سہولیات کی عدم دستیابی جب کسی حقیقی آسودہ زندگی کو قریب سے دیکھتی ہے تو اسی ڈھنگ سے جینے کی خواہش اخلاقیات کی دیواروں کو کم زور کرنے کے ساتھ ساتھ جرائم کی راہ بھی ہم وار کرتی ہے۔ سماج کے نچلے طبقات کی مدد کا اعلیٰ طبقاتی جذبہ بھی اکثر اوقات طبقات کی اپنی ذاتی آسانیاں پیدا کرنے میں گم ہو جاتا ہے۔ "فینسی ہیر کٹنگ سیلون" بھی اشتراکی نظریات کے گرد گھومتا ہے۔ غلام عباس اپنے اس افسانے میں غربت اور معاشی الجھنوں کو سلجھانے کا حل اشتراکیت میں تلاش کرتے نظر آتے ہیں:۔

> ساجھا ایک کنبہ کی طرح ہے جس میں کمانے والے فرد اپنی اپنی بساط کے مطابق کنبہ کی پرورش کرتے ہیں۔ کم و بیش کمانے والوں یا نہ کمانے والوں میں کسی قسم کی تفریق نہیں کی جاتی اور یہ استاد کی حد درجہ کم ظرفی ہے کہ وہ زیادہ ہنر مند اور کم ہنر مند کا سوال اٹھا کر ساجھے میں تفریق پیدا کرنا چاہتا ہے (۲۶)

دکان کو چار حجام اپنی مشترکہ ملکیت سمجھ کر پوری محنت ،ایمان داری اور آزادی کے تحت کام کو بہتر انداز سے چلانے میں مگن تھے۔وہ اشتراکیت کی بنیاد پر ایک دوسرے کے لیے ہم دردی اور انسانی جذبات سے مزین زندگی بسر کرتے ہیں۔وہ ایک طرف منشی کو انسانی احساسات کے تحت نہ صرف اپنی دکان پر رہنے اور کھانے کی اجازت دیتے ہیں بل کہ رخصت پر جانے والے استادوں کو طویل عرصے کے بعد لوٹنے پر اپنی کمائی سے حسب حیثیت امداد بھی کرتے ہیں۔ نچلے طبقے کے چار حجام غربت ،ناداری،تنگ دستی،خاندانی کفالت کے دباؤ کی بدولت رفتہ رفتہ اجتماعیت کو انفرادیت پر قربان کر دیتے ہیں۔ان کے اندر نفرت ،احساس کم مائیگی،محرومی اور ساتھیوں سے نفرت ایک طویل عرصے تک بے روز گاری اور غربت کے زیر سایہ وقوع پذیر ہوتی ہے۔نچلے طبقات اپنی خاندانی ضروریات کی تکمیل کے دوران قرض کی راہ اختیار کر کے اپنی نسلوں کو مستقل غلامی میں پسنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔قرض کی یہی جبریت جرائم کو بھی ابھارتی ہے۔ ان حجاموں کی ایک دوسرے کے بارے میں بدگمانی اور آمدن کو مہارت سے چھپانے میں نفسیاتی محرک معاشی ضروریات ہیں۔افسانے میں خوف پریشانی،نفرت،احساس کم تری،جوش انتقام اور عداوت جیسی نفسیاتی پریشانیوں میں لاشعوری فضا کی تعمیر معاشی جبریت کی بدولت ہی شعور کی دنیا میں قدم رکھتی ہے:۔

> استاد دل میں بہت خوش تھا کہ بالآخر اس نے اپنا تفوق اپنے ساتھیوں پر قائم کر لیا ہے۔ادھر اس کے ساتھی کچھ دن پژمردہ رہے مگر پھر مہینے کے بعد ایک معقول رقم ہاتھ آنے کے خیال نے رفتہ رفتہ ان کا غم دور کر دیا اور وہ بڑی بے تابی سے مہینہ ختم ہونے کا انتظار کرنے لگے(۲۷)

معاشرے کے نچلے طبقات اپنی خاندانی روایات کی بدولت اکثریت میں انسانی اوصاف سے مزین ہوتے ہیں۔انسانی ہم دردی اور اندھا اعتماد ان کی وہ کم زوری ہوتی ہے جس سے عیار عناصر استفادہ کرتے ہیں۔منشی دکان میں میلے لباس اور بگڑے حیلے کے ساتھ داخل ہو کر ان حجاموں کے وسائل پر قابو پا لیتا ہے۔منشی کی یہ استحصالی فطرت اس کی ذات میں اعلیٰ طبقات کی عرصے تک ملازمت سے پروان چڑھی ہے۔"میں اپنے وطن میں ایک بنیے کا منشی تھا اس کے ہاں راشن کارڈوں کی پرچیاں لکھا کرتا تھا"(۲۸)منشی اپنی عیاری سے حجاموں کو مقروض بنا کر ان کی دکان پر قابض ہو جاتا ہے۔اس افسانے میں سماج کے نچلے طبقات کی طبقاتی نفسیات میں احساس محرومی،انفرادیت کا رجحان،بدگمانی اور نفرت کے علاوہ خوف کو معاش کی الجھنوں سے ابھرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔افسانہ "دو تماشے" میں سماج کے تنگ دست اور اقتصادی الجھنوں میں الجھے ہوئے کردار جرائم میں مبتلا ہیں۔افسانے میں نچلے طبقے کا ایک چپراسی ادنیٰ درجے کا ایک

ملازم ہے۔وہ ایک بینک میں اپنی ملازمت کے دوران دولت کی چمک اور اعلیٰ زندگی کی تمام آسائشوں کا حقیقت میں مشاہدہ کرتا ہے۔اس کی اپنی زندگی کے معاشی مسائل اس کو اندر سے بے چین کیے رکھتے ہیں۔اسی کش مکش سے وہ ایک مختصر راستے کا انتخاب کرتا ہے۔اپنے مقصد میں ناکامی اس کے پورے خاندان کو مزید گمنامی میں دھکیل دیتی ہے۔

> بینک کے ایک چپراسی کو اس الزام میں کہ اس نے بینک لوٹنے میں چوروں کی مدد کی، پانچ سال قید کی سزا ہو جاتی ہے۔اس چپراسی کی بیوی مر چکی ہے مگر اس کا ایک چار سالہ بیٹا جو اپنی بوڑھی دادی کے پاس رہتا ہے۔چپراسی کے قید ہو جانے پر دادی پوتا بھوکوں مرنے لگتے ہیں۔ادھر کوٹھڑی کا کرایہ نہ ملنے پر مالک مکان انھیں گھر سے نکال دیتا ہے۔بڑھیا پوتے کا ہاتھ پکڑ بازار میں بھیک مانگنے لگتی ہے(۲۹)

غلام عباس معاشرے کے غریب اور زیر دست طبقات کی طبقاتی نفسیات میں معاشرتی جرائم کی موجودگی کو اقتصادی الجھاؤ کی لاشعوری گہرائیوں سے سامنے لاتے ہیں "بردہ فروش" کا موضوع انسانی تاریخ کے ارتقاء سے تعلق رکھتا ہے۔غلام عباس بنیادی طور پر عورت کو ایک بازاری جنس کے طور پر فروخت کرنے کے خلاف ہیں۔وہ انسانی تجارت اور اس کے انسانی تہذیب پر مرتب ہونے والے اثرات سے آگاہ ہیں۔بردہ فروشی کی بدولت انسانی معاشرہ عورت کی سماجی حیثیت کے بارے میں متضاد نظریات کا شکار ہوا جس سے انسانی تہذیب اور رویے بری طرح متاثر ہوئے۔ "صدیوں کی بردہ فروشی کے اثرات معاشرہ انسانی پر نہایت ضرر رساں ہوئے"(۳۰) افسانے میں نچلے طبقات کے اندر سماجی گراوٹ، پست معیار زندگی، ناکافی سہولیات، اقتصادی جبریت، جانوروں کی مانند روکھی اور بدمزا زندگی کی تہوں میں پوشیدہ نفسیاتی شکست وریخت کو بیان کیا گیا ہے۔ریلوے اسٹیشن کے قریب سسکتی زندگی، لاغر کتے اور انسان کی زندگی میں مماثلت، بجھے اور افسردہ چہرے نچلے طبقات کی معاشی وطبقاتی پریشانیوں کا استعارہ ہیں۔ریشماں کو پانچ برس کی عمر میں گاؤں سے اغواء کر کے فروخت کر دیا جاتا ہے۔اس کی باقی ماندہ زندگی اپنی مرضی اور خواہشات کے برعکس دوسروں کے رحم وکرم پر بسر ہوتی ہے۔اس کو مائی جمی عمر رسیدہ دوسری شادی کے خواہش مند بوڑھوں کو فروخت کر کے دولت اور زیورات حاصل کرنے کا ذریعہ بناتی ہے۔ریشماں کی احساس کم تری اس کی ادھوری خواہشات کی تکمیل اور ایک گھریلو زندگی بسر کرنے میں پوشیدہ ہے۔غلام عباس عورتوں کے اندر احساس محرومی، جذباتیت، گریہ زاری، ہیسٹریائی رجحان اور ضمیر کی کمزوری کو جنس ومعاش کی لاشعوری گرفتوں سے منظر عام پر لاتے ہیں۔سماج کے زیر دست طبقات کی یہ الجھنیں ان طبقات کی منفرد نفسیات بن جاتی ہے جو اس طبقے کے لیے خاص ہو کر رہ جاتی ہے۔وہ معاشرے کے بے بس طبقات کی

خواہشات کو روٹی کی فراہمی اور قدرے چین کی سانسوں میں دبا ہوا دکھاتے ہیں۔ بنیادی ضروریات کے حصول میں محدود کم یابی اس طبقے کی جنسی خواہشات کو دبا لیتی ہے۔ "نہیں نہیں مجھے کسی مرد کی ضرورت نہیں۔ مجھے یہ بڈھا بھی نہیں چاہیے، میں فقط آرام سے زندگی گزارنا چاہتی ہوں" (۳۱) زندگی کی تھکاوٹ، جبریت اور سہولیات کی عدم دستیابی نچلے طبقات کے اندر زندگی کی خواہشات، آرزؤں اور جذبات کی سرد مہری کا ذریعہ بنتی ہیں۔ ریشماں کی اندر ایک عورت زندہ ہوتی ہے جو ہر لمحہ گرمستی کی رنگین فضاؤں کی متلاشی رہتی ہے۔ چوہدری گلاب اور کرم دین اعلیٰ طبقات کی طبقاتی نفسیات کا اظہار ہیں جہاں عورت کا جسم حصول لذت کی حد سے زیادہ اہمیت کے قابل نہیں ہوتا۔ اس بستی کے مکین دولت کے بل پر عورت کو ایک بازاری شے سے زیادہ اہمیت دینے کے قائل نہیں ہوتے۔ ریشماں کی خریداری میں وہ کسی بھی حد تک جانے اور دولت سے انسانوں کی خرید و فروخت کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ ان کو ریشماں کے جذبات کی کوئی قدر نہیں وہ اپنی رقم واپس ملنے پر ریشماں کو مائی جمی کے حوالے کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ "دونوں شخص کچھ دیر سوچتے رہے، اس کے بعد کرم دین نے کہا "اگر میرے چار سو روپے مجھے مل جائیں تو پھر وہ چاہے بھاڑ میں جائے میری بلا سے" (۳۲) "تنکے کا سہارا" کے نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والے کردار بھی جنس و معاش کی ملی جلی نفسیاتی چکی میں پس رہے ہیں۔ بیوہ سیدانی اقتصادی پریشانیوں سے چھٹکارے کے لیے اہل محلّہ کی ہر پسند و ناپسند کو قبول کرتی ہیں۔ ان کے اندر کی مایوسی، زندگی کا اکیلا پن، بدگمانی اور لاچارگی کی نفسیاتی ہلچل میں اپنی خواہشات کے برعکس زندگی بسر کرنے کی جبریت اپنا اثر دکھا رہی ہوتی ہے۔ یہ نفسیاتی کش مکش بیوہ سیدانی کو اندر سے کم زور اور لاچار بنا دیتا ہے۔ اس سے فرار وہ امام مسجد سے عقد ثانی کی صورت میں پیدا کرتی ہے۔ امام صاحب کی طرف سے دوسرے نکاح کی قبولیت میں ان کی ناآسودگی، مستقل ٹھکانے کی جستجو اور خواہشات کے غلبے کی لاشعوری الجھن پوشیدہ ہے۔ "غازی مرد" میں آندھی چراغ بی بی اور گاؤں کا ایک کسان علیا ایک چھت تلے ناآسودہ شب و روز بسر کر رہے ہیں۔ چراغ بی بی کا جسمانی نقص علیا کو گھر میں بے سکون کیے ہوئے ہے۔ سماج کے نچلے طبقات دن بھر کی مشقت اور تھکن سے گھر کی آسودہ فضاء میں راحت تلاش کرتے ہیں۔ اس جنت میں وہ ایک مکمل صحت مند بیوی اور بچوں کی قلقاریوں کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ زندگی کا یہ سکون ان کو نئے دن کے آغاز کے لیے تیار کرتا ہے۔ علیا دن بھر اپنے کھیتوں میں پوری جان لگا کر زمین کو سونا بناتا ہے لیکن واپسی پر اس کا گھر سکون اور آرام کی مطلوبہ فضاء مہیا کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ اس کی اس ناآسودگی میں نچلے طبقات کی طبقاتی نفسیات کا ایک اہم عنصر پوشیدہ ہے۔ یہ ایک انسانی ہم دردی کا شدید احساس ہوتا جو مشترکہ دکھ درد کی وجہ سے زیادہ شدت کا حامل ہوتا ہے۔ اس احساس میں بتدریج کمی رونما ہوتی ہے جو مستقبل میں اداسی اور بے چینی بن کر الجھائے رکھتی ہے۔ مثلاً

دیکھیے :۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔آخر ایک نو جوان کی غیرت جوش میں آئی۔وہ تھا تو غریب
زمیندار کا بیٹا مگر اپنے منچلے پن کی وجہ سے ہر کام میں سب نو جوانوں سے آگے رہتا،
اس نے آگے بڑھ کر اس کار خیر کے لیے خود کو پیش کر دیا(۳۳)

سماج کے کم زور اور بے بس طبقات کی زندگی شروع ہی سے ایک ادھورے خواب کی طرح ہوتی ہے جہاں غربت، بے بسی، لاچارگی اور بے سکونی کا راج ہوتا ہے۔زندگی بس انسانی رشتوں، ہم دردیوں اور طفل تسلیوں کے بل بوتے پر اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔بھوک، بیماری، قدرتی آفات کی تباہ کاریوں اور دیگر مصائب میں افراد بس انسانی ہم دردیوں اور امیدوں کے دم سے زندہ ہوتے ہیں۔اسی طبقاتی صورت حال کی بدولت ان طبقات کی طبقاتی نفسیات میں دوسروں کے احساس اور مدد کا جذبہ زیادہ قوی ہوتا ہے، کسان علیا اسی لاشعوری جبریت کا شکار ہوا اور اندھی چراغ بی بی کو اپنا ہم سفر بنا کر سماجی عزت تو پا گیا لیکن نفسیاتی مسائل کی دلدل میں گرتا گیا۔علیا ایک طرف اپنی بیوی کو ایک مقدس اور قابل رحم ہستی تصور کرتا تو دوسری طرف جسمانی سکون اور تعلقات کا بھی شدت سے خواہش مند تھا۔میاں بیوی کے جسمانی روابط پر ایک حجاب کی کیفیت ہے۔وہ دونوں اپنے اپنے اخلاقی دباؤ کے تحت حالات سے سمجھوتہ کیے ہوئے ہیں۔علیا کی اپنے گھر میں خاموشی اس کے اندر کی خاموشی ہے۔ایک دن اپنے کھیتوں میں کام کے دوران وہ دوسرے گاؤں کے نمبردار کی حسین و جمیل بیوی کو دیکھ کر ایسا بے چین ہوتا ہے کہ اپنی بیوی سے ایک نفرت اور بیگانگی کا برتاؤ کرتا ہے۔نچلے طبقات کے اکثر نفسیاتی مسائل روایات و اقدار کی اندھی تقلید اور بالغ نظری کے فقدان سے لاشعور کی تہوں سے شعور کی طرف آتے ہیں۔

"حمام میں" کا موضوع جنس و معاش کی پیدا کردہ نفسیاتی پیچیدگیوں کے گرد گھومتا ہے۔معاش کے حوالے سے طبقاتی سماج کا نچلا طبقہ مایوسی، بے یقینی، سمجھوتہ بازی اور دولت کی طاقت سے مغلوب نظر آتا ہے۔پوری منڈلی اپنی معاشی ضروریات کی تکمیل کی خاطر فرح بھابی کے گرد نہ صرف جمع ہے بل کہ اپنی خواہشات کے برعکس ہر عمل برداشت بھی کرتی ہے۔حالات کا جبر دانش وروں کی ٹولی اور فرح بھابی کے مابین کسی مضبوط تعلق کو پروان چڑھنے کا مواقع مہیا نہیں کرتا۔

فرح بھابی اپنی مشین چوری ہونے سے جن معاشی مسائل کا شکار ہوئی اسے پہلی مرتبہ اپنے رفقاء کا کردار خیالی اور فرضی منصوبوں سے تعمیر شدہ ریت کا محل لگا جس کی بنیادیں انتہائی کم زور ہیں۔سماج کی نچلے طبقات کی عورتوں

میں طبقاتی نفسیات کے حوالے سے خواہش تحفظ اور آشیانہ سازی ان کو طاقت ور مردوں کے قرب کی طرف راغب کرتی ہیں۔ان عورتوں کا بچپن اور نو جوانی کا زیادہ وقت اپنے خاندانی نگہبانوں کے کم زور سہاروں میں بسر ہوا ہوتا ہے۔یہی عدم تحفظ کا ڈر ایک خوف اور احساس کم تری کی صورت میں ان کے ساتھ سائے کی طرح سفر کرتا ہے۔فرخ اپنے کم زور ساتھیوں سے فرار کی راہ میر صاحب سے تعلقات کی صورت میں نکالتی ہے۔اس کا یہ قدم معاشی و جنسی امتزاج کی جبریت سے وقوع پذیر ہوتا ہے۔"اس کے عورت بنے کا تقاضا ہے جو ایک مکمل مرد کے قرب میں تحفظ کا احساس چاہتا ہے" (۳۴) غلام عباس سماج کے نچلے طبقات میں فرار، اکتاہٹ، بے بسی، لاچارگی، خوف، احساس ندامت، زندگی کی ناقدری، روکھے پن، بے یقینی، مایوسی، سسکتی زندگی کے پھیکے پن،، نا آسودگی، لذت کوشی، ذاتی مفادات کی قبولیت، احساسات انسانیت، خواہش تحفظ، آشیانہ سازی اور سمجھوتہ بازی کی طبقاتی نفسیات میں جنس و معاش اور قانون و ماحول کی خارجی جبریت کو خاص اہمیت دیتے ہیں۔انسانی نفسیات کے یہ طاقت ور محرکات داخلی اور خارجی راستوں سے نچلے طبقات کی مخصوص طبقاتی نفسیات متعین کرتے ہیں۔

طوائفوں کی طبقاتی نفسیات

غلام عباس کے افسانوں کی طوائف بھی سماج کے بے بس اور کم زور طبقے کی نمائندہ ہے۔اس کا دھندہ اور زندگی کے دیگر مشاغل بیرونی جبریت کی قبولیت کا آئینہ دار ہیں۔اس کا کاروبار مردانہ سماج کی جنسی ہوس اور معاشی ضروریات کے گرد سفر کرتا ہے۔یہ معاشرے کا وہ مجبور اور پستا ہوا طبقہ ہے جو زندگی کے ہر قدم پر متنوع جبریت کے سامنے سمجھوتہ بازی کی قبولیت کا عکاس ہے۔غلام عباس نے اس طبقے کا قریب سے مشاہدہ کیا چوں کہ ان کا بچپن اسی ماحول میں گزرا۔ "غلام عباس کا بچپن پرانے لاہور کے بھاٹی دروازے کے اندر گزرا تھا اس لیے غلام عباس نے اس طرح کے ماحول کا مشاہدہ کیا ہو" (۳۵) ڈاکٹر علمدار حسین بخاری نے ان کی والدہ نذیر بیگم کا تعلق بھی سماج کے اس طبقے سے بیان کیا ہے جو سکون اور مسرت کا ذریعہ تو تھا مگر قابل عزت تصور نہیں ہوتا تھا۔ان کے نزدیک غلام عباس کا کوئی قریبی رشتہ دار اس لیے موجود نہ تھا، کیوں کہ ان کی ماں اس بازار کی رونق تھی جو مروجہ شریفانہ زندگی سے کوسوں دور تھا۔"غلام عباس کی والدہ نذیر بیگم کا تعلق معاشرے کے اس طبقے سے تھا جو وسیلہ نشاط و مسرت تو ہے لیکن اتنا ہی مردود و مطعون گردانا جاتا ہے" (۳۶) غلام عباس طوائف کے آئینے میں ہندوستان کی شکست خوردہ عورت اور ان کے وجود کی بے چارگی کا ذکر کرتے نظر آتے ہیں۔اردو ادب میں طوائف کا موضوع نیا نہیں ہے۔ہماری داستانوں اور ناولوں میں یہ کردار کبھی پس منظر اور کبھی پیش منظر میں رہا ہے۔اس کا

موضوع ہندوستانی معاشرے میں عورت کی حیثیت ہے کیوں کہ مردانہ سماج میں عورت کو زیب و زینت کی شے تو بنا دیا گیا لیکن اسے عورت نہیں سمجھا گیا۔ غلام عباس کی طوائف اقتصادی بدحالی کی بدولت داخلی کش مکش کا شکار ہے۔ اس کے اندر ایک عورت کے احساسات و جذبات اور گرہستی کے دامن میں عمر بسر کرنے کی الجھن ایک بے بسی کے ساتھ ساتھ احساس کم تری کی راہ ہموار کرتی ہے۔ طوائف کا داخلی ارتقاء عورت کے اندر بیدار ہو کر سماجی ذمہ داری کی طرف سفر کرتا ہے۔ طبقہ طوائف ان کے ہاں بیشتر سماجی قدروں سے انحراف کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اسے اس بات کا شدید احساس ہوتا ہے کہ مردانہ سماج کے اکثر قدریں مرد نے عورت پر اپنا تسلط قائم رکھنے کے لیے وضع کی ہیں۔ غلام عباس کی طوائف کے اندر اپنی شخصیت کو مسخ کرنے اور ظلم کے خلاف احتجاج کرنے کا جذبہ تو پیدا ہوتا ہے مگر لہجے کی بلندی، طنز و استہزاء اور تلخ نوائی کے جذبات میں شدت کا فقدان نظر آتا ہے۔ ان کا یہ طبقہ بھی کم زور اور نچلے طبقات کی مانند سمجھوتہ بازی کا دامن تھام لیتا ہے۔ غلام عباس جنس اور طوائف کے نفسیاتی بیان میں ایک حجاب قائم رکھتے ہیں۔ وہ صورت حال کو رنگین اور جاذب نظر پردوں کی رداميں اعتدال کی خاطر لپیٹنے کی شعوری سعی کرتے ہیں۔

ان کا شہرہ آفاق افسانہ " آنندی "طوائفوں کی سماجی حیثیت، ان کی داخلی کش مکش اور معاشرے میں جائز مقام کے حصول کی تگ و دو کو منفرد انداز سے پیش کرتا ہے۔ سماج کے نچلے طبقات میں پیٹ کی مجبوری کی خاطر جسم فروشی کو ابھرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ طوائف کا طبقہ داخلی انتشار کا شکار ہے۔ وہ جسم و جان کا رشتہ قائم رکھنے کی خاطر اس دھندے سے وابستہ ہے۔ مردانہ سماج اس کو اپنی تسکین کی خاطر زندہ بھی رکھتا ہے مگر اسے اپنے گھر میں ایک بیوی کے طور پر قبول کرنے سے گھبراتا بھی ہے۔ غلام عباس افسانے کے ایک کردار کی وساطت سے طوائف کے بارے میں سماجی رویے کو سامنے لاتے ہیں۔ سماج کے یہی متضاد رویے اس طبقے کا المیہ ہے جیسے:۔

> اس کا ان کی طرف سے یہ جواب دیا جاتا ہے کہ آسودہ اور عزت دار لوگ خاندانی حرمت و ناموس کے خیال سے انھیں اپنے گھروں میں گھسنے نہ دیں گے اور مفلس اور ادنی طبقے کے لوگوں کو جو محض ان کی دولت کے لیے ان سے شادی کرنے پر آمادہ ہوں گے، یہ عورتیں خود منہ نہ لگائیں گی (۳۷)

افسانے میں ممبران کی عمریں نوجوانی کی حد سے تجاوز کر چکی ہیں جن کی باتوں سے لذتیت کا احساس ہوتا ہے۔ نفسیاتی اور جنسی اعتبار سے ممبران کی اکثریت ایک احساس کم تری میں مبتلا ہے جو ان کو طوائفوں کے خلاف اکساتی ہے۔ اس محلے کے مشاغل اور نوجوانوں کی مستیاں ان کے اندر کی کم زوری اور احساس ندامت کو اندرونی توڑ پھوڑ کا موجب

بناتی ہیں۔اس افسانے کا اقتصادی پہلو امیر طبقات میں دولت کی قوت سے عورتوں کا استحصال دکھاتا ہے۔نئی بستی کی آباد کاری اور مکانوں کی تزین و آرائش دولت مندوں میں عیاشی کے رجحان کو سامنے لاتی ہے۔طبقہ طوائف انھی کے دم خم سے آباد ہے ورنہ دولت کی کمی سے سماج کے نچلے طبقات خود کو لذت کوشی تک محدود رکھتے ہیں۔"بھنور" میں عورت کو طوائف کے دلدل میں دھکیلنے والے عوامل کو بے نقاب کیا گیا ہے۔طبقاتی سماج میں والدین کی معاشی مجبوریاں اور ضروریات زیست اس دھندے کے طاقت ور محرکات ہیں۔مردانہ سماج کی ہوس ہر ممکن حربے سے عورتوں کو اپنی خواہشات کے تابع کرنے میں جٹی رہتی ہے۔"میری بچیو۔ذرا غور کرو۔تمھاری زندگی کیسی ہنگاموں سے بھری ہے دن رات تمھارے چاہنے والوں کی دھینگا مشتی۔قدم قدم پر جان کا خوف،ہر وقت پولیس کا دھڑکا وعدالت میں پیشیاں۔یہ جینا بھی کوئی جینا ہے میری بیٹیو"(۳۸)اس طرح کی جبریت سے بھری زندگی نفسیاتی خوف اور مستقل الجھن بن کر ایک ویرانی کی فضاء تعمیر کرتی ہے۔اسی کش مکش کی بدولت طوائف کی زندگی میں ہر لمحہ ایک عورت کے جذبات کا خون ہوتا ہے جس پر مردانہ ہوس کی عمارت بلند ہوتی ہے۔طبقاتی نفسیات کے حوالے سے طبقہ طوائف اقتصادی الجھن،سماجی گراوٹ، جائز مقام کے حصول کی طلب اور عفت وحیا کے نفسیاتی دباؤ سے احساس کم تری،اکتاہٹ،گریز اور فرار میں مبتلا رہتا ہے۔"اس کی بیوی" میں نسرین کی زندگی بے چارگی اور تاسف کی صورت حال سے دوچار ہے۔تیسری منزل کے ایک چھوٹے سے کمرے کی ہلکی نیلی روشنی کی طلسماتی فضاء میں ایک نوجوان کا شفقت بھرا سلوک اس کے اندر کی عورت کو بیدار کر دیتا ہے۔غلام عباس اس بات کو بیان کرتے ہیں کہ طوائف کے اندر عورت زندہ ہوتی ہے جس کے جذبات واحساسات عام عورت جیسے ہی ہوتے ہیں۔نسرین نوجوان کی مرحوم بیوی کی مسلسل مداح سرائی سے اکتا جاتی ہے اور اس کے اندر رقابت کی نفسیاتی الجھن ابھر آتی ہے۔وہ باتوں باتوں میں موضوع بدلنا چاہتی ہے:۔

> یہ نفسیاتی کمزوری خواتین میں اکثر نظر آتی ہے۔خواتین کے حاسدانہ یا رقیبانہ چشمک کی ایک نمایاں خصوصیات یہ ہے کہ ان کا تعلق ظواہر یعنی وضع قطع،لباس،نمود نمائش حسن جسمانی اور دولت وغیرہ سے زیادہ ہے اور باطنی اوصاف سے کم ہے اور دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کا نشانہ زیادہ تر اس کی اپنی جنس کے افراد بنتے ہیں(۳۹)

ایک طوائف کی زندگی بسر کرنے والی نسرین کے اندر عورت کے وہی جذبات ہیں جو ایک عام عورت کے ہوتے ہیں۔کوٹھے کی جبری زندگی صرف ایک جبریت کی بدولت لاشعوری شکست وریخت میں الجھی رہتی ہے۔غلام عباس عورت کے اندر ممتا کے جذبے کی قوت اور اس سے استحصالی راستوں کی نکاسی کے قائل ہیں۔ان کے مطابق عورت کے

اندر یہی وہ قابل قدر جذبہ ہوتا ہے جس کی بدولت عورت میں محبت، رحم، ہم دردی اور انسیت کے جذبات کی فروانی ہوتی ہے۔ مرد انھی جذبات کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔ یہ نفسیاتی کمزوریاں عورت کو اندر سے نرم اور کم زور کیے ہوتی ہیں۔ خواتین کی نگاہ التفات زیادہ تر محروم مردوں پر فوراً پڑتی ہے کیوں کہ اس مظلومیت کے تصور سے ان میں اپنی مظلومیت کا احساس جاگ اٹھتا ہے۔

"ناک کاٹنے والے" کی کہانی میں طوائف کے بارے میں سماجی رویے، نچلے طبقات کی بے بسی اور مایوسی کو بیان کیا گیا ہے۔ بنیادی طور پر ننھی جان سماج کے اعلیٰ طبقات کی خواہش کے سامنے بے بس نچلے طبقات کی علامت ہے۔ ایک طرف وہ اپنے پرانے خدمت گاروں کی خواہشات کے سامنے ریت کی دیوار کی مانند ٹوٹتی ہے تو دوسری طرف تین پٹھان نچلے طبقات کی وہ عناصر بن کر سامنے آتے ہیں جو طاقت وروں کے آلہ کار بن کر اپنے ہی طبقے کا استحصال کرتے ہیں۔ غلام عباس طوائف کے لیے رنڈی کا لفظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ طوائف کے لیے یہ لفظ عورت کی انتہائی مظلومیت اور بے بسی کا سماجی اظہار ہے۔ ڈاکٹر روش ندیم عورت کے لیے اس لفظ کو املاک کے تصور اور زیورات کے لالچ سے وابستہ بتاتے ہیں۔ "ستی کے رواج کے لیے بیوہ کے زیورات کا لالچ ہی کافی تھا لیکن بیوہ کے لیے دیوداسی بننے کا دروازہ بھی کھلا تھا۔ اسی لیے رنڈی کا لفظ بیوہ اور طوائف دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے" (۴۰) اس افسانے میں غلام عباس نے طوائف کے ڈیرے کو آداب سکھانے کا مرکز بھی ظاہر کرنے کی قدیم رسم کا ذکر کیا ہے۔ طوائف کا ڈیرا مجلسی زندگی کے آداب کا نہ صرف مرکز تھا بل کہ وہ لکھنوء کی تہذیب میں شائستگی کی علامت تھی۔ جیسے کہ غلام عباس کے ایک افسانے سے اس کی مثال دی جاسکتی ہے جس میں ایک ایک کردار بہت مہذب انداز میں یوں انکار کرتا ہے:۔

> اس وقت خان صاحب وزیر خان کے ہاں سے کچھ بہویں آئی ہوئی ہیں، ان کی وجہ سے دروازہ نہیں کھل سکتا۔ آپ کو زحمت تو ہو گی مگر مجبوری ہے۔ آپ کل تشریف لائیے گا (۴۱)

اردو میں طوائف کے موضوع پر متعدد ادب تخلیق ہوا ہے جس میں عورت کی مظلومیت اور سماجی حیثیت کو سامنے لایا گیا ہے۔ غلام عباس کی خوبی اس امر میں پوشیدہ ہے کہ انھوں نے طوائف کی نفسیاتی شکست وریخت کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ "ناک کاٹنے والے" کی طوائف کا نام ننھی جان ہے۔ اسی نام کو قاری سرفراز حسین عزمی نے اپنے ناول "شاہد رعنا" میں بھی استعمال کیا ہے۔ بنیادی طور پر یہ ناول دہلی کی ایک طوائف کی سرگزشت ہے جس کا دل ایک عورت کا ہے اور وہ سماج میں ایک شریفانہ زندگی کی خواہش مند ہے۔ اسی طرح کی سماجی جبریت میں الجھاؤ کا شکار غلام عباس کی ننھی

جان بھی ہے۔وہ سکون اور اپنی خواہشات کے زیر سایہ جینے کی آرزو مند ہے۔سماج کا بالا دست اور طاقت ور طبقہ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے اسے متنوع جبریت سے اپنے طرف راغب کرنے کا خواہش مند ہے۔افسانے میں چشتی صاحب کی زبردستی، چکر والے حاجی صاحب کی خواہش نکاح،نواب صاحب کی بدمعاشی اور ظفر صاحب کی آمد پر چڑنا، فیض آباد کے کنگلے تعلقدار کی طرف سے ننھی جان کو بے عزت کرنا،راؤ صاحب کی بنارس لے جانے کی ضد وہ طبقاتی عوامل ہیں جو ننھی جان اور اس کی پوری منڈلی پر ایک لاشعوری خوف مسلط کرتے ہیں۔اپنی خاص طبقاتی نفسیات کے زیر سایہ اعلیٰ طبقے کے یہ نمائندہ کردار اپنی قوت اور دولت کے ساتھ ساتھ تعلق داری کو استعمال کر کے کم زور طبقات میں احساس کم تری،خوف اور ڈر کی فضا پیدا کر کے اپنے مقاصد کی تکمیل کو آسان بناتے ہیں۔" سمجھوتہ "میں غلام عباس طوائفیت سے گرہستی کی طرف معاشی جبریت اور جسمانی تقاضوں کی طاقت کے زیر اثر پیدا ہونے والے نفسیاتی اثرات کو سامنے لاتے ہیں۔جنس و معاش کی کشش نوجوان اور اس کی بیوی کو ایک دوسرے کے قریب لاتی ہے۔میاں بیوی کا قرب اور خاوند کی کم زور ہوتی سرمایے کی دیوار طوائف کی درمیانی رکاوٹ کو ہٹا کر باہمی انسیت اور تعلقات کو پھر پرانی نہج پر لاتی ہے۔

غلام عباس کی طوائف کہیں بھی جنس یا ہوس کی خاطر اپنے پیشے کو اختیار نہیں کرتی بل کہ والدین کی مرضی، بردہ فروشی کی طاقت،مردانہ سماج کی قوت،استحصالی سوچ کی جبریت اور دوسروں کے لیے جینے کی مجبوری اس کو اس سمت لے جاتی ہے۔اس کے اندر کی عورت خواہش تحفظ اور گھریلو زندگی کی تلاش میں رہتی ہے۔اس کے اندر ممتا،آشیانہ سازی، رقابت،خوشامد پسندی اور توجہ طلبی کی خواہشات بدرجہ اتم موجود ہوتی ہیں۔سماج کا نفرت بھرا رویہ،دولت اور طاقت کی جبریت،اقتصادی مجبوریاں،خارجی حاکمیت اور اپنی خواہشات کی کم زور ہوتی دیواریں طوائف کے اندر خوف،احساس کم تری،ہسٹریائی رجحان،بدگمانی،احساس محرومی،جذباتیت اور گریہ زاری جیسی نفسیاتی الجھنیں شعور کی سطح تک لاتی ہیں اور یہی اس طبقے کی طبقاتی نفسیات کا خاصا ہیں۔

مفاہمتیں اور سمجھوتہ بازی

غلام عباس کے فن افسانہ نگاری میں متوسط طبقے کی مانند نچلا طبقہ بھی معاشرے میں خارجی جبریت کی طاقت کے سامنے بے بس ہو کر زندگی کی حقیقتوں سے مفاہمت اور سمجھوتے کی راہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔نچلا طبقہ اپنی احساس محرومی اور سماجی ناقدری سے پوری طرح آشنا ہوتا ہے۔اس کے سامنے سماج اور زندگی دونوں طاقت ور ہوتے ہیں جہاں اسے

اپنی محرومی کو قبول کر کے جینے کی راہ تلاش کرنا پڑتی ہے۔ان طبقات میں بغاوت کا اظہار نفرت کی صورت میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ یہ کردار احساس محرومی اور سماجی عدم مساوات کے علاوہ دولت کی غیر مساوی تقسیم پر دل میں ضرور کڑتے ہیں مگر ایک اعتدال کی راہ اپنا لیتے ہیں۔ "چکر" کے چیلا رام کی زندگی کا سیٹھ چھنامل سے سمجھوتہ، "اوورکوٹ" کے نوجوان کی ناآسودہ جسمانی و جذباتی زندگی، خواہشات کی عدم تکملیت اور ناآسودگی کے باوجود جینا، "غازی مرد" کے علیا کی جفاکشی اور خون پسینہ ایک کرنا، غربت کے بڑھتے سائے اور چراغ بی بی سے جسمانی تعلقات کی ادھوری خواہشات کے دامن میں جینے کا حوصلہ، "جواری" کے نکو کا تھانے میں گرتی ساکھ اور ہتک کو قہقہوں میں بدلنا، "تنکے کا سہارا" کی بیوہ سیدانی کا خاندانی کفالت کے باوجود امام صاحب سے نکاح کا سمجھوتہ، "سایہ" کے سبحان کا وکیل صاحب سے خاندانی رشتہ نہ ہونے کے باوجود قلبی لگاؤ کی راہ پیدا کرنا، "اوتار" میں حمزا کے خاندان پر ہندوؤں کے مظالم سے مفاہمتی رویہ اور ظلم سہنے کی روش پر قائم رہ کر زندگی کا سامان پیدا کرنا دراصل نسل در نسل محنت کے باوجود طبقاتی سماج میں اپنی حالت بدلنے کی ناکام کارگزاریوں کے نفسیاتی اثرات ہیں۔ یہ اثرات طبقات کی ازلی ناکامی بن کر مفاہمت کا راستہ متعین کرتے ہیں۔ طبقہ طوائف کے اندر حالات اور زندگی سے سمجھوتے بازی عورت کی کم زوری سے ابھرتے ہیں۔ "آنندی" کی طوائفوں کا حسن آباد کا سفر، ایک شہر کے اجڑنے پر نئے شہر کی آبادکاری کی مفاہمت، "بھنور" کی دونوں بہنوں کا اپنے بدنام ماضی سے مستقبل کی تاب ناکی کی خواہش اور حالات سے سمجھوتہ، "اس کی بیوی" کی طوائف کا سب کچھ جاننے اور آگہی کے باوجود اپنی آسودگی کی نوجوان میں تلاش اور حالات کے سامنے بے بسی، ننھی جان کا دوسروں کی مرضی پر اپنی خواہشات کو قربان کرنا، دوسرے شہر منتقل ہونے میں حجاب کا حائل ہونا اور "بردہ فروش" کی ریشماں کا خود کو ہرا گلے سودے کے لیے تیار کرنا وہ طبقاتی و نفسیاتی کم زوریاں ہیں جو طبقاتی سماج کی بدولت پروان چڑھ کر بے بس اور لاچار طبقات کی طبقاتی نفسیات کو متعین کرتی ہیں۔

سماج کا اعلیٰ طبقہ غلام عباس کی افسانوی دنیا میں کسی طبقاتی دباؤ کے برعکس اپنی برتری قائم کرنے اور خواہشات کی تکمیل کے لیے سمجھوتہ بازی کرتا ہے۔ اس میں وہ اپنی انا کی تشکیل کرتا ہے۔ کسی طرح کی معاشی و معاشرتی قوت اس کے سمجھوتے کی تہہ میں شامل نہیں ہوتی۔ نواب صاحب کا چور سے، بیگم تراب علی کا مہترانی سے، بادشاہ کا ملکہ سے اور مسٹر شاہ کا متوسط طبقات کے ساتھ سمجھوتہ اپنی احساس برتری کو قائم رکھنے کی کوشش ہے۔ اس کی لاشعوری تہوں میں بھی ایک احساس کم تری کو احساس برتری میں بدلنے کی نفسیاتی الجھن اپنا اثر ظاہر کر رہی ہوتی ہے۔ غلام عباس کے ہاں سمجھوتے بازی اور مفاہمتیں طبقاتی و نفسیاتی نشیبوں سے فراز کا سفر اختیار کرتی ہیں۔ فرد کا سماج اور زندگی سے سمجھوتہ نفسیاتی الجھنوں

اور طبقاتی معاشرے سے مشروط محسوس ہوتا ہے۔

غلام عباس کے کرداروں کی طبقاتی نفسیات میں غلام عباس شناسی کے لیے جن کتب سے استفادہ کیا گیا ان میں "غلام عباس سوانح وفن کا تحقیقی جائزہ"، سویا مانے یاسر، "غلام عباس تحقیقی و تنقیدی مطالعہ"، ڈاکٹر اورنگ زیب عالم گیر، "غلام عباس کے ۱۰ بہترین افسانے"، مرتب، شہزاد منظر، "غلام عباس کے بے مثال افسانے"، ترتیب وانتخاب طاہر منصور فاروقی، "اردو افسانے کی روایت میں غلام عباس کا مقام"، ڈاکٹر علمدار حسین بخاری اور "غلام عباس فکر وفن" مرتب ایم۔ خالد فیاض قابل ذکر ہیں۔ ان میں غلام عباس شناسی کے ضمن میں ایک قاری مغالطے کا شکار ہو جاتا ہے۔ سویا مانے یاسر نے غلام عباس کے سوانح سے متعلق مرزا ظفر الحسن، صہبا لکھنوی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، سعید مرتضی زیدی، افضال احمد، ڈاکٹر انوار احمد اور شہزاد منظر کے مضامین کے تقابلی مطالعے سے اغلاط اور مماثلت واثرات کا کمال مہارت سے موازنہ کیا ہے۔ اس میں قابل غور بات غلام عباس کے چوتھے افسانوی مجموعے کی وضاحت ہے۔ اکثر محقق اور مضمون نگار غلام عباس کے چوتھے افسانوی مجموعے "رینگنے والے" (مطبوعہ ۱۹۸۰ء، ۱۹۸۱ء) کا ذکر کرتے ہیں مگر اس میں کون سے افسانے شامل ہیں اور کہاں سے شائع ہوا؟ اس بارے میں سکوت کی کیفیت ہے۔ اس کا جواب سویا مانے یاسر نے مہیا کیا کہ اس نام کا کوئی افسانہ شائع ہی نہیں ہوا۔ "شہزاد منظر نے لکھا ہے کہ ان کا آخری مجموعہ ۱۹۸۱ء میں "رینگنے والے" کے عنوان سے چھپا۔ غلام عباس نے اپنے انٹرویو میں اسی عنوان سے مجموعہ چھپوانے کے ارادے کا اظہار تو کیا تھا مگر ایسا نہیں ہو سکا تھا" (۴۲) سویا مانے یاسر کی تحقیقی کاوش کے بعد ۲۰۰۵ء میں غلام عباس شناسی میں ایک نیا اضافہ ڈاکٹر اورنگ زیب عالم گیر کی کتاب، غلام عباس تحقیقی و تنقیدی مطالعہ (سنگت پبلشرز) ہے۔ اس میں غلام عباس کے افسانوں، "آنندی"، "اوورکوٹ"، "کتبہ"، "سایہ" اور "اس کی بیوی" کا تنقیدی مطالعہ پیش کیا گیا۔ کوائف نامہ کے عنوان سے غلام عباس شناسی پر روشنی ڈالی گئی۔

غلام عباس کے والد کا نام عبدالکریم تحریر کیا گیا جس کی حواشی میں کہیں وضاحت سامنے نہیں آتی۔ اس کے علاوہ دیگر ساری کتب میں ان کے والد کا نام میاں عبدالعزیز سامنے آتا ہے۔ ڈاکٹر علمدار حسین بخاری اور سویا مانے یاسر نے ان کے والد کا نام میاں عبدالعزیز ہی تحریر کیا ہے۔ ان کی پیدائش میں بھی اختلاف موجود ہے۔ سویا مانے یاسر ےنومبر تحریر کرتے ہیں۔ جس کی کوئی وضاحت سامنے نہیں آتی۔ جب کہ ڈاکٹر علمدار بخاری، ڈاکٹر اورنگ زیب عالم گیر، مرزا ظفر الحسن، صہبا لکھنوی، فرمان فتح پوری، سعید مرتضی زیدی اور افضال احمد ۱۷ نومبر ہی تحریر کرتے ہیں۔ یوں ۷ نومبر کے بجائے ۱۷ نومبر ہی درست معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر علمدار بخاری نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں ان کی پیدائش کا

مقام لدھیانہ لکھا ہے۔ سویامانے یاسر اور ڈاکٹر اورنگ زیب عالم گیر سمیت دیگر غلام عباس شناس امرت سر کو مقام پیدائش بتاتے ہیں۔ اس کی وضاحت بھی سویامانے یاسر نے کی کہ ان کا پہلا ترجمہ جب ہزار داستان میں شائع ہوا تو اس میں ان کا نام "غلام عباس لدھیانوی" تحریر تھا۔ "لدھیانوی لکھنے کی یہ وجہ ہوسکتی ہے کی ان کے والد کا وطن لدھیانہ ہوگا"(۴۳) اس طرح ان کی جائے پیدائش امرت سر ہی بنتی ہے۔ ان کی شادیوں کی تعداد پر بھی ایک اختلاف موجود ہے۔ ڈاکٹر علمدار حسین بخاری ان کی پہلی بیوی کا نام زاہدہ بتاتے ہیں جس کی شادی ۱۹۲۸ء یا ۱۹۲۹ء میں ہوئی۔ جب کہ سویامانے یاسر نے زینب عباس کے حوالے سے اسی کشمیری لڑکی کا نام غزالہ بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ جگہ کے معمولی اختلاف کے ساتھ ان کی دو بیویوں ذاکرہ اور زینب عباس پر سبھی متفق ہیں۔ ان کی اولاد کی تعداد دو بیٹے اور سات بیٹیاں بھی سب کے ہاں پائی جاتی ہے۔

ڈاکٹر اورنگ زیب عالم گیر نے بھی غلام عباس کی چوتھے افسانوی مجموعے "رینگنے والے" کا ذکر کیا جب کہ ان سے پہلے سویامانے یاسر اس کی وضاحت سامنے لا چکے تھے۔ انھوں نے کن رس کا سن اشاعت ۱۹۷۴ء تحریر کیا جب کی اس کا سن اشاعت ۱۹۶۹ء ہے۔ "۱۹۶۹ء میں تیسرا افسانوی مجموعہ " کن رس "شائع ہونے تک کوئی افسانہ نظر نہیں آتا"(۴۴) اس کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں چاند تارے کا سن اشاعت موجود نہیں جب کہ اس کا سن اشاعت ۱۹۶۵ء سویامانے یاسر نے درج کیا ہوا ہے۔ " کن رس" میں افسانہ "اوتار" کے بجائے "راگ دربار" کا نام شامل کیا گیا ہے۔ سویامانے یاسر کی تصنیف مذکور میں بھی کئی مقامات پر چوک معلوم ہوتی ہے۔ صفحہ نمبر ۲۱۲ پر افسانہ "چکر" کے ذکر کا دیا گیا حوالہ افسانہ " کتبہ " سے تعلق رکھتا ہے۔ یوں قاری غلام عباس شناسی پر روشنی ڈالنے والی تصانیف میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ ان کتب کا تقابلی مطالعہ غلام عباس شناسی کی سمت درست راہ نمائی میں مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔

غلام عباس نے طبقاتی نفسیات کے حوالے سے معاشرے کے اعلیٰ طبقے کو اس کی استحصالی فطرت اور سماجی بالادستی بحال رکھنے کے رجحانات کی صورت میں متعارف کروایا ہے۔ ان کے ہاں بالادست طبقہ اپنی سماجی برتری و بالادستی کی خاطر نچلے طبقات کا استحصال کرتا ہے۔ خاندانی وجاہت و اعلیٰ نسبی اس طبقے میں غرور، تکبر، تشدد اور خدمت گزاری کے رجحانات پیدا کرتی ہے جو مستقل اقدار کی صورت میں ان کی نسلوں کا طرہ امتیاز بن جاتی ہیں جہاں سے طبقاتی نفسیات پر اون چڑھتی ہے۔ ان کے ہاں بالادست طبقہ جہاں سماجی بقا کا ضامن ہوتا ہے وہاں اس کی استحصالی نفسیات زیردست طبقات کی کسم پرسی اور بے بسی کے لاشعوری محرکات کی راہ بھی ہموار کرتی ہے۔ نچلے طبقات کی طبقاتی نفسیات میں بے چینی، اکتاہٹ، سمجھوتہ بازی، ڈر، خوف، دہشت، فرار، گریز اور دائمی مایوسی کا موجب بھی معاشرے کی

طبقاتی تشکیل پذیری ہے۔ سماج کا بے بس طبقہ اپنی حالت سے غیر مطمئن ہونے اور اپنی حیثیت کو بدلنے کی شعوری کوشش کے باوجود زندگی کی قوت کے سامنے بے بسی کی تصویر بن کر حالات سے سمجھوتہ بازی کر لیتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، اردو افسانہ (بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں)، پورب اکادی، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۱۲۱

۲۔ افسانہ نواب صاحب کا بنگلہ، مشمولہ، غلام عباس فکر و فن، مرتب، ایم۔ خالد فیاض، نقش گر پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۰ء، ص ۳۲۱

۳۔ ایضاً، ص ۳۲۳

۴۔ غلام عباس کے بے مثال افسانے، مرتب، طاہر منصور فاروقی، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۳۳۵

۵۔ ایضاً، ص ۱۸۵

۶۔ ایضاً، ص ۶۳

۷۔ ایضاً، ص ۳۰۴

۸۔ ایضاً، ص ۱۱۹

۹۔ ایضاً، ص ۲۶۷

۱۰۔ اردو کے 13 بہترین افسانے، انتخاب، شبیر کاظمی، فیض الاسلام، راولپنڈی، ۲۰۰۹ء، ص ۸۲

۱۱۔ افسانہ اوتار، مشمولہ، غلام عباس فکر و فن، مرتب، ایم۔ خالد فیاض، ص ۳۰۸

۱۲۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، غلام عباس فکر و فن، ص ۱۱۲

۱۳۔ غلام عباس فکر و فن، مرتب، ایم۔ فیاض خالد، ص ۳۲۳

۱۴۔ اورنگ زیب عالم گیر، ڈاکٹر، غلام عباس (تحقیقی و تنقیدی مطالعہ) سنگت پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۱۰۷

۱۵۔ غلام عباس کے بے مثال افسانے، مرتب، طاہر منصور فاروقی، ص ۳۱۹

۱۶۔ ایضاً، ص ۳۲۳

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۸۵

۱۹۔ شہزاد منظر، غلام عباس کے ۱۰ بہترین افسانے، تخلیقات، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۵۱

۲۰۔ ایضاً، ص ۳۹

۲۱۔ غلام عباس کے بے مثال افسانے، مرتب، طاہر منصور فاروقی، ص ۱۷۴

۲۲۔ انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۰۷ء، ص ۳۵۸

۲۳۔ غلام عباس کے بے مثال افسانے، مرتب، طاہر منصور فاروقی، ص ۱۹۰

۲۴۔ ایضاً، ص ۲۳۸

۲۵۔ ایضاً، ص ۲۴۱

۲۶۔ اردو کے 13 بہترین افسانے، انتخاب، شبیر کاظمی، ص ۸۸

۲۷۔ ایضاً، ص ۸۸

۲۸۔ ایضاً، ص ۸۳

۲۹۔ غلام عباس کے بے مثال افسانے، مرتب، طاہر منصور فاروقی، ص ۳۰۱

۳۰۔ علی عباس جلالپوری، جنسیاتی مطالعے، تخلیقات، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۲۱۰

۳۱۔ غلام عباس کے بے مثال افسانے، مرتب، طاہر منصور فاروقی، ص ۲۵۷

۳۲۔ ایضاً، ص ۲۶۵

۳۳۔ ایضاً، ص ۳۰۴

۳۴۔ فاروق عثمان، ڈاکٹر، مضمون، غلام عباس کا افسانہ حمام میں، مشمولہ، غلام عباس فکر و فن، مرتب، ایم خالد فیاض، نقش گر، پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۰ء، ص ۱۶۳

۳۵۔ سویا مانے یاسر، غلام عباس سوانح و فن کا تحقیقی جائزہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۲۱۴

۳۶۔ علمدار حسین بخاری، ڈاکٹر، اردو افسانے کی روایت میں غلام عباس کا مقام، مقالہ، پی ایچ ڈی، ۲۰۰۶ء، ص ۱۳۴

۳۷۔ غلام عباس، زندگی نقاب چہرے، اشاعت ششم، مکتبہ دانیال کراچی، ۲۰۰۰ء، ص ۱۵۵

۳۸۔ ایضاً، ص ۲۰۲

۳۹۔ عورت کی نفسیات، ایم، اے، ملک، عمران ملک، ۷۰، ڈی نیو مسلم ٹاؤن، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۱۱۸

۴۰۔ منٹو کی عورتیں، روش ندیم، ڈاکٹر، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۳۵۱

۴۱۔ غلام عباس کے بے مثال افسانے، مرتب، طاہر منصور فاروقی، ص ۱۷۹

۴۲۔ سویامانے یاسر، غلام عباس سوانح وفن کا تحقیقی جائزہ، ص ۱۸

۴۳۔ ایضاً، ص ۲۰

۴۴۔ ایضاً، ص ۱۲۲

ماحصل

غلام عباس کے افسانے اپنے عہد کے نمائندہ ہیں۔انھوں نے اپنے معاصر عہد کے سماجی ،معاشرتی ،معاشی اور سیاسی حالات و واقعات کا گہرا اثر قبول کیا۔اس کے ساتھ ساتھ اس وقت کے مروجہ مقبول ادبی نظریات وتصورات اور رجحانات کو ایک انفرادی شان سے شرف قبولیت بخشا۔اس عہد میں اردو افسانہ روسی ،انگریزی اور فرانسیسی افسانوں کے تراجم اور ترقی پسند تحریک کی بدولت نئے آہنگ سے آشنا ہو چکا تھا۔انقلاب روس اور مارکس کے اشتراکی نظریات نے علم وادب میں ایک نئی ہل چل پیدا کی۔دنیا کے سنجیدہ ادیبوں اور دانشوروں نے اس نئی صورت حال کو متنوع انداز سے اپنی تخلیقات میں سمونے کی بھرپور سعی کی۔ترقی پسند تحریک کی نشو ونما میں مارکسزم کا اثر شدت سے ابھر کر سامنے آیا۔اس کی بدولت انسان کی مادی ضرورتوں کو اظہار کا نادر موقع میسر آیا۔سماج کے نچلے طبقے کی پستی اور بھوک افلاس کی گم نامی میں سسکتی زندگی حقیقت نگاری کا لبادا اوڑھ کر منظر عام پر آئی۔اس تحریک کی وساطت سے انسان کے داخلی احساسات کو خارجی کائنات اور سائنسی انداز فکر سے آشنائی کا شعور حاصل ہوا۔

اس تحریک سے سماج کے خارجی ڈھانچے میں تبدیلی آئی۔خارجی عوامل سے تشکیل پانے والے علوم وفنون کو اہمیت حاصل ہوگی۔ادب میں سماجی مساوات کے حصول کی خاطر شخصی آزادی، پیداواری منافع کی تقسیم اور نچلے طبقات کی اقتصادی ترقی کو اہمیت دی گی۔اس کے متوازی اردو افسانے میں سجاد حیدر یلدرم کی رومانیت افسانہ نگاروں کو جذبات اور تخیل کے اظہار کے لیے اکسا رہی تھی۔غلام عباس کے افسانوی سفر میں ابتدائی ممیز کا کام غیر ملکی تخلیقات کے تراجم نے کیا۔ان ابتدائی تراجم کی بدولت نہ صرف ان کی محدود آمدنی ممکن ہوئی بل کہ ان کا ادبی شعور بھی پختگی کی منازل طے کرنے میں کام یاب ہوا۔اسی عہد میں ان کی اپنی خاندانی تنگ دستی اور اقتصادی بدحالی ان کے طبقاتی شعور کا نقطہ آغاز بنی۔انھی تراجم کے وسیلہ سے ان کی شناسائی زیادہ تر حقیقت نگاروں سے ہوئی جس نے طبع زاد افسانوں کی تخلیق میں رومانی اثرات پر ایک روک لگا کر حقیقت نگاری کی راہ ہم وار کی۔انھی اثرات کے زیر سایہ انھوں نے اپنے گردو پیش رونما ہونے والے واقعات اور زندگی کے مشاہدات کو پورے خلوص سے منظر عام پر لایا۔ان کے افسانوی شاہکار اور فن وادب کے نادر نمونے زندگی کے گہرے حقائق اور مشاہدات کا عکس ہیں۔

غلام عباس کی انفرادیت ان کا طبقاتی اور نفسیاتی شعور ہے۔وہ طبقاتی ونفسیاتی شعور کی تہوں میں سماج کی طبقاتی بنت، دولت کی غیر مساوی تقسیم،سماج ،قانون اور ماحول کی جبریت کو نمایاں مقام دیتے ہیں۔ان کے افسانوں میں

طبقات کا شعوری وجود موجود ہے۔ وہ افسانوں میں سماج کے اعلیٰ، متوسط، نچلے متوسط اور نچلے طبقات کی نمائندگی پوری آب وتاب اور فنی چابک دستی سے ایک انفرادی پہچان قائم کر کے سامنے لاتے ہیں۔ اعلیٰ طبقے کے افسانوں میں "مجسمہ"، "نواب صاحب کا بنگلہ"، "بندر والا"، "یہ پری چہرہ لوگ" اور "سایہ"، متوسط اور نچلے متوسط طبقے کی نمائندگی میں "کتبہ"، "کن رس"، "سیاہ سفید"، "بامبے والا"، "اندھیرے میں"، "سمجھوتہ"، "سرخ جلوس"، "مکر جی بابو کی ڈائری"، "پتلی بائی"، "بحران"، جب کہ "جواری"، "بہروپیا"، "تنکے کا سہارا" اور "جوار بھاٹہ"، کے کچھ کردار قابل ذکر ہیں۔ سماج کے نچلے طبقات کا وجود "چکر"، "اندھیرے میں"، "اوورکوٹ"، "فینسی ہیر کٹنگ سیلون"، "تنکے کا سہارا"، "غازی مرد"، "اوتار" اور "جوار بھاٹہ" کی صورت میں موجود ہے۔ ان کی طوائف بھی سماج کے بے بس اور کم زور طبقے کا استعارہ ہے۔ اس طبقے کو "آنندی"، "حمام میں"، "ناک کاٹنے والے"، "اس کی بیوی"، "بھنور"، "بردہ فروش" اور "کن رس" میں سامنے لایا گیا ہے۔

غلام عباس نے افسانوں میں طبقات کے ظہور کو سماجی ارتقاء کے تناظر میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے طبقاتی بنت میں خارجی حاکمیت، جبر واستحصال، ذاتی املاک کی ہوس، دولت کی غیر مساوی تقسیم، معاشی نا ہم واری، وسائل پیداوار پر مقتدر افراد کا قبضہ، اشتراکی روایات کا فقدان اور کامل آزادی کی رکاوٹ کو خصوصی اہمیت دی ہے۔ ان کے افسانوں کی طبقاتی تشکیل میں دولت اور معاش کو کلیدی مقام حاصل ہے۔ طبقات کی معاشرتی نمو میں اقتصادی استحصال کی بالائی جبریت سے دولت کے فرق کو بحال اور قائم رکھنے کے اشارے غلام عباس کو انفرادی مقام بخشتے ہے۔ غلام عباس کی انفرادیت ان کے طبقاتی شعور کی پختگی کے ساتھ ساتھ کرداروں کی طبقاتی نفسیات کا تعین کرنے میں مضمر ہے۔ انھوں نے کرداروں پر معروضی جبریت کی بدولت رونما ہونے والی داخلی شکست وریخت کو کمال ہنرمندی سے پیش کیا۔ ان کے ہاں معاش، جنس، جنس ومعاش، جبلت انسانی، قانون اور ماحول کی قوت خارجی حاکمیت کا روپ دھار کر باطنی الجھاؤ کی محرک بنتی ہے۔ ان کے ہاں کرداروں کی خارجی زندگی کا مطالعہ محض داخلی پہلوؤں کی نقاب کشائی کے لیے جزئیات نگاری کے رنگ میں ڈھلتا ہے۔ وہ ظاہر کی ملمع کاری کو پرت در پرت کھول کر باطن کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں۔ زندگی کا گہرا مشاہدہ ان کو انسانی وجود پر رونما ہونے والے تغیرات اور فرد کی ذات میں پوشیدہ معانی کی دریافت میں معاونت کرتا ہے۔ ان کے طبقاتی اور نفسیاتی شعور میں داخلی وخارجی نفسیات کا توازن، خارج سے داخل کا سفر اور تلخ سماجی حقائق میں جنم لینے والے نفسیاتی المیوں کو گرفت میں لینے کے ہنر کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

غلام عباس نے سماج میں موجود نچلے، نچلے متوسط، متوسط اور اعلیٰ طبقات کی خاص طبقاتی نفسیات کو بیان کیا

ہے۔ان کا طبقاتی مطالعہ صرف سماجی شعور اور طبقاتی تشکیل کے اظہار تک ہی محدود نہیں بل کہ وہ نفسیاتی الجھنوں کی پیچیدہ تہوں کا متلاشی ہے۔ان کے ہاں سماج کا متوسط طبقہ اپنی مخصوص طبقاتی نفسیات کا آئینہ دار ہے۔انھوں نے اس طبقے کو ایک نئی پہچان مہیا کی ہے۔متوسط طبقہ کو ان کے ہاں مغربی طرز زندگی کی چمک سے متاثر ہوتے ہوئے سامنے لایا گیا ہے ۔غلام عباس کا متوسط طبقہ ملازمت پیشہ ہوتا ہے جو بنیادی طور پر محدود معاشی آزادی اور ناکافی وسائل حیات میں الجھا رہتا ہے۔اسی معاشی الجھن کی بدولت لاشعوری طور پر یہ طبقہ گریز،فرار،احساس کم تری،اکتاہٹ،بے چینی اور بیگانگی جیسے نفسیاتی مسائل کی گرفت میں الجھ جاتا ہے۔اس طبقے کے اندر اپنے متنوع مصائب پر قابو پانے کی جستجو موجود ہوتی ہے جس کے لیے وہ ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔اس کی یہ کاوش اپنی الگ طبقاتی انفرادیت قائم کرنے کی خواہش سے ابھرتی ہے۔اپنی اس کوشش میں ناکامی جو طبقاتی سماج کی بدولت ممکن ہوتی ہے،اس طبقے کی ازلی ناکامی اور کام سے اکتاہٹ پر انجام پذیر ہوتی ہے۔متوسط طبقہ اپنے سے بالاتر طبقات میں خود کو شامل کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔وہ اپنی احساس کم تری کے زیر اثر اپنی سماجی حیثیت میں بدستور تبدیلی کے لیے بے چین رہتا ہے۔غلام عباس متوسط طبقے کی طبقاتی نفسیات بیان کرتے ہوئے اس میں بدلتے انداز فکر اور امیروں کے طرز زندگی کی بھونڈی نقالی کو خاص اہمیت دیتے ہیں۔اس الجھن کی تہہ میں اس طبقے کی کوشش کے باوجود منزل کے حصول میں ناکامی اور زندگی کی سہولیات کی عدم دستیابی اپنا اثر دکھا رہی ہوتی ہے۔سماج کی طبقاتی صورت حال اس طبقے کی بے چینی میں ایک بنیادی محرک ہے۔اپنی اعلیٰ طبقات میں شمولیت کی نفسیات کے زیر اثر یہ طبقہ اعلیٰ طبقات کے شوق پالتا ہے۔متوسط طبقے کی یہ نقالی اس کی معاشی،اخلاقی اور سماجی پستی کا باعث بن کر داخلی انتشار کی راہ ہم وار کرتی ہے۔اس طبقے کی اندرونی شکست وریخت میں اس کے خاندانی اور اختیاری رشتوں کا الجھاؤ بھی گہرائی سے اثر انداز ہوتا ہے۔متوسط طبقہ ایک طرف اپنی خاندانی جڑوں کی بدولت سماج کے نچلے طبقات سے وابستگی رکھتا ہے تو دوسری طرف وہ اپنی الگ شناخت کی خاطر اختیاری رشتوں کا خواہش مند ہوتا ہے۔وہ سماج کے نچلے طبقات سے ابھر کر سامنے آتا ہے اسی لیے وہ ایک قلبی کشش کے تابع اس سے وابستگی رکھتا ہے۔وہ اس حقیقت سے بھی آشنا ہوتا ہے کہ اس کی قدر و منزلت اور انفرادی پہچان اسی طبقے کے دم خم سے قائم ہے۔طبقاتی معاشرتی تشکیل اس طبقے کی احساس محرومی میں کلیدی اہمیت رکھتی ہے۔معاشرے میں یہ طبقہ پر آسائش زندگی کا متمنی ہوتا ہے جس کے لیے باقاعدہ تگ و دو کرتا ہے۔اس کوشش میں رکاوٹ سماج کی طبقاتی بنت سے ظہور پذیر ہوتی ہے جو نفسیاتی المیوں کی راہ ہم وار کرتی ہے۔متوسط طبقات کے اندر معاشرتی دباؤ کے زیر اثر رونما ہونے والی جنسی الجھنوں کو بھی غلام عباس نے سماج کی طبقاتی جبریت کے باطن سے اظہار کی راہ دکھائی ہے۔

سماج کا یہ طبقہ زندگی کی اقتصادی کش مکش میں بری طرح پھنسا ہوتا ہے جس کی بدولت وہ اپنی جنسی آسودگی کا سامان پیدا کرنے میں ناکام رہتا ہے۔جنس چوں کہ ایک طاقت ور محرک ہوتی ہے جو نفسیاتی مسائل کے ابھار میں اپنا ثانی نہیں رکھتی لہذا غلام عباس متوسط طبقے کی طبقاتی نفسیات کو مرتب کرنے میں جنس کی نا آسودگی کو خاص اہمیت دیتے ہیں۔ وہ جنسی مسائل کو بیان کرتے ہوئے ایک حجاب کی فضاء قائم رکھتے ہیں تا کہ اخلاقی اور معاشرتی اقدار کا لحاظ رہے۔متوسط طبقہ بالا دست طبقات میں شمولیت کی کوشش اور اپنے مسائل پر قابو پانے کی تگ و دو کے دوران ناکامی کے ایک ہلکے سے جھٹکے سے اپنی پہلی حالت میں واپس آجاتا ہے۔اس کے اندر استقلال کا شدید فقدان ہوتا ہے۔وہ اپنے سے اونچے طبقے کا فرد تو بننا چاہتا ہے مگر اپنے سے نچلے طبقے میں اپنی ذات کا تصور کرنے سے بھی گریز کرتا ہے۔اس کی لاشعوری وجہ نچلے طبقات میں سسکتی زندگی کے تلخ احساسات ہوتے ہیں جن سے وہ خود یا اس کا خاندانی پس منظر وابستہ ہوتا ہے۔غلام عباس کا متوسط طبقہ اپنی نفسیاتی الجھنوں سے سمجھوتہ کر کے اپنی ازلی بے بسی کا آئینہ دار بن جاتا ہے۔اس طبقے کی مخصوص طبقاتی نفسیات میں سماجی ہم آہنگی کی تگ و دو، خود فریبی، اختیاری اور خاندانی رشتوں کا الجھاؤ، خود اعتمادی کا فقدان، سماجی انفرادیت کی کش مکش، آرزو کو حقیقت میں بدلنے کی حماقت، بدلتا انداز فکر، سماجی اقدار کا خوف، قوت فیصلہ کی کمی، اعلیٰ طبقات کی بھونڈی نقالی، امیرانہ شوق، بے چینی اور بے کیفی کو غلام عباس نے خصوصیت سے بیان کیا ہے۔طبقاتی نفسیات کو متعین کرنے میں لاشعوری عوامل معروض کی متنوع جبریت کی بدولت متحرک ہوتے ہیں۔

غلام عباس نے اپنے افسانوی کرداروں کی مدد سے متوسط طبقے کے علاوہ سماج کے اعلیٰ اور نچلے طبقات کی طبقاتی نفسیات کا بھی ذکر کیا ہے۔ان کا اعلیٰ طبقہ استحصالی فطرت کا حامل ہے۔یہ طبقہ اعلیٰ قدیم معاشرتی روایات کا بھی پاسدار ہے۔سماج کا یہ طبقہ اپنی سماجی انفرادیت قائم رکھنے کے لیے نچلے طبقات کا استحصال کرتا محسوس ہوتا ہے۔اس کے اندر معاشرے کے نچلے طبقات کے حوالے سے ایک بے اعتنائی کا رویہ موجود ہوتا ہے۔اس جذبے کی تہہ میں دولت کی فراوانی اور زندگی کی سہولیات کے ساتھ ساتھ سرمائے سے ہر چیز کا حصول ممکن ہونا پوشیدہ ہوتا ہے۔آسودہ زندگی اور دولت کی ریل پیل کے باوجود غلام عباس کا اعلیٰ طبقہ اندر کی ایک ویران دنیا کا بوجھ اٹھائے ہوتا ہے۔اس کے اندر جنسی خواہشات کی تکمیل کا زبردست رجحان پایا جاتا ہے۔سماج میں اپنے بھرم کو قائم رکھنے کے لیے وہ ایک احساس کم تری کی الجھن میں جکڑا ہوتا ہے۔وہ اپنے سے نچلے طبقات پر اپنی طاقت اور اثر و رسوخ کو قائم رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے جس کے لیے استحصال کا دروازہ ہر لمحہ کھلا رہتا ہے۔یہ طبقہ اپنے ہم پلہ طبقات کی سماجی گراوٹ پر ایک خوشی ضرور محسوس کرتا ہے مگر طبقاتی استحصال میں اس کا مفاد مشترک ہوتا ہے۔

غلام عباس اپنے افسانوی کرداروں میں سماج کے اعلیٰ طبقے کی اندرون ذات خالی اور اکتاہٹ سے بھری کیفیت کو سامنے لاتے ہیں۔اس الجھاؤ میں زندگی کی یکسانیت کو وہ ایک محرک کے طور پر متعارف کرواتے ہیں۔یہ طبقہ انسانی ہم دردی سے عاری ہوتا ہے جس کی تہہ میں انسانی زندگی کے دکھ،محرومیوں اور اقتصادی بدحالی کی عدم موجودگی ہوتی ہے۔ سماج کا اعلیٰ طبقہ اپنی زندگی میں جنسی اکتاہٹ کے نفسیاتی اثرات کی بدولت طوائفوں کے وجود کو زندہ رکھے ہوئے ہوتا ہے۔اس کے اندر عورتوں کا سماجی اور جنسی استحصال ایک غالب قدر بن کر ابھرتا ہے۔وہ اپنی اسی نفسیاتی الجھن کی خاطر بردہ فروشی کا رجحان بھی رکھتا ہے۔یہ طبقہ اپنی خواہشات کو ممکن بنانے کے لیے سماج کے نچلے طبقات سے سمجھوتہ بھی کر لیتا ہے مگر اس کی تہہ میں کوئی سماجی،معاشرتی یا اقتصادی دباؤ کارفرما نہیں ہوتا۔

غلام عباس نے سماج کے نچلے طبقات میں موجود بے چینی،فرار،معاشی و معاشرتی استحصال،کرب والم،زندگی کی نا تمام خواہشات،آرزوؤں کا قتل،مظلومیت،سماجی بے حسی،روٹی اور جسم ڈھانپنے کی مشقت،غربت و افلاس میں سسکتی زندگی،ذہنی اذیت اور سماجی ناہم واریوں کی بدولت مرتب ہوتے والی طبقاتی نفسیات کو منفرد انداز سے بیان کیا ہے۔ سماج کا نچلا طبقہ پوری محنت اور کاوش کے باوجود اپنی معاشی الجھن سے چھٹکارا حاصل کرنے میں ناکام ہو کر غلام عباس کے افسانہ نگاری میں ایک بد دلی کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے جو اس کی مستقل ناکامی اور الجھن بن جاتی ہے۔طبقاتی سماج کی جبریت اور نظام اقدار کی ناہمواری زیر دست طبقات کو اندر سے اس قدر بے چین کرتی ہے کہ وہ احساس کم تری کا شکار ہو کر مصنوعی انداز سے اپنی غربت کو ڈھانپنے کی ناکام کوشش کا سہارا لیتے ہیں۔اس طبقے کی نفسیاتی الجھنوں کی اصل جڑ سماج کی طبقاتی تقسیم اور معاشی الجھاؤ میں پوشیدہ ہے۔غربت اس طبقے کی زندگی کو اندر سے دیمک کی مانند چاٹ دیتی ہیں جہاں سے صرف ناکامی،بے چینی اور فرار کے تن آور درخت پروان چڑھتے ہیں۔غلام عباس نے سماج کے نچلے طبقے میں پوشیدہ نفسیاتی مسائل کو معاشی عدم مساوات سے ابھرتا ہوا دکھایا ہے۔سماج کے اعلیٰ طبقات اپنی استحصالی نفسیات کی بدولت ایسی طبقاتی فضاء مرتب کرتے ہیں جہاں سماج کے زیر دست طبقات اپنی اقتصادی الجھنوں میں پھنس کر ان طبقات کی خواہشات کو پورا کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔معاشرے کے بالا دست اور صاحب حیثیت طبقات طبقاتی جبریت سے نچلے طبقات کا استحصال کر کے ان کو اپنی آسائشوں اور آمدنی کا ذریعہ بناتے ہیں۔

ان کے افسانوں میں کم زور طبقات زندگی بھر مشقت کے باوجود اپنے مسائل پر قابو پانے میں ناکام ہو کر زندگی اور اعلیٰ طبقات کی قوت سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔غلام عباس کے سمجھوتے بھی نفسیاتی شکست وریخت کے تہوں سے ہی بتدریج ابھرتے ہیں۔ان کی عمیق گہرائیوں میں بھی احساس کم تری اور ازلی ناکامی کارفرما ہوتی ہے۔اپنی اقتصادی کم

مائیگی کی بدولت اس طبقے کے پاس زندگی کے ناکافی سہولیات اور مصائب ومسائل کا ایک لامحدود سلسلہ موجود ہوتا ہے۔ غلام عباس اس طبقے کی نفسیاتی الجھنوں میں جنسی عدم تکمیلیت کو بھی ایک خاص اہمیت دینے کے قائل ہیں۔ان کے ہاں جنس کی قوت اور اس کی وساطت سے پیدا ہونے والی بے چینی موجود ہے جہاں افسانوں میں موجود نچلا طبقہ سماجی دباؤ اور معاشرتی اقدار سے خائف ہو کر لذت کوشی کی راہ اختیار کرتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ کئی کردار اپنی جنسی خواہشات کی تکمیل کا سامان پیدا کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔"سرخ گلاب "میں مولا اس قبیل کا کردار ہے۔اس کے علاوہ "اوورکوٹ" کے ہیرو کی موت میں بھی جنسی باتوں سے حظ اٹھانے کا رجحان ملتا ہے۔ان کے افسانوں کی طوائف بھی معاشرے کے کم زور اور دوسروں کی خواہشات پر اپنی آرزوؤں کی قربانی دینے والا طبقہ ہے۔انھوں نے طوائف کو ایک مجبور اور بے بس کردار کے طور پر سامنے لایا ہے۔اس کی روزی روٹی اور ضروریات زیست اس کے دھندے کے وابستہ ہے۔وہ اپنی جنسی خواہشات کے تکمیل کی خاطر اپنا جسم بیچنے پر آمادہ نہیں ہوتی بل کہ سماج کے طاقت ور اور بالا دست طبقات اس کو اپنی عیاشی کے لیے زندہ اور مجبور کیے ہوتے ہیں۔سماج کے اس طبقے میں غلام عباس گرہستی وطوائفیت کے مابین الجھتے جذبات اور خواہشات سے طبقاتی نفسیاتی کا سراغ لگاتے ہیں۔سماج میں طوائف ایک مروجہ شریفانہ معیارات کی حامل زندگی بسر کرنے کا گہرا رجحان رکھتی ہے۔

وہ اپنی مرضی سے اس دھندے کا انتخاب نہیں کرتی بل کہ ایک سماجی اور طبقاتی جبریت اس کو مجبور کرتی ہے۔غلام عباس نے ان متنوع سماجی محرکات کو منظر عام پر لایا ہے جو سماج میں ایک عورت کو اس دلدل کی طرف سفر کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ان محرکات کی ابتدائی لہریں معاش اور جنس ہی سے اپنے سفر کا آغاز کرتی ہیں،جن کی بتدریج بلندی عورت کو دہری اذیت میں مبتلا کر کے اسے زندگی ہی سے بیزار کر دیتی ہیں۔غلام عباس نے نسوانی نفسیات کے نمایاں خدوخال میں نرگسیت اور جنسی رویوں کو بنیادی اہمیت دی ہے۔احساس محرومی،احساس کم مائیگی،جذباتیت،ہسٹریائی رجحان، ذوق خود آرائی،توجہ طلبی،بدگمانی،حسد ورقابت اور خوشامد پرستی جیسی نفسیاتی الجھنوں کو انھوں نے عورت اور طوائف کی زندگی کے تقابل سے بے نقاب کیا ہے۔وہ ہر لمحہ ایک طوائف کے بطن سے عورت کے وجود کو تلاش کرتے محسوس ہوتے ہیں۔ان کی طوائف میں ایک گھریلو عورت ہر لمحہ اپنی پوری آب وتاب سے اپنے خدوخال تراشتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس کے اندر کی بے چینی میں بھی خواہش تحفظ،شادی،آشیانہ سازی،ممتا اور عفت وحیاء کے گرتی دیواروں کے لاشعوری اثرات اپنا اثر دکھا رہے ہوتے ہیں۔وہ اس نفسیاتی حقیقت کو سامنے لاتے ہیں کہ حیات انسانی ہر دم آفات وآلام کی زد میں ہے۔رزم گاہ حیات میں انسان کو کبھی کبھی سخت ناموافق حالات،اعصاب شکن حادثات اور جان گسل صدمات سے

دوچار ہونا پڑتا ہے۔مرد اپنے قوی الاعصاب ہونے کی بدولت بوقت آزمائش عورت سے زیادہ سخت جان ثابت ہوتا ہے لیکن عورت بھی اپنی تمام تر لطافتوں اور نزاکتوں کے باوجود حوادث سے جاں بر ہونے کی استعداد رکھتی ہے۔وہ زندگی کی اٹل حقیقتوں کو نہ صرف جلد تسلیم کر لیتی ہے بل کہ ان سے مفاہمت بھی کر لیتی ہے۔اس کی یہ سمجھوتہ بازی اندر کے احساس کم تری کے رجحان سے اظہار کی راہ پاتی ہے۔

غلام عباس کے افسانوں کا نچلا طبقہ زندگی کی ناکافی آسائشوں کی بدولت اپنی حالت سے غیر مطمئن ہوتا ہے۔وہ معاشی مسائل کی چکی میں اس شدت سے پستا ہے کہ زندگی اس کے لیے جبر مسلسل کا روپ دھار لیتی ہے۔اس کی معاشی تنگ دستی، پیٹ کے مسائل، بیماریاں، آفات، آلام و حادثات، سماجی رسم رواج کی مجبوری، کثرت اولاد، ناآسودگی اور سماجی ناہمواریاں اس کے اندر ایک خوف پیدا کرتی ہیں۔وہ اپنے حالات اور طبقاتی حیثیت سے نالاں اور متنفر ہو کر اپنے سے بہتر طبقات میں شمولیت کا خواہش مند ہوتا ہے۔معاشرے کے نچلے طبقات کی طبقاتی نفسیات کو مرتب کرنے میں معاش، جنس، طبقاتی بنت، سماجی دباؤ اور حیات زیست میں سہولیات و آسائشوں کی عدم تکمیلیت بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔

غلام عباس کے کرداروں کی طبقاتی نفسیات کے اس مطالعے سے جو نتائج سامنے آتے ہیں ان کے مطابق ان کے ہاں ایک منفرد نفسیاتی اور طبقاتی شعور موجود ہے۔ان کے افسانے سماج کے اعلیٰ، متوسط اور نچلے طبقات سے تعلق رکھتے ہیں۔ان کی افسانہ نگاری میں سماج کے اندر موجود طبقات کا وجود ملتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ ان عوامل کی نشان دہی بھی ان کے طبقاتی شعور کی غماز ہے جو سماج میں طبقات کو بنیاد فراہم کرتے ہیں۔وہ اپنے افسانوں میں کرداروں کی مدد سے مختلف طبقات کو متعارف کرواتے ہیں۔جو کردار جس طبقے سے تعلق رکھتا ہے، اس کے خدوخال، زبان، انداز زیست، حلیہ اور دیگر مشاغل اسی سماجی طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں۔کردار کا ظاہری تعارف، رہن سہن، لباس، چہرے کی نقوش، سماجی مراسم، سوچ، مسائل اور لہجہ اس طبقے کے عین مطابق ہوتا ہے۔غلام عباس اس طبقے اور کردار کا پوری گہرائی و گیرائی سے مشاہدہ و موازنہ کرتے ہیں۔ان کے افسانوی کرداروں میں ان کے سماجی طبقے کا سراغ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔

اس کے ساتھ وہ سماج کے ہر طبقے کے مخصوص رجحانات، افکار و خیالات، رویوں اور نفسیاتی الجھنوں سے اس کی طبقاتی نفسیات کا تعین کرتے ہیں۔طبقاتی نفسیات کو متعین کرنے میں وہ عمومی نفسیات کا سہارا بھی لیتے ہیں۔ان کے طبقاتی و نفسیاتی شعور میں سماج کا عمیق مطالعہ اور ذاتی زندگی کا گہرا تجربہ ان کو انفرادی شان عطا کرتا ہے۔وہ اپنے افسانوی

کرداروں کی طبقاتی نفسیات کا تعین کرنے میں معاش، جنس، جنس و معاش کے امتزاج، سماج کی طبقاتی تشکیل سماجی دباؤ اور نا آسودگی کو بنیاد بنا کر اپنی انفرادیت قائم کرتے ہیں۔ انھوں نے زندگی کی اٹل حقیقتوں کو بے نقاب کیا۔ غلام عباس نے عورتوں کو ایک مخصوص طبقے کے طور پر الگ تشخص اور وجود مہیا کر کے اپنی نسوانی نفسیات فہمی بل کہ مردوں کی خاص طبقاتی نفسیات اور استحصالی رجحانات کے نفسیاتی محرکات بھی ان کی نفسیاتی آگہی و شعور کا اظہار ہیں۔

کتابیات وماخذات

(۱) ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۸۵ء

(۲) احمد صغیر، ڈاکٹر، اردو افسانے کا تنقیدی جائزہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۹ء

(۳) انوار احمد، ڈاکٹر، "اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ" مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۰۷ء

(۴) انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ. تحقیق وتنقید، بیکن بکس، ملتان، ۱۹۸۸ء

(۵) اورنگ زیب عالم گیر، ڈاکٹر، "غلام عباس" سنگیت پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء

(۶) ایم اے قریشی، فرائیڈ اور لاشعور، مجلس ترقی ادب، لاہور، اشاعت دوم، ۲۰۰۷ء

(۷) ایم اے ملک، عمران ملک "عورت کی نفسیات" مسلم ٹاؤن، لاہور، ۱۹۹۰ء

(۸) ایم خالد فیاض، "غلام عباس، فکر وفن" نقش گر، راولپنڈی، ۲۰۱۰ء

(۹) آصف فرخی "حرف من وتو" نفیس اکیڈمی کراچی، ۱۹۸۹ء

(۱۰) خالد محمود سنجرانی، اردو افسانے میں ابنارمل کردار، مقالہ برائے ایم فل اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۵ء

(۱۱) روش ندیم، ڈاکٹر، "منٹو کی عورتیں" پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء

(۱۲) زرینہ خانم، فرہنگ نفسیات، کفایت اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۲ء

(۱۳) سبط حسن "موسیٰ سے مارکس تک" مکتبہ دنیال، کراچی، ۲۰۱۱ء

(۱۴) سبط حسن، نوید فکر، بار دوم، دانیال کراچی، ۱۹۸۳ء

(۱۵) سلیم اختر، ڈاکٹر، "افسانہ اور افسانہ نگار" سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء

(۱۶) سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی اصطلاحات، سنگ میل پبلی کشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء

(۱۷) سلیم اختر، ڈاکٹر، تین بڑے نفسیات دان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء

(۱۸) سلیم اختر، ڈاکٹر، مغرب میں نفسیاتی تنقید، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء

(۱۹) سلیم اختر، ڈاکٹر، نفسیاتی تنقید، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۷ء

(۲۰) سلیم اختر، ڈاکٹر، "ہماری جنسی اور جذباتی زندگی" سنگ میل، لاہور، ۲۰۰۴ء

(۲۱) سویامانے یاسر "غلام عباس، سوانح اور فن کا تحقیقی جائزہ" سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء

(۲۲) شفیق انجم، ڈاکٹر۔ اردو افسانہ، بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں، پورب اکادی، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء

(۲۳) شہزاد احمد، الفرڈ ایڈلر، سنگ میل، پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۹ء

(۲۴) شہزاد احمد، تحلیل نفسی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء

(۲۵) شہزاد احمد، ژونگ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء

(۲۶) شہزاد احمد، وجودی نفسیات پر ایک نظر، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء

(۲۷) شہزاد منظر، علامتی افسانے کے ابلاغ کا مسئلہ، منظر پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۰ء

(۲۸) شہزاد منظر "غلام عباس ایک مطالعہ" مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور، ۱۹۹۱ء

(۲۹) شہزاد منظر، "غلام عباس کے ۱۰ بہترین افسانے" تخلیقات، لاہور، ۲۰۰۰ء

(۳۰) عبادت بریلوی، ڈاکٹر "افسانہ اور افسانے کی تنقید" ادارہ ادب و تنقید لاہور، ۱۹۸۲ء

(۳۱) علمدار حسین بخاری، ڈاکٹر، "اردو افسانے کی روایت میں غلام عباس کا مقام" مقالہ برائے پی ایچ ڈی، ۲۰۰۶ء

(۳۲) علی عباس جلالپوری "تاریخ کا نیا موڑ" تخلیقات، ۲۰۱۰ء

(۳۳) علی عباس جلالپوری "جنسیاتی مطالعے" تخلیقات، لاہور، ۲۰۱۹ء

(۳۴) علی عباس جلالپوری "روایات فلسفہ" تخلیقات، ۲۰۱۰ء

(۳۵) علی عباس جلالپوری، روح عصر، روہتاس بکس، لاہور، ۱۹۸۹ء

(۳۶) غلام عباس "آنندی" مکتبہ جدید، لاہور، ۱۹۴۸ء

(۳۷) غلام عباس "جاڑے کی چاندنی" سجاد اینڈ کامران پبلشرز، کراچی، ۱۹۶۰ء

(۳۸) غلام عباس "زندگی، نقاب، چہرے" مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۸۴ء

(۳۹) غلام عباس "کن رس" المثال، لاہور، ۱۹۶۹ء

(۴۰) غلام عباس "نواب صاحب کا بنگلہ" مشمولہ "روشنائی، افسانہ صدی نمبر" شمارہ نمبر ۲۷، حصہ اول، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۶ء

(۴۱) فردوس انور قاضی، ڈاکٹر، "اردو افسانہ نگاری کے رجحانات" مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۹ء

(۴۲) فرزانہ اختر، اساس نفسیات، علمی کتاب خانہ، لاہور، ۱۹۸۶ء

(۴۳) فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو افسانہ اور افسانہ نگار، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۶۰ء

(۴۴) قاضی جاوید، روسو، مشعل بکس، لاہور، ۲۰۰۱ء

(۴۵) قاضی جاوید، وجودیت، فکشن ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۸ء

(۴۶) گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، اردو افسانہ، روایت اور مسائل، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۸۶ء

(۴۷) مبارک علی، ڈاکٹر، المیہ تاریخ، فکشن ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۵ء

(۴۸) مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ کی آگہی، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۴ء

(۴۹) مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ کیا کہتی ہے، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۴ء

(۵۰) مبارک علی، ڈاکٹر، گمشدہ تاریخ، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۵ء

(۵۱) محمد اجمل، تحلیلی نفسیات، بیکن بکس، لاہور، ۲۰۰۵ء

(۵۲) مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، اردو افسانے کی روایت، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء

(۵۳) نعیم احمد، ڈاکٹر، "فرائڈ نظریہ تحلیل نفسی"، مشعل، لاہور، ۱۹۹۴ء